قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2013، قیمت -/15

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب مذہب اور اردو

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:15، شمارہ:07، جولائی 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبہ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194- 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو
مظہر الحق علوی — نصرت ظہیر — 6

کور اسٹوری
اردو زبان میں مذہبی ادبیات — حسین الحق — 10
مذہبی لٹریچر اور اردو — نوشاد عالم — 12
اردو میں سورداس کی رامائن و بھگوت گیتا — حبیب نثار — 15
اردو اور سکھ گرنتھ — ناشر نقوی — 17
بائبل کے اردو تراجم کہانی سے حقیقت تک — پنکی جسٹن — 19
قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر — محمد افضل خاں — 22

زبان و تعلیم
معنی کی نیرنگیاں اور ان کا تحفظ — شریف احمد قریشی — 24
نئی نسل اور اردو زبان و ادب — عبدالواسع — 26

ادبی مباحث
اردو شاعری اور خیابانِ خیال ... — مختار ٹونکی — 29

افسانے کے خدوخال ... — اسلم جمشید پوری — 32
اردو ادب میں کتے کا علامتی استعمال — عبدالرشید خان — 34
مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری — راشد انور راشد — 36
انانیت اور انانیتی ادب — شبیر احمد لون — 39

خراج عقیدت
وہاب اشرفی — شخصی و ادبی جائزہ — شفیع الزماں معظم — 41

شخصیت
ابومنصور ثعالبی: حیات و خدمات — فردوس نذیر بٹ — 43

مشاہیر ادب/نظم
امیر مینائی — ادارہ — 46
انتخاب کلام — امیر مینائی — 47

مشاہیر ادب/نثر
مسعود حسن رضوی ادیب — ادارہ — 50
اردو شاعری کے معشوق پر ایک نظر — مسعود حسن رضوی ادیب — 51

ہماری مطبوعات
سودا کے دو ادبی معرکے — محمد یعقوب عامر — 55

تہذیب و ثقافت
دلی کی پتنگ بازی تاریخ کے آئینے میں — مہتاب جہاں — 60

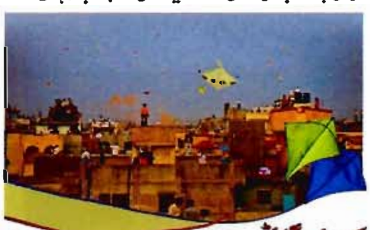

کریئر گائڈ
چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کورس — ندیم غوری — 63

دوسری زبانوں سے
زخم — اصغر وجاہت — 67

طب
قرابادین — حکیم سعید احسن — 69

صحت
غذا اور ہماری صحت — بلقیس بانو — 71

سائنس
تعلیمی اداروں میں جدید ٹیکنالوجی — محمد اسلم فاروقی — 73

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف — 77

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ — 83

عالمی اردو نامہ — ادارہ — 84

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 85

ہماری بات

سیکولرزم، جمہوریہ ہندوستان کے 64سال پرانے آئین کا بنیادی رہنما اصول ہے۔ لیکن اردو نے بہت پہلے اسے اپنے 'آئین' کا رہنما بنالیا تھا۔ اردو اس ملک کی واحد زبان ہے جس نے ماضی کے تقریباً ایک ہزار برسوں میں اپنے ارتقا کی منزلوں کا سفر اسی اصول کی روشنی میں طے کیا ہے۔ چنانچہ کوئی اگر یہ کہے تو غلط نہیں ہوگا کہ اردو کا دوسرا نام سیکولرزم ہے اور سیکولرزم کا دوسرا نام اردو! ایک ہی سکّے کے دورُخ۔ اس مفہوم میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ سیکولرزم بچا رہا تو اردو بھی بچی رہے گی اور اردو کو طاقت ملے گی تو سیکولرزم بھی مضبوط ہوتا جائے گا اور جب سیکولرزم مضبوط ہوگا تو پھر دیش بھی مضبوط ہوگا۔ اس کی طاقت بڑھے گی، اس کی سیاست میں جان آئے گی، اس کی معیشت پروان چڑھے گی، اس کی تہذیبی وثقافتی قوت میں اضافہ ہوگا اور ملک وقوم پوری دنیا میں سرخ رو ہوں گے۔ یہ کوئی الجبرائی حساب کتاب نہیں ہے۔ سماجی اور معاشی اصول کی بات ہے۔ ہندوستان کی اصل طاقت اس کا تکثیری سماج ہے۔ اس کا تکثیری رویّہ ہے۔ بلا لحاظ مذہب وملّت سب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ ہے۔ اور اس سماجی رویّے وجذبے کی سب سے زیادہ آبیاری اگر کسی زبان نے کی ہے تو وہ اردو ہے۔

زبان ایک ذہن کو دوسرے ذہن سے جوڑنے والا وہ تار ہے جو لوکل ایریا نیٹ ورک LAN کی طرح کئی کمپیوٹروں کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ لیکن اردو نے ہندوستانیوں کے ذہن کو ہی نہیں بلکہ ان کے فکری رویّوں، عقیدوں، مسلکوں اور مذہبی نظریوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی، باقی تمام ہندوستانی زبانوں سے کہیں زیادہ بڑا اور بنیادی نوعیت کا کردار ادا کیا ہے، جس کی بدولت ملک میں مذہبی وتہذیبی رواداری کا وہ ماحول تشکیل پا سکا جسے ہم آج سیکولرزم کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مسلمانوں کی بیش تر مذہبی کتابیں تو اردو میں منتقل ہوئی ہی ہیں، بھگوت گیتا کے سب سے زیادہ ہندوستانی تراجم بھی اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ مقدس ویدوں، پرانوں، رامائن اور مہابھارت کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ انجیل اور بائبل کے متعدد ترجمے اردو میں چھاپے گئے ہیں۔ گورو گرنتھ کو بھی اردو نے اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ غرض مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں، جین، بودھ اور پارسیوں سمیت ہندوستان میں بسنے والوں کا کون سا مذہب ہے جس کی کتابیں، تفسیریں، بحثیں، مذہبی سفرنامے اور زیارت نامے اردو میں موجود نہ ہوں۔ اس باہمی ارتباط نے اردو کے سیکولر کردار کو ہی نہیں بلکہ اس کے ادب کو بھی حرارت وتوانائی دی ہے۔ اردو کا شعری ادب ہو یا نثری تخلیقات، مذہبی وثقافتی ہم آہنگی اور رواداری کے مزاج اور رویّے نے اس زبان کے ادب کو معیار ومقدار، دونوں میں بڑی زبانوں کے ادب کا ہم پلّہ بنانے میں بڑی مدد دی ہے، جو تحقیق کا ایک نیا موضوع بن سکتا ہے۔

اتفاق سے آج کل ملک کی جمہوری سیاست ایک ایسے دور میں داخل ہوتی نظر آ رہی ہے جس میں مذہبی یگانگت اور خیرسگالی کی اہمیت یقینی طور پر بڑھ جائے گی۔ چنانچہ اس مرتبہ ہم نے اردو زبان کے اِسی شمولی Inclusive مزاج اور تکثیری Plural کردار کو 'کور اسٹوری' کا موضوع بنایا ہے، جو آج کے تناظر میں سیکولرزم کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کی بھی ایک کوشش ہے۔ امید ہے قارئین، ہماری اس کوشش اور اس موضوع پر اپنے قیمتی تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کریں گے۔

آخر میں آپ سبھی سے یہی ایک التجا ہے کہ اردو کو مضبوط کیجیے، تاکہ یہ ملک مضبوط ہو سکے، تاکہ ہم آپ مضبوط ہو سکیں!

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

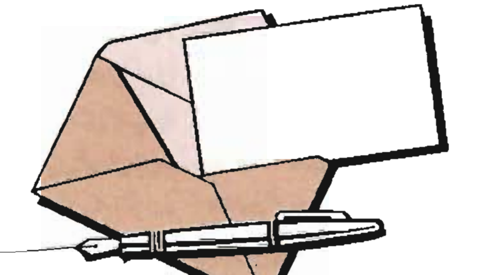

مشتاق کریمی

342، شہید عبدالحمید نگر، کاٹیا فائیل، جلگاؤں

خوبصورت ودیدہ زیب اور تازہ 2013 کے 'اردو دنیا' کی میں فی الوقت سیر کر رہا ہوں۔ قومی اردو کونسل اور آپ تمام حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس کا نیا، نیا تو چھوڑیے پرانا شمارہ بھی باذوق قاری کو ورق گردانی پر مجبور کر دیتا ہے۔ تازہ شمارے کی کور اسٹوری 'بچوں کا ادب اور اردو' کے تحت فاروق ارگلی، ابن آدم، ظفر عدیم، امتیاز احمد اور وکیل نجیب کے مضامین جاندار بھی ہیں اور شاندار بھی۔ اس کے علاوہ دیگر مشمولات بھی باذوق قاری کے دل کا دامن کھینچتی ہیں۔ بطور خاص اصغر علی انجینئر پر سید احمد قاری کا مضمون پڑھ کر مرحوم کے حق میں دل سے دعا نکل گئی۔ ممتاز افسانہ نگار شموئل احمد سے رفیق جعفر کا انٹرویو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شموئل احمد نے بڑی خوبصورتی اور جرأت مندی سے جوابات دیے ہیں۔ اس انٹرویو کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شموئل صاحب نے برسوں کتنا مطالعہ کیا، کتنی عرق ریزی کی، اندھیری راتوں میں پِتّہ پانی کر کے افسانہ کا چہرہ منور کیا اور پھر اسی نور نے شموئل صاحب کی شخصیت کو بھی منور کر دیا۔ اردو کے ناقدوں کے تعلق سے شموئل صاحب نے جو اظہار خیال کیا ہے اس سے میری طرح ہزاروں اردو والے متفق ہیں۔ ہم نے الگ الگ گروپ بنا رکھے ہیں۔ جیسے اردو دنیا نہ ہو کوئی فلم انڈسٹری ہو۔ جس میں لابی اِنگ چلتی ہے، فن نہیں چلتا (بیشتر اوقات) بلکہ گروپ چلتا ہے۔ ہم اردو والوں کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ہم 'محنت کم نیکیاں زیادہ' حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قلیل وقت میں آسمان ادب کا ستارہ بننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ جس کے لیے نقادوں کی قدم بوسی بھی کرنی پڑتی ہے اور ان کی خدمت عالیہ میں نذرانے بھی پیش کرنے پڑتے ہیں۔ جب فیلڈنگ ٹھیک طرح سے لگ جاتی ہے تو پھر ہمارے نام نہاد قلمکار کی قسمت چمک جاتی ہے۔ پھر یہاں وہاں اخبارات ورسائل میں حوصلہ افزائی و پذیرائی کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔ سچویشن ایسی بن جاتی ہے کہ کبھی تو نقاد اپنے شاگرد کی پیٹھ تھپتھپاتا نظر آتا ہے تو کبھی شاگرد خود ہی یہ اہم فریضہ انجام دیتا نظر آتا ہے تاہم اوریجنل فنکار کبھی نقادوں کے در کی خاک نہیں چھانتا۔ شموئل صاحب کو علم نجوم سے شغف ہے اور وہ اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے ہی پہلی بار علم نجوم کی اصطلاحوں کا افسانوں میں استعمال کیا ہے۔ اس موقع پر مجھے امّی احمد آبادی کے چار مصرعے یاد آ رہے ہیں:

نہ رہا چاند ستاروں کا میں محتاج کبھی
اپنی محنت کے سدا میں نے اجالے دیکھے
تذکرہ اس نے لکیروں کا وہیں چھوڑ دیا
جب نجومی نے میرے ہاتھ میں چھالے دیکھے

آخر میں اتنے خوبصورت وخوب سیرت رسالہ کی اشاعت پر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر عبدالحی، نصرت ظہیر اور وسیم بریلوی صاحب کے ہمراہ قومی اردو کونسل اور اردو دنیا کے تمام ہی عملے کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔

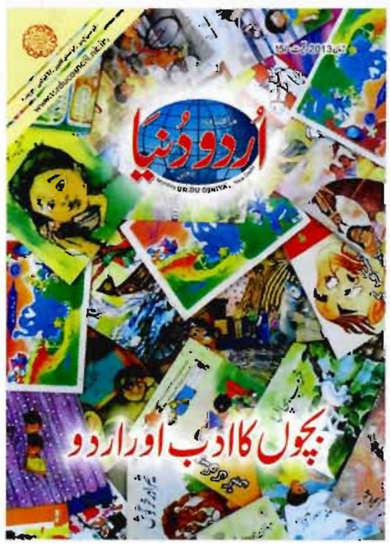

مدحت الاختر

وارث پورہ، کامٹی (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' ہر ماہ موصول ہو کر مطالعے کا مرکز بن جاتا ہے۔ صوری اور معنوی ہر اعتبار سے یہ اردو کا منفرد رسالہ ہے۔ اس دفعہ بچوں کے ادب پر جو مواد آپ نے شامل کیا ہے وہ وقیع ہے۔ سید معین الدین علوی کا مضمون 'گمشدہ مصرعوں کی تلاش' گمشدہ خزانے کی بازیابی کی طرح مسرور کر گیا۔ 'سنیما میں مردانہ بصری تسکین' پڑھ کر ایسا لگا جیسے کسی نئے پکوان کا ذائقہ محسوس کر رہا ہوں۔ شموئل احمد سے رفیق جعفر کا مضمون بصورت انٹرویو بھی دلچسپ ہے۔ مشاہیر ادب کے تحت آپ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ طلبہ کے علاوہ عام قاری کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔ امید ہے 'اردو دنیا' کی یہ خصوصیات اہلِ اردو کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مرکوز رکھیں گی۔

کرشن بھاوُک

201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا جون کا شمارہ حسبِ معمول پہلی تاریخ کو ہی باصرہ نواز ہوا۔ چونکہ میں ضرب المثل کے زاویے سے آج کل تحقیق کر رہا ہوں، اس لیے سب سے پہلے بڑی محنت سے تحریر کیے سید معین الدین علوی کے مضمون 'گم شدہ مصرعوں کی تلاش' کی بابت چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ ادارہ اتنے عمدہ مضمون کی اشاعت کے لیے ازحد مبارکباد کا مستحق ہے، تاہم ضرب المثل کے زاویے سے بہت سی مثالیں صحیح نہیں ہیں، کیونکہ انھیں عوام الناس نے کبھی بھی روزمرہ کا حصہ نہیں بنایا ہے۔ اس ازحد محنت طلب مقالے میں سب سے پہلے خواجہ حیدر علی آتش کے مقبولِ عام شعر کے اول مصرعے میں اول لفظ کو 'بڑا' پایا ہے، 'بڑا شور سنتے تھے۔' (دیکھیں کتاب 'انتخابِ کلیاتِ آتش'، انتخاب احمد جاوید، دانش پبلی شنگ کمپنی۔ نئی دہلی، نیا ایڈیشن سنہ 2010) جبکہ معزز موصوف نے مروج صورت ہی لکھی ہے۔ ''بہت شور سنتے تھے...'' (ص 33)، شیخ ابراہیم ذوق کا یہ ایک شعر ضرب المثل کبھی نہیں رہا ہے۔ لیکن عمدہ اتنا ہے کہ قابلِ حوالہ ضرور مانا جائے گا۔ اس کا متن بھی سوالیہ نشان لیے ہوئے ہے۔ موصوف کا دیا ہوا اول مصرعہ یہ ہے۔ ''آدمیت اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے/لاکھ طوطے کو پڑھایا، پر وہ حیواں ہی رہا۔'' اس شعر میں 'شے' لفظ کا دوبارہ آنا مجھے کھٹکا تھا، لیکن منوج پبلی کیشنز، دہلی سے ہندی زبان میں کلیم آنند کے مرتب شدہ مجموعہ 'ذوق کی شاعری' میں صفحہ 172 پر دوسرے 'شے' لفظ کی جگہ پر مجھے 'چیز' لفظ کا تصرف زیادہ صحیح لگا ہے۔ اس کے علاوہ مصرع ثانی میں ''لاکھ' لفظ کی جگہ ''کتنا' لفظ کا استعمال ہوا ہے۔

اسلم پرویز کی مرتبہ کتاب 'شیخ محمد ابراہیم ذوق' میں بھی (ص 239, 333) 'شئے' لفظ کی بجائے 'چیز' لفظ ہی ملتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

نسیم منزل، مدح گنج پولس چوکی، سیتاپور روڈ، لکھنؤ

اُردو دنیا جون 2013 کے صفحہ 33 تا 36 پر شائع ہوا مضمون بعنوان 'گم شدہ مصرعوں کی تلاش' گزشتہ سال ماہنامہ 'آجکل' جون 2012 کے صفحہ 3 تا 7 پر شائع ہو چکا ہے۔ مضمون کے مصنف جناب معین الدین علوی نے نہ تو عنوان تبدیل کیا اور نہ کسی لفظ کی کمی بیشی کی۔ اُن کا یہ رویہ ادبی دیانتداری اور آپ کے جریدے کی پالیسی کے خلاف ہے۔ براہ کرم اُن کو ضروری ہدایت فرمادیں۔

'اردو دنیا' کو اتنی توجہ سے پڑھنے کے لیے شکریہ۔ غیر معمولی صورتوں میں ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر کئی بار شائع شدہ مضامین بھی 'اردو دنیا' میں شائع کیے جاتے ہیں۔ مگر ان کے ماخذ کا باقاعدہ حوالہ دیا جاتا ہے۔ معاوضہ کی ادائیگی صرف غیر مطبوعہ مضامین کے لیے ہوتی ہے۔ مذکورہ اطلاع کے درست پائے جانے کے پیش نظر معاوضہ کی ادائیگی روک دی گئی ہے۔ آئندہ مضمون نگار کی نگارشات 'اردو دنیا' میں شائع نہیں ہو سکیں گی۔ (ادارہ)

ناشر نقوی

پروفیسر شعبۂ اردو، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

مئی کا شمارہ اپنے ٹائٹل سے ہی اپنے مشمولات کا خوبصورت اشاریہ ہے جس کے لیے آپ کے کمپیوٹر ڈزائنر کی تعریف کرنی ہوگی۔ ہماری بات میں آپ نے پوری 'اردو دنیا' کی طرف سے وسیم بریلوی، اختر الواسع، ندا فاضلی، سالک لکھنوی اور ایم اشرف عالم کو ایوارڈ اور اعزاز ملنے کی جو مبارک باد دی ہے اس کے لیے حلقہ اردو آپ کا متشکر ہوگا۔ اس شمارے میں وسیم بریلوی اور اختر الواسع صاحب سے عبدالحی اور قاسم انصاری صاحب نے انٹرویو میں جو سوالات کیے اور ان کے معقول جوابات ملے، انھوں نے بہت متاثر کیا۔ اردو کی نئی بستیوں کے تعلق سے وسیم صاحب نے امریکہ، انگلینڈ اور مشرق وسطیٰ کی اردو تنظیموں اور وہاں کے اخباروں سے جو متعارف کرایا ہے وہ یقیناً فروغ اردو کے لیے نیک فال ہے۔ عبدالحمید نعمانی اور توقیر راہی کے مضامین جو اردو اور مدارس سے متعلق ہیں بہت اہم اور معلوماتی ہیں۔ نعمانی کا یہ مشورہ کہ مدارس نے جو اردو کے لیے کیا ہے اُسے پراجیکٹ بنا کر سروے کرایا جائے۔ مناسب تحریک ہے۔ اسی ضمن میں ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی، اور خوشتر نورانی نے بھی بڑی سودمند باتیں کی ہیں۔ انصاری شگفتہ کا مضمون جو غیر مسلم خواتین نثر نگاروں سے متعلق ہے بہت معلوماتی ہے۔ انھوں نے چھوٹے سے مضمون میں کئی خواتین کو شامل کیا ہے۔ اجیت کور کے ذکر میں ان کے ناول 'گوری' کو بھی شامل کرلیں تو بہتر ہوگا۔ یہ بھی اردو میں چھپ چکا ہے۔ پنجاب کی پنّو پرواز بھی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ تانیثی ادب اور چند شاعرات، مضمون میں نسیم اختر نے 'چند' کی شرط سے اپنا دامن بچا لیا۔ یہ موضوع ویسے بھی ایک مضمون کا نہیں دو تین مقالوں کا ہے پھر بھی مضمون نگار نے اختصار میں خاصا انصاف کیا ہے۔ ملیالم پر اردو کے اثرات کو ریاض احمد نے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ محمد شاہد حسین نے ہندوستانی ڈرامے کی قدامت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ محمد خلیل نے نمک کے زیادہ استعمال کے مضر اثرات کو خوب پیش کیا ہے۔ کل 100 صفحات میں ادب، زبان، تہذیب، کلچر اور سائنسی علوم کو فکر انگیز اور گل ریز بنا کر آپ کی ادارتی ٹیم جس طرح پیش کر دیتی ہے وہ لائق پذیرائی ہے۔ آپ لوگ یہ بھی تحریک دیتے ہیں کہ سرکار کا حصہ بن کر سرکاری سرمائے کو دوسروں سے زیادہ کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

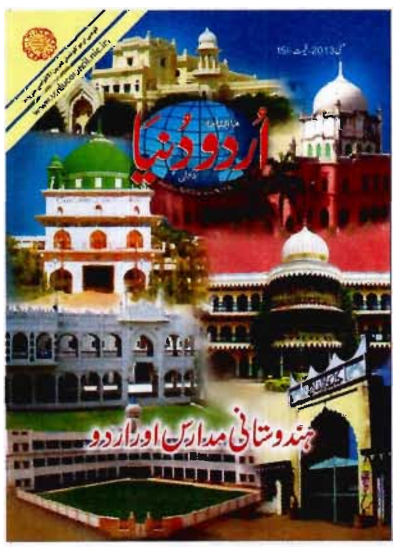

ڈاکٹر مشیر الحق قریشی

21، حضرت مکن، ویلور، تمل ناڈو

مئی 2013 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ 'اردو دنیا' ایک معیاری و مستند علمی و ادبی جریدہ ہونے میں دو رائے نہیں، آئندہ اس رائے میں دوام واستحکام کا برقرار رہنا، یہ آپ کی ادارت میں منحصر ہے۔ ہندوستانی مدارس کے ذریعے اردو زبان کی ترویج وترقی سے متعلق مئی کی خصوصی اشاعت بے پایاں مسرت کا باعث بنی، اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں دینی درسگاہیں اردو زبان وادب کو نئی زندگی بخشنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں اور اسی زبان کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم وتدریس اور تفہیم کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اور ان سے فارغ ہونے والے علما اور فضلا جمعے کے خطبوں اور دیگر دینی مجلسوں میں یہی زبان عام طور پر استعمال کر رہے ہیں اور جو علما اصحاب قلم ہیں وہ بھی اپنی تحریروں کے ذریعے اشاعت علم دین میں مصروف عمل ہیں اور بے شمار کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ یہ وہ مختلف جہتیں اور سمتیں ہیں جن کے ذریعے اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے۔ اردو بھلے سے صرف مسلمانوں کی زبان نہ سہی لیکن وہ مسلمانوں کی دینی و معاشرتی اور تہذیبی و اخلاقی قدروں کی آئینہ دار ہے اور وہ ان کے علمی و مذہبی اور تاریخی اثاثہ کی امین اور محافظ ہے۔ آخر میں آں مکرم کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ایک علمی اور اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ نے اردو دنیا کے اس خصوصی شمارہ کو اردو کے حوالے سے صرف شمالی ہند کے مدارس کے ساتھ مختص کر دیا ہے اور جنوبی ہند کے کسی ایک مدرسہ کا حوالہ نہیں ہے۔ حالانکہ اردو زبان کے آغاز سے لے کر آج تک بھی جنوب کے سیکڑوں مدارس بالواسطہ اور بلاواسطہ اردو زبان وادب کی خدمت انجام دیتے آرہے ہیں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا (مدھیہ پردیش)

اردو زبان کو برصغیر تک پھیلانے میں مدارس کا بہت بڑا حصہ ہے، مدارس کی وجہ سے اردو زبان زندہ ہے۔ اردو زبان ایک طرز حیات اور تہذیب سے عبارت ہے۔ اردو زبان کی اصلی روح اور اس کے تہذیبی حسن کا تحفظ مدارس نے ہی کیا جس سے اردو کو فکری تحرک اور توانائی حاصل ہوئی۔ اردو کی طرف غیر مسلمانوں کے رجحان میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کا لسانی پس منظر اس زبان کی انفرادیت اور شائستگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ مدارس نے ادب کی جملہ اصناف میں منفرد اور مختلف تجربے کیے ہیں۔ صدیق ارشاد ملا رموزی نے اردو نگارش کو گلابی اردو بنا دیا۔ اس طرز نگارش کے جملوں میں الفاظ کو بے ترتیب کرکے وہ لکھتے تھے۔ ان کے مضامین میں ایک قسم کی لذت پائی جاتی ہے۔ ان میں ایک پیغام ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو دعوت فکر دیتا ہے۔

عاطف جلیس

کانکی نارہ، شمالی 24 پرگنہ، مغربی بنگال

مئی کا شمارہ 'اردو دنیا' وقت پر موصول ہوا۔ سرورق پہ بہت ہی شاندار ہندوستانی مدارس کی تصاویر اور ان کی اردو خدمات پر جامع مضامین جسے توقیر راہی، عبدالحمید نعمانی، ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی اور خوشتر نورانی نے لکھے ہیں جسے پڑھ کر ہم ہندوستان کے مدارس کے کارنامے سے واقف ہوئے جو قابل ستائش ہے۔

قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، وزیر مملکت فروغِ انسانی وسائل جناب جتن پرساد اور NIELIT کے ڈائرکٹر ایم کے دویدی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے کونسل کو اور مزید بہتر بنانے کے لیے کوششیں کی ہیں۔ اردو دنیا کی خبروں سے یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ شاستری بھون میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی مجلس عامہ منعقد ہوئی جس میں کونسل کے ڈائرکٹر نے کونسل کو درپیش مسائل سے وزیر مملکت جناب جتن پرساد کو باخبر کرایا۔ دو روزہ ورک شاپ لکھنؤ میں 25 و 26 اپریل کو منعقد ہوا تھا اس ورک شاپ میں 'کانکی نارہ حمایت الغربا ہائی اسکول (کیم ڈی ٹی پی سنٹر)' کی جانب سے شرکت کیا تھا، ڈائرکٹر صاحب کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا، انھیں میں نے ہمہ جہت عمل پیرا پایا۔ کونسل کا جریدہ 'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' دونوں زیر مطالعہ ہیں۔ ان دونوں جریدوں نے دھیرے دھیرے لوگوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما لیا ہے۔

ڈاکٹر شمیم دیوبندی

فیض کلینک لال مسجد، دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ مئی 2013 نظر نوازا ہوا۔ حسب سابق تمام تر رعنائیوں سے بھرپور شمارہ دیکھ کر دل مسرور ہوگیا۔ قومی اردو کونسل کا یہ ترجمان ہر بار اردو کی محبت سے لبریز ہوتا ہے۔ اس بار بھی یہی دیکھنے کو ملا۔ جب مطالعہ ہماری بات سے شروع کیا تو پورا صفحہ ہی دل کو بھا گیا۔ لیکن چند سطریں تو اتنی پسند آئیں کہ ان کا ذکر کرنا گویا اردو کو فروغ دینا ہی ہے کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مکتبوں اور مدرسوں نے تقسیم ہند کے بعد اردو زبان اور خاص طور پر اس کے رسم خط کی حفاظت میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور اس میں بھی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے بڑا سرکاری نیٹ ورک، ان ہی مکتبوں اور مدارس اسلامیہ کا ہے جو سرکاری امداد کے بغیر کام کرتے چلے آرہے ہیں۔" اس میں اگر ایک رائے اور شامل کردی جائے تو شاید اور بہتر ہو کہ "سب کے لیے تعلیم" کو بھی ان مدارس نے پروان چڑھایا ہے۔ آخر میں پدم شری اور لیش بھارتی سمان حاصل کرنے والے پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر وسیم بریلوی کو مبارکباد پیش کی گئی ہے۔ یہ ان کا حق بھی ہے اور ہم سب کا فریضہ بھی۔ ان کے علاوہ کور اسٹوری پر توقیر راہی کا مضمون، عبدالحمید نعمانی کا مضمون حقانی القاسمی کا مضمون اردو مطالعات اور مدارس میں نئی جان ڈال رہے ہیں۔ زبان و تعلیم، ادبی مباحث، شخصیت، تہذیب و ثقافت اور خاص طور پر صحت پر محمد خلیل کا مضمون 'نمک کا زیادہ استعمال نقصان دہ ہے' بہت سبق آموز لگا۔

ایم ڈی شکیل خان

یو ایس بی ایل سی پٹنہ (بہار)

مئی ماہ 2013 کا نیا نویلا اردو دنیا دیکھا۔ حضرت داغ کی شاعری ہو یا ان سے متعلق دیگر تمام چیزیں سب کی سب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہماری بات ہو یا آپ کی بات دونوں حسب سابق اردو دنیا کی زینت ہوا کرتی ہیں۔ مظفر علی کا انٹرویو ہو یا قاسم، عبدالحی کی گفتگو۔ ہندوستانی مدارس اور اردو کی سیر نے اس قدر خوش کیا کہ جتنا کچھ کہا جائے کم ہوگا۔ توقیر صاحب نے اپنے عنوان کی توقیر کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار تو حاصل شمارہ مضمون ہے۔ دوسرے مضامین بھی معیار کے اعتبار سے اس سے کچھ کم ہرگز نہیں ہیں۔ مدارس اسلامیہ اور اردو کا لسانی استحکام کے تعلق سے قاسمی صاحب کی تحریر ان کا حصۂ خاص ہے۔ موصوف جس موضوع کو روئے سخن بناتے ہیں اس سے متعلق بھرپور اور خاطر خواہ معلومات فراہم کراتے ہیں۔ حقانی صاحب نے کما حقہ اپنا حق رشحات قلم ادا کردیا ہے۔ جامعہ سلفیہ کی عالی شان عمارت دامن دل کشا کی مصداق ہے۔ تصنع سے بالکل پاک ملا رموزی کے کوائف نے نسیم سحر کا کام کیا۔

جوہر جاوید

بھدریہ، گیا، بہار

ماہ مئی کا 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر 'ہندوستانی مدارس اور اردو زبان' دیکھ کر خوشی کا احساس ہوا کہ اس بار اردو دنیا کے ذمے داران نے اس اہم موضوع کو اپنی کور اسٹوری کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ بات روز روشن سے بھی زیادہ عیاں ہے کہ مدارس اسلامیہ ہند نے اردو کی ترقی، ترویج، اشاعت اور حفاظت و صیانت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور ہنوز کررہے ہیں۔ کوئی متعصب اور جانب دار ہی اس روشن حقیقت کا منکر ہوسکتا ہے۔ مدارس اسلامیہ سے متعلق افراد نے دونوں اصناف نظم و نثر کی بقا میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ عربی و فارسی کی تقریباً تمام امہات الکتب کا ماضی میں اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ترجمے کا یہ عمل ہنوز جاری و ساری ہے۔ یہ تمام باتیں ماضی کے پس منظر میں تو صحیح معلوم ہوتی ہیں مگر موجودہ صورتِ حال اس اعتبار سے اطمینان بخش نہیں کہ معدودے چند مدارس کے سوا دیگر اداروں میں اردو زبان و ادب کی باقاعدہ تعلیم کا بند و بست نہیں ہے۔ لہٰذا شعوری طور پر مدارس کو اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اپنا مثالی اور فعال کردار ادا کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں اردو زبان و ادب کی کس قدر تعلیم ہوتی ہے، اس پر ایک جائزہ اس شمارے میں شائع کیا گیا ہے۔ دیگر مدارس کے جائزوں کے بعد تصویر مزید صاف ہوجائے گی اور مستقبل کا مکمل، پائدار اور ٹھوس لائحہ عمل تشکیل دینے میں مدد ملے گی۔ ہماری بات کے زیر عنوان اداریہ میں موضوع کا مکمل نچوڑ اور مستقبل کا جامع لائحہ عمل آگیا ہے۔ "کچھ ایسی تدبیریں بہرحال کی جاسکتی ہیں، کچھ ایسے منصوبے بہرصورت وضع کیے جاسکتے ہیں کہ مدرسوں کے تعلیمی نظام میں اردو زبان و ادب دونوں کو مناسب و موزوں جگہ دی جاسکے اور مدرسوں کے فارغین تعلیم و تدریس سے لے کر میڈیا تک ہر اس شعبے میں روزگار حاصل کرسکیں جہاں اردو جاننے والوں کی ضرورت ہے۔" ضرورت اس بات کی ہے کہ مدیر کی یہ تمنائیں اور آرزوئیں حقیقت کا جامہ پہن لیں، اور مستقبل قریب میں ایسی صورت پیدا ہوجائے۔

عبدالرشید ٹھاکر

حالسیڈ اروپرینا گ اننت ناگ، جموں وکشمیر

'اردو دنیا' پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ زیرنظر شمارہ مئی 2013 کا ہے۔ سرورق پر ہندوستان کے مدارس کے فوٹو اور 'ہندوستانی مدارس اور اردو' جلی عبارت میں تحریر ہے۔ حالانکہ یہ اردو مدارس نمبر نہیں ہے۔ اگر جنوبی ہندوستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں اردو کی بات کی جائے تو کوئی حوصلہ افزا بات دکھائی نہیں دے گی اور اگر خدانخواستہ مدارس کو بھی چھوڑا جائے تو پھر اردو کا ٹھکانہ شاید ہی ملے۔ سرکاری طور پر اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے مگر زمینی سطح پر اس کا دائرہ عمل جھیل ڈل کی طرح سکڑ چکا ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کا جنازہ کب کا اٹھ چکا ہے۔ انگریزیانے کے عمل نے اردو کے ماحول کو الوداع کردیا ہے۔

خ ع شاذ

ہولڈنگ 39، گلی 3، کانکی نارہ، شمالی 24 پرگنہ

اپریل کا ماہنامہ مجلّہ وقت پر موصول ہوا، سرورق پر اردو بھون کی تصویر، آخیر ورق پر 'گھر بیٹھے اردو سیکھیں' کا اشتہار بہت خوب ہے۔ اس کے سارے مضامین اچھے اور معلوماتی ہیں۔ گزشتہ چار برسوں سے مشاہدہ کررہا ہوں کہ 'اردو دنیا' دھیرے دھیرے ہر عام و خاص میں مقبول ہوتا جارہا ہے۔ مطالعہ میں شوق کیونکر پیدا نہ ہو اس میں اردو ادب، اردو ادب کی تاریخ، سائنس و ٹکنالوجی، صحت، کیریئر و کیریئر سازی اور ہر ماہ کسی نہ کسی شخصیت کا انٹرویو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ مستقبل میں کونسل جس کام میں ہاتھ لگائے اسے کامیابی و کامرانی نصیب ہو۔ ■

نصرت ظہیر

غریب مترجم کا ادب میں کوئی مقام ہی نہیں!

مظہرالحق علوی

تصویر: اکبر زیدی

اردو ادب کے جو تین علوی برادران ہیں ان میں سب سے بزرگ ہیں سید مظہرالحق علوی، جنھیں فی الوقت اردو کا سب سے مشہور ، سب سے کامیاب اور سب سے مقبول مترجم مانا جاتا ہے۔ عبدالحلیم شرر اور منشی تیرتھ رام فیروزپوری بھی اپنے وقتوں کے مشہور مترجم تھے لیکن اردو ترجمے کو ایک عام فہم، دل نشیں اور بامحاورہ زبان و لہجہ دینے والوں میں مظہرالحق علوی کا نام اس لیے بھی سر فہرست ہے کہ غیرملکی زبانوں کا جتنا ادب اکیلے انہوں نے ترجمہ کر کے اردو والوں تک پہنچایا ہے اتنا کئی مترجمین نے مل کربھی نہ پہنچایا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے فکشن کے اردو ترجمے کو صحیح راستہ دکھایااور کوشش کی کہ ان کے ترجمے میں متعلقہ زبان اور اس کا لہجہ بھی تھوڑا بہت منتقل ہو سکے۔ تقریباً نصف صدی پہلے برام اسٹوکر کے ناول 'هاررز آف ڈراکیولا 'کا جو ترجمہ انہوں نے 'ڈراکیولا' کے نام سے کیا تھا، وہ مظہر صاحب کی ادبی زندگی کا پہلا سنگ میل تھا، جس نے اردو والوں کو چونکا دیا تھا۔ یہ اعزاز بھی انھی کو حاصل ہواہے کہ قارئین کی پرزور مانگ پر ان کے کیے ہوئے کئی تراجم کی دوبارہ اشاعت شروع ہو گئی ہے۔اس معاملے میں ان کے واحد حریف ابن صفی ہیں۔تاهم اردو تراجم کے تعلق سے یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔ان کے محترم بھائیوں وارث علوی اور محمد علوی نے اردو تنقید اور شاعری میں بلند مقام پایا ہے، لیکن ترجمے کی خشک، بنجر اور بے آب وگیاہ وادی کی جو چمن بندی مظہرالحق علوی نے کی ہے اسے اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔نصرت ظہیر کے سوالات کی روشنی میں ملاقات کیجیے اردو ادب کی اسی بزرگ ہستی سے! (ادارہ)

نصرت ظہیر: یہ ایک دل چسپ اور عجیب سی بات ہے کہ آپ خود تخلیق کار ہیں لیکن پہچان آپ کی ایک مترجم کے طور پر بنی۔ ایسا کیوں کر ہوا؟

مظہرالحق علوی: آپ کا سوال بھی دلچسپ اور عجیب ہے۔ اگر مرزا غالب سے پوچھا جائے کہ آپ ایک زبردست اور کامیاب نثر نگار ہیں لیکن آپ کی پہچان ایک شاعر کے طور پر بنی۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ 'مشیت ایزدی' اور میں سمجھتا ہوں یہی صحیح ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کچھ ظاہری اسباب یا اتفاقات یوں ہوتے ہیں جو ایک تخلیق کار کو دوسری اور زیادہ کامیاب ڈگر پر ڈال دیتے ہیں جو اسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ جی ہاں۔ میں نے افسانے لکھے اور ایک حد تک مشہور بھی ہوئے۔ وارث علوی آج بھی یہی کہتے ہیں کہ یار محمد (میرا پورا نام محمد مظہرالحق ہے) اگر تو افسانے ہی لکھتا رہتا تو آج بڑا افسانہ نگار ہوتا۔ شاید ایسا ہی ہوا لیکن اتفاقاً ایسا نہ ہوا۔ جس زمانے میں افسانے لکھا کرتا تھا میرے چھوٹے بھائی مرحوم زین العابدین چیخوف کی کہانیوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم دونوں میں طبع زاد اور ترجمہ پر بحث ہوگئی اور انھوں نے کہا کہ بھائی طبع زاد لکھنا آسان ہے ترجمہ کرو تو ہم جانیں اور جناب میں نے ان کا یہ چیلنج قبول کر کے سامرسٹ مایم کی تین کہانیوں کا ترجمہ کردیا۔ ترجمہ بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس عرصے میں میرا پہلا ترجمہ کردہ ناول 'گنج سلیمان' چھپ کر مارکٹ میں آ گیا جس کی وجہ سے میں نے شہرت کے زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ پھر تو نصرت صاحب دھڑا دھڑا ترجمے کرتا رہا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ طبع زاد لکھنا آسان ہے لیکن ترجمہ کرنا اور وہ بھی بے حد کامیاب ترجمہ، جو قاری کے منہ سے واہ نکال دے، کافی مشکل ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ شاعری پیغمبری ہے تو ترجمہ کرنا عطیۂ خداوندی ہے۔

ن ظ: آپ کے دو چھوٹے بھائیوں، وارث علوی اور محمد علوی نے علی الترتیب اپنی تنقید نگاری اور شاعری سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے اور خود آپ نے ترجمے کے میدان میں نام کمایا۔ اس حسن اتفاق کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

مظہرالحق علوی: آپ کے اِس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب میں آگیا ہے۔ تاہم اتنا بتا دوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ الہ آباد میں جب اس کی شاخ قائم تھی، ایک دفتر تھا وارث علوی سکریٹری تھے۔ ہر ہفتے مجلسیں ہوتی تھیں۔ شعرا حضرات اپنا کلام سناتے، اس پر رائے زنی اور تنقید وغیرہ ہوتی لیکن صرف شاعری ہی شاعری تھی۔ نثر نگار کوئی تھا نہیں۔ وارث نے مجھ سے کہا کہ تو افسانہ لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا، پسند کیا گیا۔ بمبئی سے عادل رشید کی ادارت میں نکلنے والے ہفتہ وار 'شاہد' میں چھپ گیا۔ داستان طویل ہے۔ مختصر کرتا ہوں۔

وارث نے کہا اتنے بہت سے شاعروں کے درمیان ایک نثر نگار کا ہونا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ چنانچہ انھوں نے اور محمد علوی نے بھی افسانے لکھے۔ اس عرصے میں انھیں اپنی تخلیقی قوتوں کا اندازہ ہوگیا۔ چنانچہ وارث علوی تنقید کی طرف نکل پڑے اور محمد علوی شاعری کے میدان میں جھنڈے گاڑنے لگے اور میں افسانے کے میدان میں ڈٹا رہا اور ایک واقعہ نے ترجمہ کے میدان کی طرف موڑ دیا اور نتیجہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ آپ اسے حسن اتفاق کہتے ہیں تو صحیح کہتے ہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اگر ہم تینوں افسانہ نگار یا مشاہیر یا نقاد ہی ہوتے تو ہم تینوں میں معاصرانہ چشمک یا شرر اور چکبست جیسے معرکے ہوتے اور ہم تینوں وہ نہ ہوتے جو ہیں یعنی ایک جان اور تین قالب۔

ن ظ: اردو کے کن مترجمین سے آپ متاثر ہوئے ہیں؟

مظہر الحق علوی: اردو میں ترجمے ہوئے ہی کتنے ہیں۔ انگلیوں پر گن لیجیے۔ ترجمے کی اہمیت کو تسلیم تو سبھی نے کیا ہے لیکن بڑے ادیبوں نے تو ترجمہ کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور خود مترجم کو کاسہ لیس۔ غریب مترجم کا ادب میں کوئی مقام ہے ہی نہیں۔ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے ہجوم میں بے چارہ ایک گوشے میں تنہا کھڑا ہے کہ 'کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہیں'۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ منٹو نے وکٹر ہیوگو کے ایک مختصر سے ناول کا ترجمہ کیا تھا 'سرگزشت اسیر'۔ اس کے بعد مرزا حیرت کا ہیگرڈ کے ناول 'دی مون آف اسرائیل' کا ترجمہ نظر سے گزرا جو 'بنی اسرائیل کا چاند' کے نام سے آیا تھا۔ اور تیرتھ رام فیروز پوری کے تو کئی ناول نئے پڑھ ڈالے۔ لیکن یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں نے افسانے نہیں لکھے تھے، ترجمہ کرنا تو دور کی بات ہے۔ لیکن بعد میں، جب میں کئی ناولوں کے تراجم کر چکا تھا تب میں نے حسن عسکری، نسیم ہمدانی اور قرۃ العین حیدر کے تراجم شوق سے پڑھے اور اگر متاثر ہونے کا مطلب ان کے طرز تحریر کو اپنانے سے مراد ہو تو میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے ہی طرز پر ترجمہ کرتا رہا اور شاید یہی میری شہرت کا راز ہے۔

ن ظ: غیر ملکی زبانوں سے تراجم کے کم از کم دو اسلوب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ تخلیق کو پوری طرح اردو زبان اور اس کی تہذیب و ثقافت کے قالب میں ڈھال دیں، اس کے کردار و مقامات کو بدل دیں۔ دوسرا یہ کہ آپ تخلیق کی اصل زبان کے لہجے، ذائقے اور تہذیبی ماحول کو برقرار رکھتے ہوئے قاری تک پہنچانے کی کوشش کریں جو ذاتی طور پر خود مجھے ایک ترجمہ نگار کے طور پر زیادہ پسند ہے۔ آپ نے دونوں اسلوب اختیار کیے ہیں۔ مگر آپ کے بیشتر تراجم دوسرے طرز و اسلوب کے زیادہ تابع ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

مظہر الحق علوی: آپ سچ فرماتے ہیں۔ جی ہاں۔ میں نے تقریباً سارے ہی تراجم دوسرے ہی طرز و اسلوب میں کیے ہیں۔ وہ بھی ارادتاً نہیں۔ وہ اس طرح اپنے آپ ہوگئے۔ شاید اس لیے کہ مجھ میں جو افسانہ نگار ہے وہ مرا نہیں ہے۔ میں نے کبھی لفظی ترجمہ کو، جسے مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں، جائز قرار نہیں دیا۔ اکثر مترجموں نے ایسا ہی کیا ہے چنانچہ وہ کب طلوع ہوئے اور کب غروب ہوگئے کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ مثلاً مخمور جالندھری جنھوں نے شولوخوف کے دو ناول اور ٹالسٹائی کے 'اینا کرینینا' کا جو اصل کا اختصار تھا ترجمہ کیا اور پھر ترجمہ اور خود بھی ادب کے میدان سے غائب ہوگئے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو (ہو جاتا ہے) اسی طرح میرے خیال میں بگڑا بلکہ ناکامیاب ادیب مترجم بن جاتا ہے۔ میرے دو ایک دوستوں نے ایسی ہی کوشش کی۔ پہلے شاعری کی نہیں چلی، پھر افسانے لکھے کامیاب نہیں ہوئے، چند افسانوں اور ایک ناول کا ترجمہ کیا وہ مسودے اب تک ان کے گھر میں پڑے دھول کھا رہے ہیں۔ تو بھائی جیسا کہ میں نے کہا شاعری اور تنقید اور فکشن کی طرح مترجم ہونا بھی عطیہ خداوندی ہے یعنی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ میں ایک بے حد کامیاب، مشہور ہر دلعزیز مترجم بن گیا تو نصرت صاحب اسے اللہ میاں کی دین ہی سمجھیے۔

ن ظ: اب تک آپ نے کتنی زبانوں کی کتنی کتابیں ترجمہ کر لی ہوں گی اور سب سے زیادہ مشکل آپ کو کس کتاب کے ترجمے میں پیش آئی؟

مظہر الحق علوی: اب ٹھیک سے یاد نہیں لیکن سو کے قریب ناولوں کے ترجمے کر چکا ہوں۔ زیادہ تر انگریزی ناولوں کے تراجم ہیں۔ ایک روسی ناول کا، ایک فرانسیسی ناول اور تین چار گجراتی ناولوں کے ترجمے کر چکا ہوں۔ کبھی کسی بھی ناول کے ترجمے میں مجھے دقتیں پیش نہیں آئیں۔ البتہ دو ناولوں نے مجھے ناک چنے چبوا دیے۔ ایک روسی مصنف دوستوفسکی کے ناول 'جرم و سزا' نے اور دوسرے گجرات کے بے حد مشہور اور چوٹی کے مصنف جھویر چند میگھانی کے ناول نے جس طرح کا ترجمہ میں نے 'سورٹھ تیرا بہتا پانی' کے نام سے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے لیے کیا۔ 'جرم و سزا' ایک سائیکولوجیکل تھریلر ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک نفسیاتی مرض کا شکار ہے بلکہ یوں کہیے کہ پاگل تو نہیں بلکہ خبطی اور بے چین روح ہے۔ یقین کیجیے کہ اس کا ترجمہ کرتے وقت، یعنی جب تک ترجمہ مکمل نہ ہوگیا میری حالت اسی مرکزی کردار کی سی ہوگئی تھی بلکہ یوں کہیے کہ مرکزی کردار راسکو لنکاف کی روح مجھ میں حلول کر گئی تھی اور میری بیوی بچاری رو رو کر ملنے جلنے والیوں سے کہتی تھی کہ ان کا میاں پاگل ہوگیا ہے۔ 'سورٹھ تیرہ بہتا پانی' کہنے کو تو گجراتی ناول ہے لیکن اس میں جتنے کردار ہیں وہ سب کے سب مختلف قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور اتنی ہی مختلف بولیاں بولتے ہیں مثلاً سورٹھی، باہر وٹی، سیاہیانہ، مال دھاری، میمنی، حاکمی وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بولیوں کو اور محاورات کو سمجھنے کے لیے میں نے کاٹھیاواڑ کا سفر کیا۔ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا، ان کی بولیاں سیکھیں اور سمجھا تب جا کر نصرت صاحب میں نے اس ناول کا ترجمہ کیا جس کی بہت زیادہ تعریف ہوئی اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اس ناول کا ترجمہ براہِ راست گجراتی سے کیا۔ انہی دو ناولوں کا ترجمہ میرے لیے مشکل، بہت مشکل تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سے کامیابی سے پار اتر گیا۔

ن ظ: جس طرح اردو والوں کو سر آرتھر کانن ڈائل اور ان کے مشہور کردار شرلاک ہومز سے منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے متعارف کرایا اسی طرح رائیڈر ہیگرڈ اور اس کے کردار ایلن کواٹر مین کو اردو والوں میں مقبولیت دلانے کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ رائیڈر ہیگرڈ کی غالباً سبھی کتابیں آپ نے ترجمہ کر لی ہیں، یا اب بھی کچھ باقی بچتی ہیں؟

مظہر الحق علوی: جب میں انگریزی ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں تھا تو ہم انگریزی ٹیکسٹ بک کے ساتھ ایک اور انگریزی ناول بھی پڑھایا جاتا تھا جسے 'ریپڈ ریڈر' کہتے تھے۔ یہ ریپڈ ریڈر جو ہمارے یہاں پڑھایا جاتا تھا وہ یہی ہیگرڈ کا ناول 'کنگ سولومنس مائن' تھا جس کا کردار ایلن کواٹر مین تھا۔ یہ اصل ناول کا اختصار تھا۔ ناول مجھے بہت پسند آیا اور کوارٹر مین پر تو میں عاشق ہی ہوگیا۔ چنانچہ جب نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم انہونوی صاحب مرحوم نے مجھے لکھا کہ میں کسی اچھے سے ناول کا ترجمہ کردوں تو وہ چھاپ دیں گے تو میں نے ترجمے کے لیے یہی ناول پسند کیا۔ مکمل ناول تلاش کیا اور 'گنج سلیمان' کے نام سے ترجمہ کیا جو بہت پسند کیا گیا اور ایلن کواٹر مین بھی قارئین کے دل میں گھر کر گیا۔ چنانچہ میں نے ہیگرڈ کے ان ناولوں کی تلاش جاری رکھی جو مجھے بڑی تلاش کے بعد مل گئے اور میں نے ان کا ترجمہ کر دیا۔ یوں شرلاک ہومز کی طرح کواٹر مین بھی اردو دانوں میں مشہور ہوگیا۔ ہیگرڈ نے باسٹھ (62) ناول لکھے ہیں شاید۔ یعنی جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ زیادہ تر ناولوں کا (ہیرو) یہی مشہور

کونسل میں مظہرالحق علوی کو دیے گئے استقبالیے کا منظر۔ ساتھ میں وارث علوی اور سید محمد علوی بھی موجود ہیں۔

ایلین کواٹرمین ہے۔ ہیگرڈ کے جتنے ناول دستیاب ہوسکے انھیں ترجمہ ظاہر ہے کہ میں نے کیا۔ ابھی تو اس کے بہت سے ناول قابلِ ترجمہ باقی ہیں لیکن وہ دستیاب نہیں ہیں۔

ن ظ: اپنی ترجمہ شدہ کتابوں کے نام آپ بہت ہی دل کش اور خاص شاعرانہ قسم کے رکھتے ہیں۔ نیل کی ساحرہ، گنج سلیمان، تیغ زن، تارِ عنکبوت، ظلِ ہما، گرد باد، سورج کا لہو، چاند اور چاندی، خوں ریز وغیرہ۔ اتنے اچھے نام آپ کو کیسے سوجھتے ہیں؟

مظہرالحق علوی: کتابوں کے نام رکھنے کا تو یہ ہے بھائی کہ 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں' والا معاملہ ہے۔ میری کوشش یہی ہے کہ اپنے ناولوں کے نام بے حد دلچسپ اور پرکشش ہوں۔ میں نام سوچتا نہیں خیال میں ایک دم سے آجاتے ہیں، کیونکہ سوچنے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ولبر اسمتھ کا ناول Shout at the Devil زیرِ ترجمہ تھا۔ نصف سے زیادہ ترجمہ ہو چکا تھا لیکن نام سوجھ نہیں رہا تھا۔ ایک شام ہم چار دوست جن میں وارث علوی اور محمد علوی بھی تھے سردار باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور سرشار بلند شہری اپنی غزل سنا رہے تھے کہ انھوں نے یہ شعر پڑھا ''میری تخلیق میں سورج کا لہو تھا۔ جلتے جلتے بڑی مشکل سے بجھا ہوں'' اور مجھے اپنے ناول کا نام مل گیا 'سورج کا لہو۔' 'کونٹ آف مانٹے کرسٹو' کا ترجمہ کررہا تھا۔ اس کے ہیرو کو ایک دم سے خلافِ توقع بڑا خزانہ مل جاتا ہے۔ یاد آیا کہ ہمارے یہاں ایک خیالی پرندہ ہما ہے کہ اس کا سایہ جس شخص پر پڑ جاتا ہے وہ بہت امیر بلکہ بادشاہ تک بن جاتا ہے اور مجھے اس ناول کا نام سوجھ گیا 'ظلِ ہما' وغیرہ وغیرہ۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے ناولوں کے نام چونکا دینے والے رکھوں۔ مثلاً 'سورج کے اندھیرے' لوگ سوچ میں پڑ جائیں کہ یہ سورج کے اندھیرے کیا ہوتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے لوگ ناول خرید لیں۔

ن ظ: آپ نے عالمی ادب میں کلاسک کا درجہ رکھنے والی چند کتابوں کے بھی ترجمے کیے ہیں۔ مثلاً دوستوفسکی کی 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' کا ترجمہ 'جرم وسزا' کے نام سے کیا، اسی طرح سامرسٹ ماہم کی 'مون اینڈ سکس پنس' کو آپ نے 'چاند اور چاندی' کے عنوان سے پیش کیا، لیکن یہ فہرست زیادہ آگے نہیں جاتی۔ زیادہ تر تفریحی ادب یا یوں کہہ لیجیے کہ مقبول عام ادب ہی آپ کی توجہ کا مرکز بنتا رہا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

مظہرالحق علوی: جی ہاں۔ میں نے کلاسکی ناولوں کے تراجم کیے ہیں۔ لیکن وہ چلے نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے ناول پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا اور اب بھی ہے۔ یہ میرے قارئین مجھ سے تفریحی ناولوں کی توقع رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ ناول پسند نہیں کیے گئے۔ خود نسیم ڈپو کے مالک نسیم انہونوی مرحوم نے بھی مجھے لکھا کہ میں جرم وسزا اور چاند اور چاندنی جیسے ناول ترجمہ نہ کروں کہ یہ پسند نہیں کیے جاتے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ادیب کو قارئین کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں مصنف کا بھی بھلا ہے اور پبلشر کا بھی۔

ن ظ: کہیں کہیں آپ نے تخلیق میں ترامیم اور حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً رافیل سباتینی کے ناول 'سی ہاک' کے ترجمے 'شاہین سمندر' میں آپ نے اس کے مرکزی کردار کے ساتھ کافی چھیڑ چھاڑ کی ہے اور اسلام کی اچھی خاصی تبلیغ کر ڈالی ہے، جب کہ اصل ناول میں یہ سب نہیں ہے۔ سباتینی نے عرب قزاقوں اور غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے مظالم کو ان کی اصل شکل میں پیش کیا ہے جب کہ آپ نے انھیں اسلامی مجاہد بنا ڈالا ہے اور ان کے افعال کی مدافعت بھی کی ہے۔ ایسا کرنا کس لیے ضروری ٹھہرا اور کیا یہ عمل ترجمے کی تہذیب کے منافی نہیں؟

مظہرالحق علوی: نہ تو میں نے مرکزی کردار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے، نہ اسلام کی تبلیغ کی ہے اور نہ ہی قزاقوں کو مجاہد بنا دیا ہے۔ لیکن یہ کردار، سارے کے سارے یا زیادہ تر مسلمان ہی ہیں اس لیے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ میں نے پیش کیا ہے۔ مکالمے ایسے ہی ہیں جیسے کہ عام مسلمان عموماً بولتے ہیں۔ اس طرح قاری پڑھتے وقت ٹھوکر ہی نہیں کھاتا اور کرداروں اور ماحول وغیرہ سے مانوس ہوکر دلچسپی سے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اس تبدیلی پر یا افسانے سے ناول اور اس کے پلاٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس تبدیلی کو یا بقول آپ کے چھیڑ چھاڑ کو میں ترجمہ کو 'تہذیب کے خلاف نہیں سمجھتا بلکہ اس سے اردو ترجمہ کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ آپ کے نزدیک یہ جائز نہ ہو لیکن میرے نزدیک 'مباح' ہے۔ 'فرعون وکلیم' کا مصنف ایک عیسائی ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دشمنی ظاہر ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس ناول میں یہودیوں کے خلاف ڈھکے چھپے لفظوں میں ہی زہر اگلا ہے اور کسی جگہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا نام نہیں لکھا بلکہ انھیں یہودیوں کے 'متاذ' ہی لکھا ہے۔ میں نے اس ناول کا ترجمہ کرتے وقت انجیل مقدس اور قرآن کریم کو سامنے رکھنا اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی صحیح صحیح تصویر پیش کردی۔ اس طرح یہ ناول انگریزی ناول سے زیادہ مکمل اور زیادہ صحیح ہوگیا۔ ہاں ایک بات اور بتاتا چلوں۔ شروع شروع میں میں نے صادق سردھنوی اور شرر مرحوم کے تاریخی ناول پڑھے، بہت پڑھے۔ شرر مرحوم کا طرزِ تحریر مجھے پسند آیا۔ چنانچہ تاریخی ناولوں کے ترجمے کرتے وقت میں شرر کے طرزِ تحریر کو اپنانے کی کوشش کی اور میرے خیال میں بہت حد تک کامیاب رہا مثال کے طور پر 'شاہین سمندر'، 'فرعون وکلیم'، 'امیر اندلس'، 'غلاموں کے سوداگر' وغیرہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی بتادوں کہ 'شاہین سمندر' محض افسانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت میں سر آلیور ترسلان ملکہ الیزبتھ کے زمانے میں تھا اور یہ ناول اسی کے زمانے میں تھا اور شاہین سمندر اسی کی داستان ہے اور سچ ہے۔ ملکہ الزبیتھ کا پورا دورِ حکومت Elizabhethan Period کہلاتا ہے اور بڑے بڑے مشہور ادیب بھی اس دور میں ہوئے ہیں لیکن یہ ایک الگ داستان ہے۔

ن ظ: سب سے زیادہ مقبولیت آپ کے کس ترجمے کو ملی؟ میرا خیال ہے برام اسٹوکر کا 'ڈراکیولا' کافی مشہور ہوا تھا۔

مظہرالحق علوی: آپ سچ کہتے ہیں۔ ڈراکیولا کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی۔ اور اس سے میری پہچان بھی بنی۔ آج بھی لوگ مجھے اسی ناول سے جانتے ہیں۔

اچھا اچھا۔ وہ ڈرا کیولا والے علوی صاحب۔

ن ظ: کس کتاب کے ترجمے میں آپ کو زیادہ لطف آیا، اور کس ترجمے کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں؟

مظہر الحق علوی: ہر ناول کا ترجمہ میں نے دلچسپی اور لطف سے کیا گیا ہے۔ محض پیسے کی خاطر کسی بھی ناول کا ترجمہ دل پر جبر کر کے نہیں کیا۔ ایسے ترجمے یا کام کو بھی 'سر پڑے کا' کہا جاتا ہے۔ ایسا ترجمہ رتی برابر کامیاب اور دلچسپ نہیں ہوتا۔ مجھے اپنے سارے ہی ناول پسند ہیں۔

ن ظ: آپ نے خود بھی کئی طبع زاد ناول لکھے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے 'عالم گم گشتہ' آپ کی اپنی تخلیق تھی۔ اس بارے میں کچھ بتایئے۔

مظہر الحق علوی: عالم گم گشتہ میری تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ یہ کانن ڈائل کے ناول 'دی لوسٹ ورلڈ' The Lost World سے ماخوذ ہے۔ یہ میرا دوسرا ناول ہے۔ اس وقت 'عذرا' اور 'عذرا کی واپسی' میرے زیر مطالعہ تھے۔ یہ ہیگرڈ کے ناول 'شی' She اور 'ریٹرن آف شی' Return of She کا باقاعدہ ترجمہ تھا۔ لیکن مترجم صاحب نے کرداروں کے نام ہندوستانی کر کے اسے اپنا بنا لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ لاؤ بھئی ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انگریزی ناول کا پلاٹ لے کر یہ ناول لکھا لیکن مجھے مزا نہیں آیا اور ضمیر نے بھی ملامت کی چنانچہ اس گناہ سے توبہ کر لی۔

ن ظ: اردو کے نئے مترجمین کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

مظہر الحق علوی: نئے اور پرانے مترجمین کو حالانکہ اب مترجمین ہیں ہی کہاں، یہی مشورہ ہے کہ ترجمہ کریں تو خلوص اور ایمانداری سے کریں۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

ن ظ: ان دنوں آپ کی علمی و ادبی مصروفیات کیا ہیں، اور کیا کوئی ایسی کتاب ہے جس کا ترجمہ کرنے کی آرزو رکھتے ہوں؟

مظہر الحق علوی: نصرت صاحب اس وقت میری عمر پچاسی (85) کی ہے۔ اس عمر میں عناصر میں اعتدال کہاں ہوتا ہے اور اعضا بھی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھنا لکھانا تو موقوف ہے۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ افسانہ لکھ لیا تو لکھ لیا۔ ورنہ لیٹے لیٹے ہمہ وقت کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ جی ہاں دو چار ناول ایسے ہیں جن کا ترجمہ کرنے کی آرزو تھی اور اب بھی ہے۔ ٹالسٹائی کا 'جنگ سے امن' اور وکٹر ہیوگو کا ناول 'ناٹرے ڈیم کا کبڑا' اس ناول کا ترجمہ 'گھر کی پکار' کے ناول کا ترجمہ شروع کیا تھا تین چار باب ترجمہ کر بھی چکا تھا کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ کئی دن ہسپتال میں گزارنے کے بعد گھر آیا تو 'سخت آرام کرو' کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مہینوں تک بستر پر رہا اور سارے ہی کاموں پر اوس پڑ گئی۔ یہ ناول ادھورا رہا۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ دو چار باب ترجمہ کیے پڑے ہیں۔

ن ظ: ایک ذاتی سا سوال۔ کیا آپ نے کبھی عشق کیا؟

مظہر الحق علوی: بھائی! یہ تو آپ نے بھری محفل میں راز کی بات پوچھ لی۔ عشق تو بھائی مجنوں، فرہاد اور رومیو وغیرہ نے کیا تھا۔ اب ایسا عشق کہاں۔ حسین صورت پسند آ گئی، اس سے آنکھ لڑی، بات چیت ہوئی، اس کے ساتھ گھومے پھرے، باغ میں بیٹھے، سنیما گئے، پھر وقت آنے پر وہ اپنے گھر کی ہو رہی، عاشق صاحب اپنے گھر آ گئے، دوسری تلاش کر لی۔ اس کو محبت کا غلط نام دے دیا۔ جوانی دیوانی کے دور میں ایسے واقعات ہر ایک کے ساتھ ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ساتھ ہوئے ہیں۔ رہا عشق تو وہ بھی ہم نے کیا ہے اور ٹوٹ کر کیا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ۔

ن ظ: فلم، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ میں اپنی دلچسپی یا عدم دلچسپی کے بارے میں بتائیں؟

مظہر الحق علوی: فلم اور موسیقی سے شروع سے دلچسپی تھی اب بھی ہے۔ جس زمانے میں فلمستان اسٹوڈیو میں منٹو، راجہ مہدی علی خاں اور اپندر ناتھ اشک تھے تو ہم بھی۔ یعنی میں وارث علوی اور محمد علوی بھی اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اشوک کمار وغیرہ سے میل ملاپ ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے 'یاد' نام کی فلمی کہانی لکھی تھی، محمد علوی نے اس کے گیت لکھے تھے یہ ایک سیمی اسٹنٹ semi stunt فلم تھی۔ جی ہاں۔ یہ کہانی فلمائی گئی تھی لیکن فلمی دنیا کی زبان میں ڈبے میں بند ہو گئی۔ یعنی ریلیز نہیں ہوئی آج تک۔ اب تو وہ اسٹوڈیو بھی نہیں رہا، نہ وہ لوگ رہے۔

ن ظ: گھر میں کون کون لوگ ہیں۔ شب و روز کی سرگرمیاں کیا ہیں؟

مظہر الحق علوی: بڑے صاحب زادے اعجاز حسین کا چار پانچ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب گھر میں ان کی بیوہ ہیں، چھوٹے صاحبزادے امتیاز احمد ہیں، ان کی بیگم فرزانہ بیگم ہیں دو پوتے اویس احمد اور ابرار احمد ہیں۔ امتیاز احمد باپ کے ورثے کو آگے بڑھا رہے ہیں ان کا ایک ترجمہ کردہ ناول 'بگولا' شائع ہو چکا ہے۔ ان دنوں فلمی کہانیاں اور اسکرین پلے لکھ رہے ہیں، دو ناولوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ کوئی اچھا پبلشر مل گیا تو یہ ناول بھی چھپ جائیں گے۔ بڑے پوتے اویس احمد انگریزی اور اردو میں شاعری کر رہے ہیں۔ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ابرار احمد اس عمر میں بھی اسلامیات کے اسکالر بن رہے ہیں بلکہ بن جائیں گے اور کیوں نہ ہوئی۔ ان کے دادا مظہر الحق علوی اور نانا وارث علوی ہیں۔ یعنی نجیب الطرفین ہیں دونوں۔

ن ظ: انٹرویو کے لیے وقت دینے کا شکریہ!

مظہر الحق علوی: جی آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔

◘

Nusrat Zaheer, C-280, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi, 110025

مظہر الحق علوی

اصل نام: محمد مظہر الحق علوی

پیدائش: 16 ستمبر 1926، احمد آباد

والد: غلام محی الدین جمیل شاعر تھے۔ دادا، امان اللہ مسکین بھی شاعر تھے اور داغ کے اہم عصر تھے۔

تعلیم: انجمن اسلام ہائی اسکول حیدر آباد

معاش: سینٹ زیویئرس کالج احمد آباد میں لائبریرین رہے۔

پہلی اشاعت: ایک افسانہ ہفتہ وار 'شاہد' بمبئی میں شائع ہوا۔

پہلی کتاب: 'گنج سلیمان' 1955 میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

دیگر تراجم: تار عنکبوت، جرم و سزا، ڈرا کیولا، ظل ہما، تیغ زن، خونریز، خانقاہ، شاہین سمندر، بھیڑیا، سونا سمندر، سورج کا لہو، گرد باد، غلاموں کے سوداگر، لالۂ صحرا، چاند اور چاندنی اور 'لاوا' سے لے کر آخری ناول 'دہشت' تک تقریباً ایک سو تراجم جن کے نام یاد نہیں اور جن میں بہت سے نایاب ہیں۔ یہ سبھی ناول نسیم انہونوی کے مطبع نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئے جس میں زبردست آتش زدگی کے سبب ناولوں کی ہزاروں جلدیں جل گئیں اب کچھ ناول ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے دوبارہ چھاپنا شروع کیے ہیں۔

اعزازات: (1) اتر پردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ
(2) گجرات گورو پرسکار
(3) مہاراشٹر کی ساہتیہ اکادمی سے ولی دکنی ایوارڈ
(4) دہلی اردو اکادمی سے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ

پتہ:
Syed Mazhar ul Haq Alvi, Bagh-e-Nishat, Khayaban, 17 Ameen Society, Vejal Road Po: Juhapura, Ahmedabad - 380055

حسین الحق

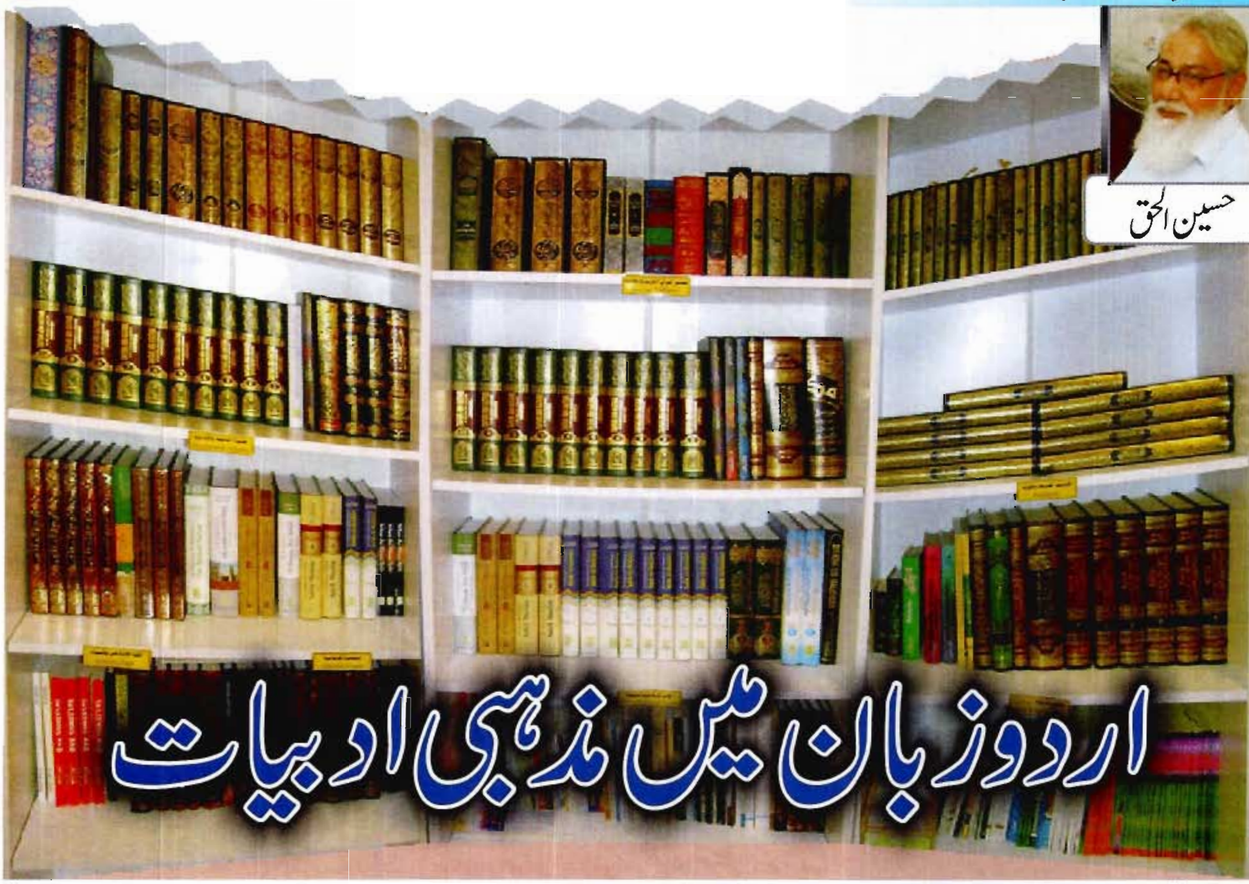

اردو زبان میں مذہبی ادبیات

زبان کسی مذہب یا ملت کی میراث نہیں ہوتی—

زبان ایک رواں دواں سمندر کی مثال ہے جس میں بہت سی ندیاں آکر ملتی ہیں۔اردو زبان بھی بعینہٖ اسی شاکلہ پر از خود تخلیق پاگئی، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان سے جس جس مذہب کے لوگ جڑے اس زبان نے ان تمام مذاہب کی ترجمانی کی ہر مذہب کی کم از کم دو واضح سطحیں ہوتی ہیں، ایک سطح قوانین و مراسم یا بہ الفاظ دگر ظاہر کی سطح ہوتی ہے جسے فقہ یا شریعت جو نام چاہیے دے لیجیے دوسری سطح منشائے مذہب ہدف مذہب روح مذہب یا بہ لفظ دگر داخل کی ہوتی ہے جسے تصوف یا مذہب کی جمالیات جو نام چاہیے دے لیجیے۔

اردو زبان کا کمال یہ ہے کہ اس نے مذہب کی شعریات (شریعت) اور جمالیات (تصوف) دونوں کا جامع ہونے کا ثبوت دیا۔یعنی جہاں ایک طرف نثر میں حضرت شاہ رفیع الدین اور نظم میں حضرت شاہ غلام مرتضیٰ جنوں سہسرامی سے ترجمہ قرآن اور تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع ہوا تو تادم تحریر درجنوں تراجم و تفاسیر کا ذخیرہ جمع ہو چکا۔مرزا حیرت دہلوی مولوی ڈپٹی نذیر احمد، سرسید، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا احمد رضا خاں، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابومحمد مصلح سہسرامی، مولانا وحیدالدین خاں، مولانا طاہرالقادری وغیرہ ایک طویل سلسلہ ہے یہ اسمائے گرامی تو مشتے نمونہ از خروارے کی مثل ہیں۔یہی صورت حال حدیث کی ہے حالانکہ برصغیر ہندو پاک میں حدیث کے فن پر محنت تو عہد سلطنت ہی سے شروع ہوگئی تھی مگر کتاب حدیث کا ذکر تو مشارق الانوار سے شروع ہوگا جو اپنی تکمیل کے بعد کئی سو سال تک عربی زبان میں حدیث کے نصاب کا حصہ رہی اس کا اردو ترجمہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوا اور اس کے بعد سے اردو میں احادیث کے فن پر بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ لگاتار جاری ہے۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت مولانا شاہ اسحٰق دہلوی، حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی وغیرہ نے علم حدیث پر لگاتار کام کیا اور حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد علامہ وحیدالزماں نے حدیث کی زیادہ تر کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا آج صحیح بخاری مسلم، ترمذی اور موطا امام مالک وغیرہ کے جو اردو ترجمے نظر آتے ہیں۔یہ علامہ وحیدالزماں کی محنت و عقیدت کا نتیجہ ہیں بعد میں سنن ابی داؤد، مشکوٰۃ شریف، ابن ماجہ نسائی وغیرہ کے اردو ترجمے بھی منظر عام پر آئے۔خصوصاً دیوبند، فرنگی محل بریلی اور مبارک پور کے علما نے بڑے کارنامے انجام دیے۔علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شوق نیموی مولانا تقی عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا شاہ سلیمان اشرف، مولانا منظور نعمانی (معارف الحدیث) ڈاکٹر خالد علوی، مولانا بدر عالم (ترجمان السنۃ) اور مباحث فی علوم الحدیث کا اردو ترجمہ (ڈاکٹر صبحی صالح) بھی علم حدیث کے اردو ذخیرے میں قابل قدر اسمائے گرامی اور تصنیفات ہیں۔

کچھ ایسا ہی خوب صورت منظر مطالعہ سیرت کے محاذ پر بھی دامن کش دیدہ و دل ہے۔سرسید اور مرزا حیرت دہلوی سے مطالعہ سیرت کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی کتاب الرحیق المختوم کے اردو ترجمہ تک پہنچ کر گویا ایک کہکشاں بنا تا نظر آتا ہے جس میں سب سے روشن اور مکمل حیثیت تو علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب سیرت النبی اور رسالہ نقوش (مدیر محمد طفیل) کے رسول نمبر کو ہی حاصل ہے مگر ان دو ضخیم اور عظیم الشان کاموں کے علاوہ بھی مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ اللعالمین مولوی

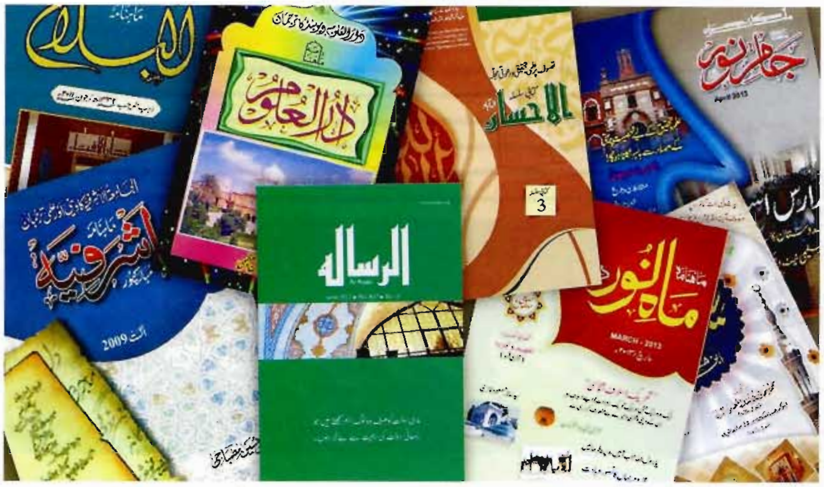

فیروز الدین کی سیرت النبی پروفیسر سید نواب علی کی سیرت رسول اللہ، ڈاکٹر حمیداللہ کی سیرت پر لکھی کتابوں کے اردو تراجم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب سیرت سرور عالم، مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات داناپوری کی کتاب اصح السیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی کتاب سیرت المصطفیٰ، مولانا عبدالماجد دریابادی کے سیرت پر خطبات، مولانا عبدالعزیز عرفی کی کتاب جمال مصطفیٰ، نعیم صدیقی کی کتاب محسن انسانیت، بریگیڈیر گلزار احمد کی کتاب غزوات نبویؐ، مولانا وحیدالدین خاں کی کتاب پیغمبر انقلاب، ڈاکٹر خالد علوی کی کتاب انسان کامل، مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب النبی الخاتم، مولانا اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب، جی ایس دارا کی رسول عربی، سوامی لکشمن پرشاد کی عرب کا چاند، چودھری افضل حق کی کتاب محبوب خدا، حضور اکرم کے مکتوبات پر مبنی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی کتاب بلاغ المبین، مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول جویائے حق اور صادق سردھنوی کا ناول آفتاب عالم، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب 'پیغمبر اعظم و آخر، پیر کرم علی شاہ کی کتاب ضیاء النبی، سید ایوب احمد شاہجہاں پوری کی کتاب آفتاب نبوت، مولانا راشد الخیری کی کتاب آمنہ کا لعل، ملا واحدی کی کتاب سرور کائنات، مولانا ماہر القادری کی کتاب در یتیم، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب نبی رحمت وغیرہ اس کہکشاں کے چاند ستارے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں صرف اردو مصنفین کا ذکر کیا گیا۔ مگر قدیم عربی کتابوں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن اسحٰق، طبقات، ابن سعد، المغازی، سیرت حلبیہ اور تاریخ ابن کثیر وغیرہ کے جو اردو تراجم ہوئے ہیں وہ بھی اردو زبان میں مذہبی ادبیات کے فروغ کا ایک سبب ہیں۔

مطالعہ سیرت کے باب میں اردو رسائل کی خدمات بھی اہم اور ناقابل فراموش ہیں نقوش (پاکستان) نے تو سولہ جلدوں میں رسول نمبر نکال کر گویا کہ حتی الامکان سارا فرض ادا کرنے اور قرض چکانے کی کوشش کی مگر ہندوستان میں بھی معارف (اعظم گڑھ) المجیب (پھلواری شریف)، جام نور (دہلی)، الرسالہ (دہلی)، اشرفیہ (الہ آباد)، تزکیہ (اعظم گڑھ) تذکیر (غازی پور) دارالعلوم (دیوبند) الاحسان اور خضر راہ سید سراداں (الہ آباد) اور کل سے آج تک نکلنے والے درجنوں مذہبی اور علمی رسائل میں سیرت نبوی پر جو ہزاروں تحریریں بکھری پڑی ہیں ان کو اگر موضوعات کے حساب سے یکجا کیا جائے تو مزید پچاسوں کتابیں منظر عام پر آسکتی ہیں۔

قرآن، حدیث، سیرت اور فقہ کے علاوہ تصوف کو بھی مذہبی ادبیات میں شامل کیا جاتا ہے۔ میں مجموعی طور اس طرز فکر سے اختلاف نہیں کرتا مگر یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تصوف مذہب کی جمالیات ہونے کے باوجود اپنے آپ میں کافی وسعت رکھتا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ہشت پہل ہیرا جو کئی اطراف سے چمکتا ہے۔

البتہ فقہ پر اردو میں جتنا کام ہونا چاہیے، اتنا نہیں ہوا۔ فقہ حنفی کی کتابوں مثلاً جامع کبیر، مبسوط یا کتاب الاصل، زیادات، سیر کبیر اور سیر صغیر جو فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں مانی جاتی ہیں، ان کا ترجمہ بھی میری نظر سے گزرا۔ یاد آتا ہے کہ قدوری ہدایہ اور شرح وقایہ کا اردو ترجمہ زمانہ طالب علمی میں دیکھا تھا۔ موطا امام مالک ہی اگر ترجمہ کرکے عام کردی جاتی تو وہ مطالعہ حدیث اور مطالعہ فقہ دونوں مطالعات میں معاون ہوتی۔ اسی طرح فقہ شافعی کی کتاب الام اور فقہ حنفی میں المختصر فی الفقہ اور العمدۃ فی الفقہ الحنفی کے ترجمے کی بھی ضرورت ہے۔ فی زمانہ اردو میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب آسان فقہ، مولانا مجیب اللہ ندوی کی اسلامی فقہ اور مولانا محمد یوسف اصلاحی کی مختصر کتاب، آسان فقہ کے علاوہ اور کوئی کتاب باضابطہ فقہ پر نظر نہیں آتی۔ البتہ مختلف مسالک کے فتاویٰ ضرور دستیاب ہیں مگر ظاہر ہے کہ فتویٰ علم الفقہ کا بدل نہیں ہے۔ یہ فقہ پر عمل کا ایک نمونہ ہے خود فقہ نہیں ہے۔

قرآن، حدیث، سیرت اور فقہ کے علاوہ تصوف کو بھی مذہبی ادبیات میں شامل کیا جاتا ہے۔ میں مجموعی طور پر اس طرز فکر سے اختلاف نہیں کرتا مگر یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تصوف مذہب کی جمالیات ہونے کے باوجود اپنے آپ میں کافی وسعت رکھتا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ہشت پہل ہیرا جو کئی اطراف سے چمکتا ہے۔

تصوف کا ایک بڑا پہلو یقیناً اخلاص نیت سے متعلق ہے اور اس طرح خشوع وخضوع فی العبادت اس کا بڑا مقصد ہے اس لحاظ سے بلاشک و شبہ تصوف کا تعلق مذہب سے جڑتا ہے اور مضبوطی سے جڑتا ہے لیکن (1) فلسفہ (2) علم کلام (3) شاعری (4) الہام و وجدان (5) توجہ الی اللہ کی خاطر مختلف طرق اور شعائر کی تعلیم (6) ملفوظات میں روایت قصص کا نظام (7) اور دعوت کے مراحل میں کلمہ سواء کا ترجیحی درجہ وغیرہ کچھ ایسے نکات ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب اس فیکلٹی کو اس کے بڑے تناظر میں دیکھتے ہیں تو نتیجہ کچھ مختلف نکلتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ (1) تصوف مذہبی ادبیات کے ذکر کا بھی ایک حصہ ہے (2) شاعری کا بھی ایک حصہ ہے (3) فلسفے کا بھی ایک حصہ ہے (4) اخلاقیات کا بھی ایک حصہ ہے (5) سریات کا بھی ایک ہے (6) اور دنیا کے ہر الہامی اور غیر الہامی خیر سے بھی وہ جڑا ہوا ہے۔

اس لیے تصوف میں پائے جانے والے مذہبی ادبیات پر گفتگو پھر کبھی—!!

■

Husainul Haque, Sir Syed Colony, New Karim Gunj, Gaya - 823001 (Bihar)

نوشاد عالم

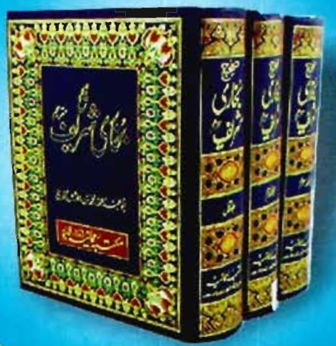

مذہبی لٹریچر اور اردو

اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کرۂ ارض پر اردو کا مولد و مسکن وہ ہندوستان ہے جو زبانوں اور مذاہب کا 'عجائب گھر' ہے۔ یہاں کچھ کوس پر مذاہب، فرقے، مسالک اور زبانیں بدل جاتی ہیں۔ اس پس منظر میں اردو کا کمال یہ ہے کہ اس نے روز اول سے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ عوام کے رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے صوفیائے کرام نے اس کو ذریعۂ اظہار و ترسیل بنایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 'اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' میں مختلف صوفیا کے اقوال، ملفوظات اور فرمودات پیش کیے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ اردو نے مذہبی تعلیمات و ارشادات کو اپنے لیے ضرر رساں نہیں سمجھا بلکہ عین سعادت خیال کیا۔

اس لیے ہمیں اردو میں مختلف مذاہب کا لٹریچر کثیر تعداد میں ملتا ہے پھر ان میں ملکی و غیر ملکی مذاہب کی بھی کوئی قید نہیں۔ دنیا کے تقریباً تمام بڑے مذاہب کا سرمایہ اس نومولود زبان کے خزانے میں موجود ہے جن کی موجودگی اس کے لیے باعث افتخار ہے۔ عیسائیت، اسلام، ہندو مذہب، جین مذہب، سکھ مذہب وغیرہ وہ تمام مذاہب ہیں جن کا لٹریچر کثرت سے اردو میں دستیاب ہے۔ اس مختصر مضمون میں صرف بڑے مذاہب کے انتہائی اہم مقدس صحائف اور کتب کا ایک سرسری جائزہ لینا مقصود ہے۔

مذہب اسلام کے لٹریچر میں قرآن کی حیثیت بالکل نمایاں ہے۔ قرآن وہ مقدس کتاب ہے جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا اور پوری دنیا کے لیے روشنی اور ہدایت کا سرچشمہ بنا کر بھیجا جس سے تا قیامت انسانی زندگی مستفیض ہوتی رہے گی۔ اردو زبان میں قرآن کے تراجم اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار ریسرچ کا اچھا خاصا موضوع ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان تراجم کا دائرہ منثور و منظوم، مکمل و جزوی اور لفظی و معنوی کی مختلف جہتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کچھ مشہور و معروف اور ممتاز مترجمین قرآن مجید کے نام یہ ہیں۔ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا شاہ عبد القادر دہلوی، سر سید احمد خاں، مولانا ثناء اللہ امرتسری، نواب صدیق حسن خاں، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، مولوی (ڈپٹی) نذیر احمد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا محمد بن ابراہیم جونا گڑھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ۔ قرآن کے ترجمے کے علاوہ اس کی تفسیریں بھی کافی تعداد میں لکھی گئی ہیں جیسے تفسیر ابن کثیر، کشاف، مدارک التنزیل، آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن'، مولانا عبدالماجد دریا بادی کی القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کریم کے تراجم میں منظوم ترجموں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے حالانکہ 'علما قرآن کا ترجمہ نظم کی شکل میں مستحسن نہیں سمجھتے کیونکہ ترجمے کی غلطی کا خطرہ تو نثر میں بھی رہتا ہے لیکن ایجاز و اختصار اور بحور و اوزان کی پابندیوں کے بعد تو غلطیوں کا خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔''

'زاد الآخرت' قرآن کریم کا منظوم ترجمہ ہے جو 1828 میں منظر عام پر آیا۔ مترجم شاعر مولوی عبدالسلام سلام بدایونی ہیں۔ یہ ترجمہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آغا شاعر قزلباش کا منظوم ترجمہ 'افصح الکلام' کے نام سے مشہور ہے۔ 'نظم المعانی ترجمہ کلام ربانی، مطیع الرحمان خادم کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ ترجمہ کافی عمدہ ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے بھی قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ مجید الدین احمد اثر زبیری کا 'سحر البیان' قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ ہے جو پارہ اول، دوم اور تیسویں پارے پر مشتمل ہے وغیرہ وغیرہ۔

بھگوت گیتا:

ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتابوں میں بھگوت گیتا اپنی اعلی تعلیمات و مقبولیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام مہذب زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو نظم و نثر دونوں ہی میں اس کے تراجم ہوئے ہیں۔ کچھ ترجمے تو مسلم مصنّفین نے کیے ہیں اتفاق سے دونوں ہی منظوم ترجمے ہیں۔ ایک خواجہ دل محمد کا ترجمہ جو 'دل کی گیتا' کے عنوان سے اور دوسرا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ترجمہ ہے۔

کئی ہندوؤں نے اس کے منظوم ترجمے کیے ہیں۔ پنڈت دینا ناتھ مدن نے 'مخزن اسرار' کے نام سے گیتا کا ترجمہ کیا جو 1921 میں رام نرائن پریس متھرا سے اشاعت پزیر ہوا۔ دوسرا منظوم ترجمہ پنڈت پربھو دیال مصر عاشق لکھنوی نے 'غذائے روح' کے عنوان سے کیا۔ ایک دیگر منظوم گیتا کا ترجمہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے 'نسیم عرفان' کے نام سے کیا۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی گیتا کے متعدد اردو ترجمے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اردو نثر میں دس سے اوپر گیتا کے تراجم دستیاب ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ منشی کنھیا لال عرف الکھ دھاری کا ترجمہ 'گیان پرکاش' کے عنوان سے ملتا ہے جو پہلی بار 1863 میں گیان پریس اکبر آباد سے چھپا تھا۔ منشی شیام سندر لال بھگوت گیتا مع اردو ترجمہ جس میں متن کے ساتھ ترجمہ اور اس کی شرح بھی مندرج ہے۔ منشی دیبی پرشاد کا ترجمہ بھگوت گیتا، منشی جی نے ترجمے کے ساتھ ایک کام اور کیا کہ ہر باب کے شروع میں اس کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

مشرق کے رزمیوں کی بات ہو یا ادب عالیہ کی اس میں مہابھارت اور رامائن کا نام ذہن کے پردے پر عکس ریز ہو ہی جاتا ہے۔ ایک ہندو کی زندگی میں یہ دونوں ہی مقدس صحیفے اس کی عملی و جذباتی زندگی کی تکمیل کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ اردو میں ان دونوں کے متعدد منظوم و منثور ترجمے ہوئے ہیں۔

رامائن کا پہلا ترجمہ غالباً 1866 میں چھپا۔ اس ترجمے کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے سولھویں خطبے میں کیا ہے۔ منشی شنکر دیال فرحت نے رامائن منظوم کے نام سے کیا۔ رامائن کے منظوم ترجموں میں سب سے قدیم یہی ترجمہ ہے۔ محمد عزیز نے اپنی کتاب 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ' میں اس سلسلے میں ایک بیش قیمت معلومات بہم پہنچائی کہ یہ مکمل ترجمہ نہیں ہے بلکہ تلخیص ہے۔ دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے رامائن کا ترجمہ 'مکمل رامائن بال میکی' 1921 میں کیا۔ 'رامائن بہار' بانکے بہاری لال بہار نے 1886 میں کیا تھا یہ ترجمہ نہیں بلکہ اردو نظم میں اس کا خلاصہ ہے۔ منشی سورج نرائن مہر دہلوی کا ترجمہ بعنوان 'رامائن مہر' وغیرہ۔

حق و باطل کے درمیان کشمکش کو ادبی اظہار کے ساتھ پیش کرنے والے مہابیانیہ مہابھارت کے بھی مختلف اردو تراجم دستیاب ہیں جن میں چند یہ ہیں۔ بابو جوالا پرشاد بھارگو مخزن مہابھارت مع اردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ متن کے ساتھ چار جلدوں میں ملتا ہے۔ مترجم سری رام کایستھ ماتھر دہلوی سری رام کرت مہابھارت جس کا پہلا ایڈیشن 1895 میں شائع ہوا تھا۔ طوطا رام شایاں کا مہابھارت منظوم پانچویں بار نول کشور کانپور سے 1893 میں منظر عام پر آیا۔ آخر الذکر ترجمہ اپنی شعری خصوصیات اور اختصار و ایجاز کی وجہ سے توجہ کا مرکز بنا رہا۔

منوسمرتی کے چار تراجم اردو میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ سنسکرت متن کے ساتھ پیش کیا گیا سوامی دیال کا ترجمہ 'منوسمرتی'، مطبع نول کشور لکھنو سے 1889 میں چھپا۔ کرپا رام شرما جگرانوی کا ترجمہ 'منوسمرتی' اس میں مع متن کے جگہ جگہ حاشیہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے ترجمہ رواں اور شستہ ہے۔ 'منوسمرتی' مترجم ماسٹر آتما رام۔ علاوہ ازیں ویدوں، اپنشدوں، پوران سے متعلق بھی کتابیں اور ان کی تفسیریں بھی اردو میں موجود ہیں اور ہندو مذہب کے دیگر اصلاحی فرقوں کبیر پنتھ، برھمو سماج، آریا سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، رادھا سوامی مت اور دیوسماج کے لٹریچر کا خاصا ذخیرہ بھی اردو کی زینت ہے۔

عیسائی مذہبی لٹریچر:

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غیر اسلامی مذاہب میں سب سے زیادہ مسیحی مبلغین نے اپنی کتابیں اردو میں ترجمہ و تالیف کر کے شائع کی ہیں۔ اردو زبان میں توریت و انجیل کے ابتدائی تراجم اور شرحوں کی تفصیل کے لیے گریرسن کی مشہور کتاب 'Linguistic Survey of India' 'ہندوستان کا لسانی جائزہ' کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں مصنف نے ابتدائی تراجم کی فہرست دی ہے۔ ذیل میں کچھ تراجم بطور مثال پیش کیے جا رہے ہیں۔

ترجمہ کتاب دانیال 1848، یسوع مسیح کے 'نئے عہد نامہ کا ترجمہ' ہندوستانی زبان میں مرزا فرحت اور فورٹ ولیم کالج کے دوسرے فضلا کا کیا ہوا۔ سہرام پور کے مشنریوں کے 'ترجمہ انجیل ہندوستانی'، انجیل کا ترجمہ یونانی سے ہندوستانی میں 1814 میں شائع ہوا۔ کتاب القدس، جلد اول (پیدائش سے آسترتک) 1842، کتاب القدس (جلد دوم) ایوب سے ملا کی تک) 1843، کتاب عہد جدید یعنی خداوند یسوع مسیح کی انجیل یونانی زبان سے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کی گئی۔ زبور کی کتاب اس کا ترجمہ عربی زبان سے اردو میں کیا گیا، پرانا عہد نامہ، (ناقص نسخہ ہے)۔ مسیحی مطبوعات میں ایک قدیم تصنیف 'صلوت الجماعت کی کتاب' ہے جو 1828 میں چرچ مشن پریس کلکتہ سے چھپ کر منصۂ شہود پر آئی۔ اس کتاب میں عقائد کے علاوہ کلیسا کے رسوم و دستور، صبح و شام کی نماز کے احکام اور مختلف اوقات کی دعائیں درج ہیں۔

مسیحی مبلغین نے بائبل اور اس کے مختلف اجزا کے ترجموں کے علاوہ ان کی تفسیریں بھی اردو زبان میں کثرت سے لکھیں ہیں۔ ان میں سے تقریباً (19) تفاسیر کو دیکھنے کا موقع ملا لیکن جن کا ذکر طوالت کے خوف سے نہیں کیا جا رہا ہے۔

جین مذہب

کو ہندو مذہب کا ہی ایک فرقہ تصور کیا جاتا تھا لیکن اب یہ محقق ہے کہ جین مذہب اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ بدھ مذہب۔ جین مذہب کے مبلغین و مرشدین نے بھی اشاعت مذہب کی غرض سے متعدد کتابیں لکھیں۔ اردو میں ان کی کل تعداد لگ بھگ 26 ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(1) **جین مت سار:** مولفہ لالہ سمیر چند جین سال اشاعت 1938 جین مذہب کی حقیقت کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے۔

(2) **سناتن جین درشن پرکاش:** مؤلفہ لالہ سوہن لال جینی سال اشاعت 1902۔ کتاب میں جین مذہب کی تعلیمات سوال و جواب کے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔

(3) **جین رتن مالا:** مؤلفہ لالہ کیوڑا مل، جین دھرم پرچارک سبھا، راولپنڈی 1903

(4) **جین کرم فلاسفی:** مؤلفہ بابو رکھب داس جین، دلی پرنٹنگ پریس دہلی 1924

(5) 'جین تتو درپن' کی شری سوامی رتن چند نے ترتیب و

تالیف کی اور بلالی اسٹیم پریس، ساڈھوواڑہ ضلع انبالہ سے 1917 میں شائع کرایا۔ 'جین تتو درپن' میں جین مذہب کے اصول وضاحت وصراحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ جین مذہب کی تصنیفات سے متعلق مزید معلومات کے لیے محمد عزیز کی کتاب 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

سکھ مذہب:

سکھ مذہب کے بانی گرونانک کا مقصد بھی ان کے پیش رو ہندو مذہب کے مصلحین و مبلغین کی طرح یہ تھا کہ ہندو مذہب، بالخصوص شمالی ہند کے ویشنو فرقے سے ذات پات کی تفریق، توہمات اور بت پرستی کو دور کریں تاہم یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے براہ راست ذات پات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ ہر طبقے کے آدمیوں کو اپنے اتباع کی دعوت دی اور بتایا کہ خدا ذاتوں کا لحاظ نہیں کرتا۔'' اس مذہب میں دس گرو ہوئے جن کے اسما یہ ہیں گرونانک، گرو انگد، امرداس، رام داس، ارجن، ہرگوبند، ہر رائے، کرشن، تیغ بہادر اور گوبند سنگھ۔ مجموعی طور پر سکھ مذہب کی اردو میں 25 کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں چند یہ ہیں۔

(1) سری آدگرنتھ، اس میں اول اصل اشلوک فارسی خط میں پھر اس کی تشریح اردو زبان میں۔ اس کے مصنف منشی برج لعل ہیں کتاب پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔

(2) 'عطر روحانی' ترجمہ جپ جی صاحب سردار عطر سنگھ مطبوعہ گیان پریس گوجرانوالہ سنہ 1874

(3) جپ پرمارتھ مطبوعہ گیان پریس گوجرانوالہ بقول محمد عزیز ''ترجمہ بہت پرانا معلوم ہوتا ہے اور اس پر مترجم اور سنہ طباعت دونوں ہی ندارد ہیں۔ متن کی ہر سطر کے نیچے اردو ترجمہ لکھا گیا ہے''۔

(4) 'پوتھی پنج گرنتھی' ترجمہ وشرح از بھائی دیارام عاکف مترجم جنم ساکھی اردو۔

(5) 'دھرم وچار' جواہر سنگھ کپور مطبع اسلامی، لاہور 1889، یہ سکھ مذہب کی تعلیمات پر ایک لکچر ہے۔

بہائی مذہب کی مذہبی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔ 'نئے دن کا طلوع' میں امر بہائی کے خلاصے کے ساتھ ساتھ بہاء اللہ اور عبدالبہا کے اقوال ہیں۔ اس میں نصیحت اور حکمت کی باتیں ہیں اور بہاء اللہ کے مظہر الوہیت اور حامل نبوت ہونے کا بیان ہے۔

دوسری کتاب 'باب الحیات' یعنی ترجمہ مقالہ سیاح۔ محمد عزیز اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں ''ایک ایرانی سیاح نے حضرت بہاء اللہ اور حضرت باب عزاسمہما کے حالات زندگی اور فرقۂ بہائیہ کے مختصر واقعات اور تعلیمات کے متعلق فارسی زبان میں لکھا ہے اور جس کا ترجمہ جناب سید مصطفیٰ صاحب رومی نے اردو میں کیا'' یہ کتاب انجمن بہائیہ رنگون مطبوعہ نول کشور پریس، لاہور سے 1908 میں چھپی ہے۔

'لوح ابن ذئب' 'از کتب مقدسہ حضرت بہاء اللہ اردو ترجمہ۔ الواح کے نام سے حضرت بہاء اللہ نے متعدد رسالے قلمبند کیے ہیں جو بہائیوں کے نزدیک الہامی صحیفے ہیں۔

'کتاب ایقان' میں حضرت بہاء اللہ نے توریت، انجیل اور قرآن کی بعض آیات کی تفسیر وتشریح اپنے نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور اصول ادیان کی وحدت اور نزول کتب کی علت بیان کی ہے۔

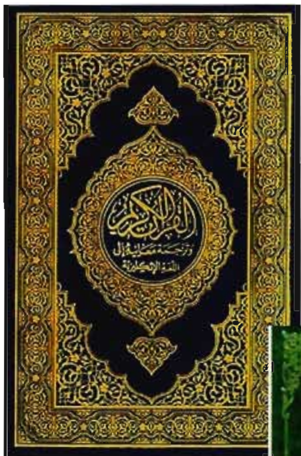

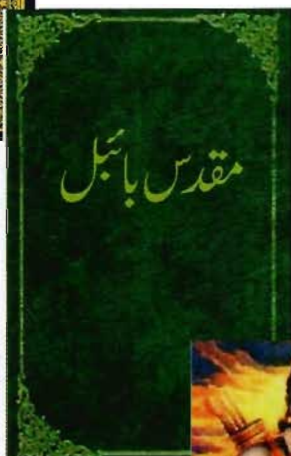

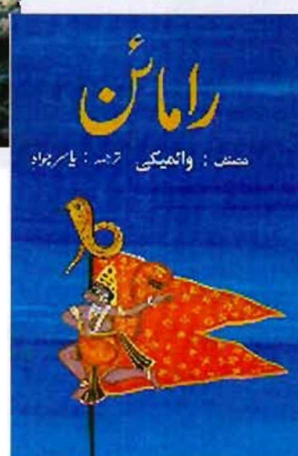

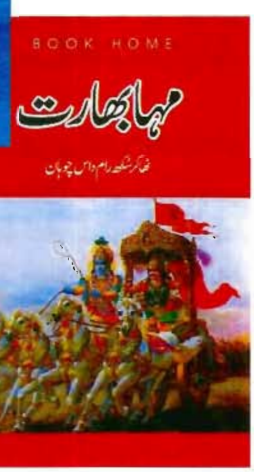

قصہ مختصر یہ کہ مذکورہ بالا سرسری جائزے سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مذہبی لٹریچر اور اردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو نے اپنے تشکیلی دور سے لے کر زبان کی بلندی حاصل کرنے تک ہر دور میں ترسیل موثر ذریعہ رہی ہے جس کی وجہ سے مبلغین نے اسے اختیار کیا۔ کسی بھی زبان میں مذہبی لٹریچر کی کثرت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ وہ زبان اپنے عہد کی مقبول زبان ہے جس کی رسائی ہر خاص و عام تک ہے۔ اور شاید اسی لیے مصلحین و مبلغین ایسی زبان کا انتخاب کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ عوام کے دلوں تک رسائی حاصل کرکے رشد و ہدایت کی بات ان تک پہنچا سکیں۔

امدادی کتب:

(1) 'اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ'، محمد عزیز، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سن اشاعت 1989 اشاعت دوم

(2) 'قرآن حکیم کے اردو تراجم' ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، شرف الدین الکتب واولادہ، محمد علی روڈ بمبئی سن اشاعت، 1984

(3) 'اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'، مولوی عبدالحق، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

(4) 'دنیا کے عظیم مذاہب' سید حسن ریاض

pdfbooksfree.blogspot.com

■

Dr. Naushad Alam, Academy Baraye Istedad Urdu Medium Asataza, Jamia Millia Islamia New Delhi-110025

حبیب نثار

اردو میں سورداس کی رامائن و بھگوت گیتا

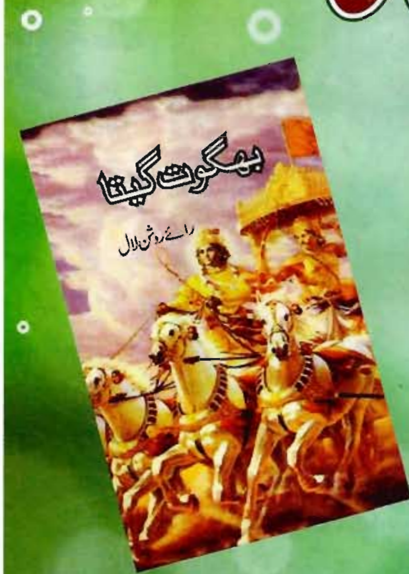

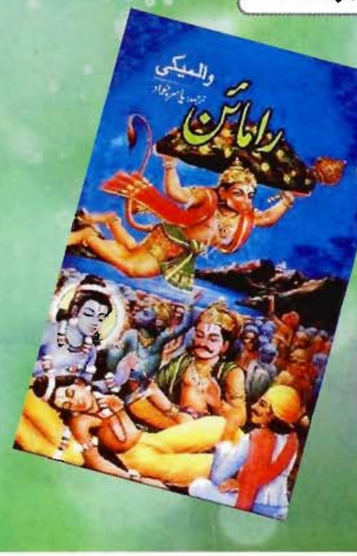

(تعارف مخطوطہ)

سورداس ہندوستانی تہذیب کا ایک ممتاز اور متبرک نام ہے۔ سورداس کو عموماً ہندی/ برج کا شاعر اور بھجن و پدنویس سمجھا جاتا ہے۔ سورداس کے بھجن آج بھی مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے گرو ولبھ آچاریہ کے آگے بھگوت گیتا شروع سے آخر تک گا کر سنایا کرتے تھے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ سورداس اپنے گرو کے آگے رامائن بھی سنایا کرتے تھے۔ جسے خود انھوں نے راگ/ راگنی کے تحت موزوں و ترتیب دیا تھا۔ حالانکہ تاریخ ادب اردو اور تاریخ ادب ہندی کی کسی تصنیف میں موسیقی کے راگ/ راگنی کے تحت رامائن کے لکھے جانے کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ بھگوت گیتا ہی کے سلسلے میں اندراجات ملتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سورداس نے نہ صرف بھگوت گیتا کو اپنے بھجنوں کے پیکر میں ڈھالا ہے بلکہ رامائن کو بھی گل نغمہ کا نقش عطا کیا ہے۔

راقم الحروف کے اس خیال کا ماخذ ایک مخطوطہ ہے جس میں رامائن اور بھگوت گیتا کے تمام واقعات، کردار اور فلسفۂ حیات کو راگ/ راگنی کے تحت بطور بھجن لکھا گیا ہے۔ مخطوطہ پر 'راگ بلاول' کا عنوان لکھا ہے۔ یہ نایاب مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ کے شعبۂ مخطوطات کی زینت ہے جس کو فن موسیقی کے ضمن میں پہلے ہی نمبر پر درج کیا گیا ہے۔

'راگ بلاول' دراصل رامائن اور بھگوت گیتا کا مجموعہ ہے جس کو راگ/ راگنی کے تحت بھجن کی صنفِ نغمہ میں سورداس نے موزوں کیا ہے۔ یہ مخطوطہ جملہ 262 اوراق یعنی 524 صفحات پر مشتمل ہے۔ خط شکستہ نستعلیق ہے۔ کاغذ دیسی ہے۔ ہر صفحے پر تقریباً انیس سطریں ہیں بعض صفحات پر سطور کی تعداد کہیں کم اور کہیں زیادہ بھی ملتی ہے۔ اس مخطوطے میں تقریباً چھ سو سے آٹھ سو گیت موجود ہیں۔ گیتوں کی صحیح تعداد اس لیے نہیں بتائی جاسکتی کہ مخطوطہ ناقص الاوسط ہے یعنی درمیانِ مخطوطہ کے چند صفحات ضائع ہوگئے ہیں۔(1) مخطوطہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

ہر ہر ہر
چرن کنول بندوں بھر ریا ہائے
جا کی کرپا پنگ گر لنگھیہ اندسی کون سب کچھ دریائے
بھراسنہ گنگ پن لولہ امک چلے سر چھتر دھرائے
سورداس سوامی کرنا میہ بار نار بندون تنہہ پائے

مخطوطہ زبان کے اعتبار سے گیارہویں صدی ہجری کا کہا جاسکتا ہے جیسا کہ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ کے مرتب جناب مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب نے بھی اظہار کیا ہے لیکن اس مخطوطے کی کتابت 23 شوال 1150 ہجری کو مکمل ہوئی ہے جو ترقیمے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ترقیمہ اور اس سے قبل کا گیت/ بھجن حسب ذیل ہے:

ہر ہر ہی سمرن کرو   ہر چند مار بند اور مین دھر
جنجر جب پایم راج   ایک بار تج سبھا براج
ترب کے حزینہ نبجے آیو   جگ چھاد ہربہ چست
سوت سونگی کہہ سمجھیو   سورداس تیوں ہر گنہ گار

(تمام شد 23 شوال 1150 ہجری)(2)

یہ تاریخ کاتب مخطوطہ ہی کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ تاریخ کتابت مخطوطہ ہی سے متعلق ہے۔ یہ تاریخ تصنیف نہیں ہوسکتی کہ سورداس گیارہویں صدی ہجری کے شاعر ہیں۔

راگ بلاول کے مخطوطے میں ورق 116 الف تک رامائن سے متعلق بھجن نقل کیے گئے ہیں۔ ہر بھجن کا عنوان سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ چند عنوانات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جس سے مخطوطہ کے نفس مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔

سری رام چندر اوتار برنن راگ کانڑا (3) (گنڈا راگ کانڑا) جانکی بجن راک مارو (4)، ہنون بجن جانکی پرت راک مارو (5)، چھمن مور چنا لورک راک سارنگ (6)، سیتا بجن سکھے پرت راک سارنک (7)، سری رام بجن جانکے پرت راک کوری (8)، (کنڈا گوری) راون جودہ چھمن موچنا راک مارو (9)

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ مخطوطہ کے ورق 116 الف پر رامائن ختم ہوجاتی ہے اور ورق 116 ب سے راگ بلاول، کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو دراصل

بھگوت گیتا کا بیان ہے۔ اس حصے میں سری کرشن کے بھجن جمع کیے گئے ہیں جو مضامین بھگوت گیتا پر مشتمل ہیں۔ چند عنوان ملاحظہ ہوں:

''دکھنم اوہیای سری کشن کے جنئے موہار برنن راک سارنگ'' (10) ''پوتنا بچن کنس مون راک دہنا سری (11)''

''سری کرشن کے برمس کا راک بلاول'' (12)

سورداس بنیادی طور پر کرشن بھگت تھے اور سری کرشن جی مہاراج کو وشنو کا اوتار سمجھا اور جانا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وشنو کا بھگت رام کی بھگتی ضرور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورداس نے جو کہ کرشن بھگت مشہور ہیں، اسی نسبت و بھگتی کی بنا پر رامائن بھی موزوں کی ہے۔

مخطوطہ میں موجود ہر بھجن میں شاعر کا تخلص موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''سورداس سوامی کرتا یہ مارنا'' (13)

''سورداس تیوں ہنس کہہ کایو (کذا گایو)(14)''

''سورداس ماچت تیسنی'' (15)

راگ بلاول کی زبان مخلوط ہے سنسکرت آمیز ہندی اردو اور فارسی سے مملو زبان ہے۔ مصنف فارسی سے بھی بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ قلم برداشتہ فارسی میں تعداد گیت لکھتا چلا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں میں فارسی کی گنتی کا بیان ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ''بست دھوم ادھیائے'' یا ''بست و چہارم ادھیائے'' زبان کے سلسلے میں ایک مثال مزید دیکھیے:

پیہ کی سنگ کہلت ادھیک سرم بھیواوری پامکو پیارے
اپنوں رنچر پی سکھوون سکھی ری او چر بدن سرم کہہ کے واری
نرتت اولت کیسٹی انگ بہوکتیں بھتری الک باندھو سنوار
سنہو سور پیہ پیارے کوملن جاہ نہ سہای تاہ وار دن وار (16)

یہاں اردو/ ہندی کے ساتھ ساتھ برج کا اثر بھی نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ سورداس نے یہاں سور پیا تخلص باندھا ہے جو غالباً اس مخطوطے کے پہلے کہیں اور، اس طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے اس مخطوطے کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں گزرا اور اس مخطوطے کا علم بھی اہل ادب کو غالباً نہیں ہے۔

سورداس ہندوستانی تہذیب کا ایک ممتاز اور متبرک نام ہے۔ سورداس کو عموماً ہندی/ برج کا شاعر اور بھجن و پدنویس سمجھا جاتا ہے۔ سورداس کے بھجن آج بھی مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے گرو ولبھ آچاریہ کے آگے بھگوت گیتا شروع سے آخر تک گا کر سنایا کرتے تھے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ سورداس اپنے گرو کے آگے رامائن بھی سنایا کرتے تھے۔ جسے خود انھوں نے راگ / راگنی کے تحت موزوں و ترتیب دیا تھا حالانکہ تاریخ ادب اردو اور تاریخ ادب ہندی کی کسی تصنیف میں موسیقی کے راگ /راگنی کے تحت رامائن کے لکھے جانے کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ بھگوت گیتا ہی کے سلسلے میں اندراجات ملتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سورداس نے نہ صرف بھگوت گیتا کو اپنے بھجنوں کے پیکر میں ڈھالا ہے بلکہ رامائن کو بھی گل نغمہ کا نقش عطا کیا ہے۔

الحاصل سورداس متخلص بہ سور پیا نے بھگوت گیتا کے ساتھ ساتھ رامائن منظوم بھی لکھی ہے جس کی زبان مخلوط ہے یعنی فارسی، سنسکرت، برج اور ہندی/اردو آمیز ہے لیکن رسم خط عربی/ فارسی ہی ہے۔ اسی لیے اس مخطوطہ کو اردو سے متعلق کہا جائے گا اور اس طرح یہ مخطوطہ کافی اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔

دورِ حاضر میں لسانیات اور رسم الخط کے جھگڑے میں یہ مخطوطہ مشعل راہ بنتا ہے اور اہل فکر ونظر کے لیے نئے افق مہیا کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو چند نکتے بے حد اہم معلوم ہوتے ہیں:

(1) بھکتی کال کرشن بھگت کوی/ شاعر سورداس مشترکہ زبان یعنی اردو کا استعمال کرنا ہے۔

(2) یہ زبان ذخیرہ الفاظ کی بنا پر اور رسم الخط کے لحاظ سے بھی اردو ہی کہی جائے گی۔

حوالے:

(1) مثلاً ورق 120 فل اور ورق 92ب کے بعد چند صفحات غائب ہیں۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ 'راگ بلاول' فن موسیقی مخزونہ سالار جنگ کتب خانہ، حیدرآباد

(2) راگ بلاول، ورق 262ب

(3) ایضاً، ورق 69الف

(4) ایضاً، 79الف۔

(5) ایضاً، 79ب۔

(6) ایضاً، 85ب۔

(7) ایضاً، ورق 91ب۔

(8) ایضاً ورق 93الف۔

(9) ایضاً، ورق 108ب۔

(10) ایضاً ورق 116ب۔

(11) ایضاً، ورق 130الف۔

(12) ایضاً، ورق 144ب۔

(13) ایضاً، ورق 172الف۔

(14) ایضاً، ورق 92الف۔

(15) ایضاً، ورق 180ب۔

(16) ایضاً، ورق ب تا ورق 197الف۔

بشکریہ: ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد، مدیر: مغنی تبسم، جلد 59، شمارہ 1,2,3، جنوری تا مارچ 1997

Dr. Habeeb Nissar Dept. of Urdu, University of Hyderabad, Central University, Gachchi Bowli, Hyderabad - 500046 (AP)

ناشر نقوی

اردو اور سکھ گرنتھ

دنیا کے نقشے پر ہندوستان ہی وہ واحد ملک ہے جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے شیر وشکر کی طرح ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے مذہب وعقیدے کا احترام بھی کرتے ہیں۔اسی انفرادیت کے سبب ہماری قومی پہچان کو گنگا جمنی تہذیب اور روایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لسانی سطح پر کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کے اسی ہندوستانی مزاج کو گزشتہ ایک ہزار برس کے دوران ہماری اردو زبان نے سب سے زیادہ فروغ دیا ہے۔اس کے واضح نقوش ہمیں پنجاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ پنجاب کی علاقائی زبان پنجابی ہے لیکن اردو کی بالا دستی یہاں ہمیشہ قائم رہی ہے۔آج بھی متحدہ پنجاب کا بڑا حصہ پنجابی کو اردو رسم الخط میں لکھتا اور پڑھتا ہے۔حقیقت تو یہ بھی ہے کہ پنجابی کے فروغ میں اردو نے ، اور اردو کے فروغ میں پنجابی نے ہر زمانے میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کیا ہے۔

متحدہ پنجاب ہندوستانی مذاہب کا بھی سر چشمہ رہا ہے۔رِگ وید،مہابھارت،رامائن اور گورو گرنتھ جیسے صحیفے بھی پنجاب ہی میں وجود پذیر ہوئے۔ان تمام دھارمک گرنتھوں کی زبان ہمارے قومی دریاؤں سے نکلی ہوئی زبان ہے۔اس زبان کو فی زمانہ کبھی ہندوی،کبھی ہندی،تو کبھی ریختہ کہا گیا۔یہ ہندوی، ہندی اور ریختہ لفظ ہی ہیں جو آج بھی اردو کا جزو لاینفک ہیں۔

سِکھوں کا مذہبی صحیفہ گورو گرنتھ صاحب پنجابی زبان کا اعتبار وافتخار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا بھی وقار ہے۔اس دھرم گرنتھ میں وہ پنجابی زبان شامل ہے جس کے پینسٹھ فیصد الفاظ اردو میں بھی رائج ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان الفاظ کو پنجابی لہجے کے ساتھ پڑھا اور بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرض داشت کو 'ارداس'، نماز کو 'نماج'، وضو کو 'اوجو'، پُل صراط کو 'پُسلات'، حضور کو 'حجور'، روز کو 'روج'، فانی کو پھانی، اولیاء کو 'اولئے'، بخشش کو 'بخشیش'، مشقت کو مسکت، گرہستی کو 'گرہا سیتی'، بے پرواہ کو 'وے پرواہ' اور کاغذ کو کاگد بولا جاتا ہے۔

گورو گرنتھ صاحب ہمارے قومی مذاہب میں وہ واحد دھرم گرنتھ ہے جس میں پنجابی ہندی سنسکرت عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ جا بجا ملتے ہیں اور ان مختلف زبانوں کی لفظیات زیادہ تر اردو کی شناخت ہیں، دوسری انفرادیت اس گرنتھ کی یہ ہے کہ اس میں ہر مذہب کے سنتوں، جوگیوں اور صوفیوں کا روحانی کلام شامل ہے۔اس گرنتھ میں سِکھ مذہب سے متعلق دس گوروؤں میں سے ابتدائی پانچ گورو بابا گورور نانک صاحب، گورو انگد دیو صاحب، گورو امر داس صاحب، گورو رام داس، گورو ارجن دیو صاحب اور نویں گورو تیغ بہادر کے کلام کے ساتھ ساتھ عظیم صوفی بزرگ بابا شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، سنت کبیر داس، سنت رام دیو کے علاوہ چودہ بھگتوں اور گیارہ بھٹوں کی بانی شامل ہے۔

گورو گرنتھ صاحب کا بنیادی موضوع وحدانیت اور حقانیت ہے، حق کی وحدت کے پرچار کے لیے جس نے بھی اور جہاں سے بھی عبد اور معبود کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے آواز بلند کی، اسے گورو گرنتھ صاحب نے دل سے لگایا۔ اگر اس صحیفے میں پنجاب کے گورو صاحبان اور بابا فریدؒ کے علاوہ بھگتوں، بھٹوں اور سیوکوں کا کلام شامل ہے تو اس میں اتر پردیش کے پانچ، مہاراشٹر کے چھ، راجستھان کے دو، بنگال کے دو، تو سندھ کے ایک سنت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس طرح چھتیس سنتوں کا کلام گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔پروفیسر گردیال سنگھ کے بقول: گورو گرنتھ صاحب میں بانی کی شمولیت اور ترتیب آدم ذات کی اشتراکیت اور اتحاد کی علامت ہے۔گورو گرنتھ صاحب کی ترتیب و تدوین پہلی بار جون 1604 میں پانچویں گورو ارجن دیو صاحب نے فرمائی تھی اور اسی سال امرتسر کے مقدس گولڈن ٹیمپل ہرمندر صاحب میں اس کا پرکاش عمل میں آیا تھا۔ یہ گرنتھ 1430 صفحات پر مشتمل ہے دوسری بار اس کی حتمی تدوین 1706 میں دسویں اور آخری گورو گوبند سنگھ صاحب نے فرمائی۔اور انھوں نے اپنے والد نویں گورو شری گورو تیغ بہادر صاحب کی بانی بھی اس میں شامل کردی۔

گورو گرنتھ صاحب میں جہاں اردو فارسی الفاظ کا تلفظ پنجابی لہجے کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے وہاں بڑی تعداد ان اردو الفاظ کی بھی ہے جو بعینہٖ صحیح تلفظ کے ساتھ ادا ہوتے ہیں۔مثلاً اللہ، خُدا، قدرت، شریعت، فرمان، حکم، شاہ، سلطان، صفت، قرآن، جماعت، سلامت، اداس، پاس، گاہ، راہ، سنگ، نہنگ، تفنگ، شمار، دربار، پیار، جوہر، جواہر، پادشاہ، شیخ، علم، در، دروازہ، زور، شور، کلام حرام، سال، وصال وغیرہ۔

سِکھ مذہب کی شناخت کے لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ اس میں جو ابتدائی لفظ ہیں وہ سارے کے سارے اردو کے ہیں مثلاً، عرضداشت کے لیے ارداس، سِکھ پرچم کے لیے نشان، عزت کے لیے صاحب، گورودوارہ کے لیے دربار صاحب، مذہب کے لیے خالصہ اور سِکھوں کے لیے سردار، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سِکھ مذہب کی دعا سے صدا تک اور دربار سے دستار تک اردو سِکھ مذہب اور گورو گرنتھ صاحب تک اردو لفظیات اٹوٹ حصہ ہیں۔ گورو نانک صاحب کا کلام جو گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے اُسے جپ جی صاحب کہا جاتا ہے۔ جس میں ایک ایک

سلُوک(شلوک)اور اڑتیس پوڑیاں جن میں دو سو سے زائد اردو الفاظ شامل ہیں مثال کے طور پر:

۔ سنیے شیخ پیر پادشاہ، سنیے اندے پاوہہ راہ
(پوڑی نمبر11)

۔ قدرت کون کہاں وچار، تو صدا سلامت نرانکار
(پوڑی نمبر19)

۔ جس نوں بخشیے صفت صالح، نانک پادشاہی پادشاہ
(پوڑی نمبر34)

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورو نانک صاحب فارسی اردو لفظیات سے بخوبی آشنا تھے۔ ان کے یہاں پروردگار، خالق، رب، درگاہ، قدرت، فرمان، حرام، حلال، جنت، دوزخ، بہشت، بہشتی، مسلم، ملا، قاضی، راضی، تیغ، دریغ، فتح جیسے الفاظ بار ہا استعمال ہوئے ہیں۔ گورو گرنتھ صاحب میں شامل ایسے مصرعے عام طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں:

۔ اول اللہ نور اُپایا، قدرت دے سب بندے
(کبیر)

۔ فریدا خالق خلق میں، خالق وسے رب مانہی
(بابا فرید)

۔ حکمی حکم چلائے راہ نانک وکسے بے پرواہ
(گورونانک)

۔ نانک ساعر ایہو کہت ہے سچے پروردگارا
(گورونانک)

۔ نانک دنیا کیسی ہوئی، سالک مت نہ رہیو کوئی
(گورونانک)

سیوک کی منشا پوئی بھئی، ست گورو سے نرل مت لئی
(گوردارجن دیو)

بکھیں سیو کا ہے رچیو منا نہ ہوئی اداس
(گورو تیغ بہادر)

ان مصرعوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سِکھ مذہب کے گورو صاحبان نے اپنی شاعری اور زندگی کا پیغام جہاں ہر قسم کی دوئی کو ختم کرنے کے لیے دیا وہاں اردو کی شیرینی اور اثر آفرینی کو بھی فروغ دیا۔ گورونانک صاحب نے پنجاب میں رائج زبانوں کی تشکیل میں بھی کلیدی رول ادا کیا۔ آپ ایک وسیع المشرب، مصلح قوم، اور شاعر رہے، اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے معاصر شعرا کی طرح نعت گوئی میں بھی حصہ لیا۔ آپ کی نعت کا مشہور شعر ہے:

م، محمد من تونی من کتاباں چار
من خدائے رسول نوں، سچاری دربار

گورو نانک صاحب کے کلام میں جس زبان اور جس اسلوب کے نمونے ملتے ہیں وہ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے کی زبان ہے۔ آپ کی شاعری کے انداز کی جھلک ولی دکنی تک کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے جنھیں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا گیا۔ بابا نانک کے کلام میں عربی و فارسی الفاظ اسی طرح ہندوی سانچے میں ڈھلے ہیں جس طرح امیر خسروؒ اور کبیر کے یہاں نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ اصلاحِ معاشرت کے پیشِ نظر وجود پذیر ہوئے ہیں۔ بابا نانک فرماتے ہیں:

حکم رضائی ساختی درگہہ سچ قبول
صاحب لیکھا منگیے دنیا دیکھ نہ بھول

بابا گورونانک روحانی شخصیت کے مالک اور ایک عوامی شاعر تھے ان کے زمانے میں جو عوامی زبان بن کے سامنے آ رہی تھی وہ آگے چل کر اردو کہلائی۔ اس بنیاد پر ہم گورونانک صاحب کو پندرہویں صدی عیسوی کا عظیم اردو شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ گورونانک صاحب نے اپنے زمانے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ممالک کے بھی دورے کیے۔ جن میں عرب، عراق اور ایران بھی شامل رہے۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''سری گورونانک عربی و فارسی سے بخوبی واقف تھے جہاں انھوں نے ہندوؤں کے تیرتھ استھانوں کی یاترا کی وہاں مسلمانوں کے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ وہ عراق ایران، مکہ اور مدینہ گئے جہاں خطبات دیے۔ انھوں نے اپنے سفر مکہ کے دوران ایک حاضر نامہ بیان کیا تھا اس کی ایک نقل گورو گوبند سنگھ کے ہاتھوں کی نوشتہ ہے۔''

یہ وہ ممالک ہیں کہ جہاں کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ گورونانک صاحب کے مراسم عرب اور عجم کے دانشوروں اور صوفیوں سے بھی رہے۔ ان دانشوروں اور صوفیوں کی زبانوں کا رسم الخط وہی رہا جو آج بھی اردو کا ہے اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گورونانک صاحب اور ان کے پیش رو بھی اردو تحریر سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔

گورو گرنتھ صاحب کے علاوہ سِکھ مذہب کی دوسری مقدس کتابوں میں گورو گوبند صاحب کی دسم گرنتھ اور ظفر نامہ ایسی تصنیفات ہیں جن میں اردو زبان اور شاعری کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گورو گوبند سنگھ صاحب نے سِکھ مذہب کو ایک نیا روپ دیا اور گورو گرنتھ صاحب کو دوبارہ ترتیب دے کر اس میں پانچ ہزار سات سو اکیاون بانیاں (اشعار) شامل کیں۔ آپ ایک عظیم فلسفی، شجاع اور دانشور ہونے کے ساتھ ایک عظیم شاعر بھی تھے، شاعری کے حوالے سے سِکھ مذہب کی تاریخ گواہ ہے کہ آپ کے دربار میں بیک وقت باون شاعر موجود تھے، جنھوں نے اس عہد میں سِکھ مذہب کو شاعرانہ مزاج میں ڈھالنے کے لیے گورو گوبند سنگھ صاحب کے دوش بدوش کام کیے۔ پروفیسر گوپال سنگھ اپنی کتاب گورو گوبند سنگھ میں لکھتے ہیں:

گورو کا فنِ سخن گوئی، پروازِ تخیل، لفظوں کا انتخاب اور عروض پر ان کی دسترس کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ ہندوستان کی شاعری میں ایسے کوئی شعری اوزان نہیں ہیں جنھیں اس پختہ کار استاد نے استعمال نہ کیا ہو۔ انھوں نے دوسو پچاس اوزانِ شعر استعمال کیے اور ہندوستانی شاعری میں ایسی کوئی کیفیت نہیں ہے جسے وہ اپنی گرفت میں نہ لائے ہوں۔''

گورو گوبند سنگھ صاحب کا ظفر نامہ ایک آفاقی ادب پارے کی حیثیت رکھتا ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

کمالِ کرامات قائم کریم
رضا بخش و رازق رہا کُن رحیم

ظفرنامہ اورنگ زیب کے نام گورو گوبند سنگھ کا منظوم مکتوب ہے۔ جو شاعری کے بھرپور رنگ و آہنگ کی مثال ہے۔ یہ نظم ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے جو اس دور کی اردو کا بہترین نمونہ اور اس زمانے کے ادب کا مدلل ثبوت فراہم کرتا ہے۔ گورو گوبند سنگھ صاحب کے مشہور شاگرد بھائی نند لال گویا تھے جن کی اہم تصانیف میں 'زندگی نامہ'، 'گنج نامہ'، 'توصیف وثنا'، 'انشاء دستور'، 'عرض الالفاظ' اور 'دیوانِ گویا' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سِکھ مذہب اور سکھوں کی مقدس کتابوں میں اردو زبان و ادب کی آمیزش نمایاں نظر آتی ہے۔ ہندوستانی مذاہب میں سکھوں کی مذہبی تصنیفات و تالیفات نے اردو کے فروغ میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ گورو نانک صاحب سے گورو گوبند صاحب تک جہاں مقدس صحیفوں کی تصنیف و تالیف کا کام ہوا وہاں گورو صاحبان نے سہ حرفی بھی تخلیق کی ہے۔

متذکرہ موضوع کی وضاحت کے لیے ایک دفتر درکار ہے مختصر یہ کہ اردو کے ابتدائی فروغ میں سِکھ گوروؤں اور گرنتھوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

□

Dr. Nashir Naqvi, Prof. Dept of Urdu, Punjabi University, Patyala (Punjab)

پنکی جسٹن

بائبل کے اردو تراجم
کہانی سے حقیقت تک

انگریز حکمرانوں نے اردو زبان کی جو بالواسطہ خدمات کیں انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل تبلیغی مقاصد، دوم ادبی مقاصد، سوم ادبی و تبلیغی مقاصد، تبلیغی مقاصد کے نتیجے میں جو تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں سے اگر چہ بیشتر مذہب ہندو و اسلام اور ان کے عقائد پر طنز و تشنیع کے تیر برساتی اور اپنے مذہب کی خوبیوں کو اجاگر کرتی نظر آتی ہیں لیکن اس کیچڑ میں بعض کنول کے پھول بھی کھلے نظر آتے ہیں جو بلا واسطہ ادب کے دامن کو گوہر آبدار سے بھر دیتی ہے اور اس کے بغیر اردو ادب کی تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں۔ بائبل کے تراجم اردو ادب کی نثری تاریخ کو اسی قسم کا سہارا دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بائبل کے تراجم کے ضمن میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحقیق کے مطابق بنجمن شلز کا کتاب دانیال اور کتاب پیدائش کا ترجمہ دراصل 1748 میں شائع ہوا اور مرزا صاحب کے مطابق دوسرا قدیم ترین ترجمہ کالنبرگ کا تھا جو 1780 میں کلکتہ سے شائع ہوا لیکن وہ اس ضمن میں کوئی حوالہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں تاہم ان کی اس بات سے ہم صد فی صد اتفاق کرتے ہیں کہ بائبل کے تراجم کے ضمن میں اوّلیت کا سہرا ولندیزیوں اور پرتگالیوں کے سر رہا کیونکہ انگریز مشنریوں کی آمد سے قبل جان جوشوا کیٹلر اپنی کتاب 'صرف و نحو' ہندوستانی مطبوعہ 1751 میں مشہور عالم Lord's Prays دعائے ربانی، دس احکاماتِ الٰہی اور عقائد دین کا ترجمہ کر کے ترجمے کی روایت ڈال چکا تھا۔

گریرسن کی تحقیق کو بنیاد بناتے ہوئے ڈاکٹر عزیر نے اپنی کتاب 'اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں دیگر مذاہب کا حصہ' میں جس ترجمے کو نمبر 7 پر رکھا ہے وہ پادری ہنری مارٹن نے کیا تھا۔ ہنری مارٹن 1806 میں ہندوستان آیا۔ 1857 میں اس نے سیرام پور مشن کے تحت عہد نامہ جدید کا ترجمہ مرزا فطرت کی مدد سے شروع کیا۔(1) یہ کب ختم ہوا اس سلسلے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یونانی زبان سے براہِ راست اردو میں ترجمہ ہونے والا یہ متن دیوناگری رسم الخط میں چھاپا گیا۔ پادری برکت اللہ نے اس کا سنہ طباعت 1817 بتایا ہے۔ برکت اللہ کے مطابق ان کے پاس 1829 کی طبع شدہ جلد تھی لیکن اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ تاریخ ادب اردو میں سکسینہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ 1814 میں مکمل ہوا اور 1819 میں شائع ہوا جبکہ گریرسن کے مطابق یہ 1814 میں پہلی دفعہ چھپا بعدازاں 1819 میں لندن سے چھپا۔

ڈاکٹر عزیر کی کتاب 'اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں دیگر مذاہب کا حصہ' میں عیسائی مذہب کے موضوع کے تحت زیر بحث آنے والا ترجمہ 'کتاب مقدس' جو کہ عہد نامہ قدیم اور جدید پر مشتمل تھا۔ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزا پور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر میتھر نے 1867 میں چھاپا۔ تصحیح کے بعد اس کا چوتھا ایڈیشن اسی پریس سے ڈاکٹر میتھر نے 1870 میں چھپوایا جس کا ذکر ڈاکٹر عزیر کی کتاب میں بارھویں نمبر پر ایک الگ ترجمے کی حیثیت سے آتا ہے۔ جبکہ مس رضیہ نور محمد اپنے مقالے 'اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' میں بحوالہ آغا افتخار حسین 'یورپ میں اردو' میں اس ترجمے کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر ماتھر نے یہ ترجمہ رومن اور عربی رسم الخط میں شائع کیا اور بہت مقبول ہوا... انجیل مقدس کے ترجمے پر 1893 اور 1819 کے درمیان دوبارہ نظر ثانی کی گئی۔ یہ کام پرکنز (Perkins H.E.) کی نگرانی میں شروع ہوا جو اس وقت آگزلیری بائبل سوسائٹی (Society Bible Auxiliary Punjab) کے صدر تھے۔ پرکنز 1849 میں ہندوستان سے واپس چلا گیا اور اس کے بعد یہ کام وائٹ بریچٹ (WeitBrechet H.V) اور دیگر مشنریوں کی نگرانی میں ہوا۔ یہ ترجمہ 1819 میں مکمل ہوا۔''(2)

مس رضیہ نور محمد کا نقل کیا ہوا یہ بیان اس ترجمے کے متعلق مزید الجھاؤ پیدا کر رہا ہے کیونکہ اس کے مطابق یہ ترجمہ 1899 میں نظر ثانی کے بعد مکمل ہوا۔ جبکہ جس کمیٹی کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ تمام کتب عہد جدید کی نظر ثانی کرتی رہی ہے۔ جو 1893 سے 1899 تک قائم رہی۔ پادری برکت اللہ اس سلسلے میں بیان کرتے ہیں:

''بائبل سوسائٹی نے اس غرض کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جو 1893 سے 1899 تک کتب عہد جدید کی نظر ثانی کرتی رہی یہ کمیٹی پادری ایچ ای پرکنز، پادری ایچ یو وائٹ بریچٹ، سٹینٹن، پادری ٹی جے سکاٹ، پادری تارا چند، پادری جے جی ڈین، ڈاکٹر جے سی آر جنویر، پادری ڈبلیو مانیل اور پادری ڈاکٹر ایف جے نیوٹن پر مشتمل تھی یہ نظر ثانی شدہ ترجمہ KJV (King James Version) کے نئے ورژن R.S.V (Revised Standard Version) پر مبنی تھا۔''(3)

غالباً یہ اسی ترجمے کا ذکر ہے اس تمام بحث کے مطابق ایک ہی ترجمے کے مختلف ایڈیشنز ایک الگ ترجمے کے طور پر بیان کر کے کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں۔ اس سلسلے میں مرزا حامد بیگ کا بیان زیادہ

مستند ہے۔

مرزا پور کے ڈاکٹر میتھر نے عہدِ جدید کے 1841 کے ترجمے کو نظرِ ثانی کر کے دونوں عہد ناموں کو شائع کرایا یہ ترجمہ بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔ 19ویں صدی کے اواخر میں اس ترجمے پر ایک بار پھر نظرِ ثانی کی گئی تاکہ ترجمہ اور اصل زبان میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ تیسری نظرِ ثانی 1930 میں کی گئی اور چوتھی 1980 میں مکمل ہوئی۔ (ڈاکٹر عریز نے پچھلے ترجمے کے اس چوتھے ایڈیشن کو ایک الگ ترجمے کے طور پر بیان کیا ہے۔)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق ڈاکٹر میتھر نے جس ترجمے پر نظرِ ثانی کی وہ 1841 میں بنارس شہر کی مسیحی کمیٹی نے کیا تھا اور یہ ترجمہ پادری ہنری مارٹن کے ترجمے پر مبنی تھا۔ اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر میتھر تھے کمیٹی میں دو ہندوستانی مسیحی (مرزا پور سے متعلق) ہری بابو اور جان مسیح بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر فینڈر بھی گاہے بگاہے اس کمیٹی کی مدد فرماتے تھے۔(4)

بائبل کے تراجم کے ضمن میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحقیق کے مطابق بنجمن شلز کا کتاب دانیال اور کتاب پیدائش کا ترجمہ دراصل 1748 میں شائع ہوا اور مرزا صاحب کے مطابق دوسرا قدیم ترین ترجمہ کالنبرگ کا تھا جو 1780 میں کلکتہ سے شائع ہوا لیکن وہ اس ضمن میں کوئی حوالہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں تاہم ان کی اس بات سے ہم صد فی صد اتفاق کرتے ہیں کہ بائبل کے تراجم کے ضمن میں اوّلیت کا سہرا ولندیزیوں اور پرتگالیوں کے سر رہا کیونکہ انگریز مشنریوں کی آمد سے قبل جان جوشوا کیٹلر اپنی کتاب 'صرف و نحو' ہندوستانی مطبوعہ 1751 میں مشہور عالم Prays Lord's دعائے ربانی، دس احکامات الٰہی اور عقائد دین کا ترجمہ کر کے ترجمے کی روایت ڈال چکا تھا۔

یہاں مرزا حامد بیگ کی اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ہری بابو اور جان مسیح دو الگ شخصیات نہیں ہیں۔ راقمہ کی تحقیق کے مطابق ہری بابو اور جان مسیح ایک ہی شخص ہے۔ کتاب بعنوان 'تعظیم التورات' اس وقت میرے سامنے موجود ہے جس کے مصنف کا نام 'بابو جان ہری صاحب' ہے اس کے مقدمے میں م، ع حسرتی تذکرہ کرتے ہیں کہ مصنف کا اصل نام شیو درشن سنگھ تھا۔ کمسنی میں ہی والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہونے کے بعد کرنل انسلی جان ہری کے زیرِ سایہ پرورش پانے لگے۔ کرنل نے انھیں اپنا نام بطور نشانی دے دیا۔ اس وقت سے ان کا نام بابو جان ہری ہو گیا۔ ان کا زمانہ بھی 1811 تا 1883 ہے۔

اردو زبان کی اسلوبی کروٹیں (تراجم بائبل کی روشنی میں)

ادبی مشنریوں کی تربیت لاطینی زبان کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ ان کا علمی پس منظر اہلِ روما کی لسانی اور علمی کارگزاریوں کا مرہونِ منت تھا۔ یہی پس منظر تراجم بائبل میں بھی کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے اور اس پر لاطینی کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ انجیل کے تراجم کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اردو زبان کے وہ نمونے بآسانی دیکھ سکتے ہیں جو عیسائیوں نے اردو زبان کو باثروت بنانے میں تحریر کیے اور جن کی جھلک اس دور میں خال خال نظر آتی ہے۔ یہ نمونے اس اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ ان میں اردو کی عام بول چال کی زبان سامنے آئی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ان نمونوں کو عہد بہ عہد پیش کیا جا رہا ہے۔

1715 کی زبان:

جان جوشوا کیٹلر کی دعائے ربانی کا ترجمہ:

''ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہوئے تیرے نام آوے ہم کو ملک تیرا، ہوئے راج تیرا، جوں اسمان جو جمین میں، روٹی ہمارے نہ تھی، ہم کو آس دے، اور معاف کر تقصیرا اپنی ہم کو، جوں معاف کرتے اُپرے (اپنے) قرض داروں کوں، نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کو گھس کر اس بورائی سے، تیری ہی پادشاہی، زور آوری عالمگیری حمایت میں آمین۔''

1745 تا 1758 کی زبان:

بنجمن شلز کی کتاب 'ہندوستانی گرامر' سے ماخوذ ہے:

''باپ ہے سو ایک اللہ کے اوپر کرتا ہوں، اور اپنی قدرت سوں آسمان کوں بھی، زمین کوں بھی پیدا کیے ہیں، اون کا ایک فرزند ہیں، سو ہمارا خاوند ایشوعا مسیحا کے اوپر اعتقاد لاتا ہوں اور روح قدس حمل کرنا ہو کو، ابنائی مریم کے پیٹ سے تولد ہو کو، پنیاوس پیلاط وسکے نیچے عذاب پا کو، دو پائے کوں اوپر مانرا ہو کو مر جا کو قبر مے رکھنا ہو کو، نیچے کوں اوترا کو جا کو تیسرے روز ے مر گئے سو رونو ے سوں اوٹ کو اسمان پوچھڑ کو قدرت سوں ہے، سو باپ خدا کے سے ہر طرف مے ہے، وہاں سوں جیون ہاریاں کوں بھی مر گیوٗ، انو کوں بھی کتوال ہو کر آوے گا روح قدس کے اوپر اعتبار کرتا ہوں، پاک منداں کی جماعت بھی، محبت بھی، گناہاں کا معافی، انگ اُٹھنا بھی ہمیشہ رہے گا، جیو بھی ہے کہہ کو اعتبار کرتا ہوں۔''

یہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور اس کا اقرار ہی ان کے ایمان کی بنیاد ہے۔

ان دونوں تراجم کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے جمیل جالبی یوں رقم طراز ہیں:

''ان نثری ترجموں پر قدیم اردو (دکنی) کا گہرا اثر ہے۔ اس میں 'چ' تاکیدی ('ہی' کے معنی میں) بار بار استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح جمع بھی دکنی طریقے سے بنائی گئی ہے۔ فارسی اصول و قواعد کے مطابق محترم ہستی کے لیے ضمیر واحد کے ساتھ فعل جمع لاتے ہیں۔ یہی صورت اس ترجمے میں ملتی ہے مثلاً او... پیدا کیے ہیں، یا ''اون کا ایک فرزند ہیں، شلز چونکہ مبلغ پادری تھا اس لیے اس نے متن سے قریب تر رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل میں وہی جذبۂ عقیدت کارفرما رہا جو قرآن پاک کے ترجموں و مفسروں کے ہاں نظر آتا ہے۔''(5)

1839 کی زبان:

بپٹسٹ مشن پریس سے 1839 میں عہد نامۂ جدید کے ایک ترجمے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر عزیز کی فہرست میں نمبر 1 پر ہے اور یہ اقتباس 'رسولوں کے اعمال' سے ہے۔

''اے تھیوفلے، میں کتاب میں بیان کر چکا ہوں ان سب کاموں اور نصیحتوں کو جو یسوع کرتا رہا اس وقت تک کہ وہ روح قدس سے اپنے برگزیدہ رسولوں کو حکم دے کے اوپر اٹھایا گیا، جن کے نزدیک اس نے بعد اپنے مرنے کے اپنے تئیں بہت سی دلیلوں سے زندہ ثابت کیا کہ وہ چالیس دن تک انھیں دکھائی دے کر خدا کی بادشاہت کی باتیں کہتا رہا اور انھیں اکٹھا کر کے یہ حکم کیا...'

1842 کی زبان:

بائبل پریس کلکتہ سے 1842 میں چھپنے والا یہ ترجمہ کتابِ پیدائش کے پہلے باب کی پہلی چند آیات کا ترجمہ یوں بیان کرتا ہے:

''ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور

خدا کی روح پانی پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو اور اجالا ہو گیا...''

ڈاکٹر عزیز کی فہرست میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔

1859 کی زبان:

مرزاپور کے آرفن پریس سے 1859 میں ریورنڈٹی ہورنلے کی کتاب پیدائش کے ترجمے کے سلسلے میں کی گئی کوشش کا نتیجہ ملاحظہ ہو:

''خدا اپنے کلام سے آسمان زمین کو پیدا کیا۔ اس کے پیدا کرنے سے پہلے خدا کے سوا کچھ نہ تھا۔ خدا ہی قدیم وقادر ہے جو چاہے سو کر سکتا ہے۔ اس نے نہ چاہا کہ آسمان وزمین اور ان کی سب حشمتیں ایک ہی بار دکھلائی دیں بلکہ رفتہ رفتہ ظاہر و تیار ہوویں۔ کیونکہ اس نے پہلے ہی سب کا بندوبست شمار اور پیمانے اور تول سے کر لیا۔ سو خدا نے آسمان وزمین کو چھ دن میں بنایا...

ڈاکٹر عزیز کی فہرست میں اس کا نمبر 7 ہے۔

1865 کی زبان:

1865 میں عربی سے اردو ترجمہ ہونے والی کتاب 'زبور' کی زبان کچھ یوں ہے:

''اے خداوند، وے جو مجھے دکھ دیتے ہیں کیا ہی بڑھ گئے ہیں۔ وہ بہت ہی بڑھ گئے ہیں کہ جو میری حفاظت پر اٹھتے ہیں۔ بہتیرے میری جان کی بابت کہتے ہیں کہ خدا سے اب اس کی نجات نہیں صلا پر تو دے خداوند میرے لیے سپر ہے...''

1867 کی زبان:

نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزاپور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر ماتھر کے اہتمام سے 1867 میں شائع ہونے والے ترجمے کا ایک مختصر سا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:

''پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا اور کہا کہ دیکھو میں نے ایک خواب دیکھا کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے سجدہ کیا ہے اور اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا اور تب اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور اسے کہا کہ یہ کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کر تجھے سجدہ کریں گے اور اس سے بھائیوں کو رشک آیا لیکن اس کے باپ نے اس بات کو یاد رکھا۔''

1873 کی زبان:

مرقس، باب دہم کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

''پھر وہاں سے اُٹھ کر یرون کے پار یہودیہ کی سرحدوں میں آیا اور لوگ آس پاس پھر جمع ہوئے اور وہ اپنے دستور کے موافق پھر انھیں تعلیم کرنے لگا اور فریسیوں نے آس پاس آ کے امتحان کی راہ سے اس سے پوچھا کیا روا ہے کہ مرد جورو کو طلاق دے...''

1886 کی زبان:

انیسویں صدی کے تقریباً آخر میں چھپنے والا یہ ترجمہ ریورنڈ جے ایف المان کے رَخشِ قلم کا نمونہ ہے:

''پھر اس نے جاتے ہووے ایک شخص کو جو جنم کا اندھا تھا دیکھا اور اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا کہ اے ربّی گناہ کس نے کیا، اس شخص نے یا اس کے ماں باپ نے کہ یہ اندھا پیدا ہوا۔ عیسیٰ نے جواب دیا نہ تو اس شخص نے گناہ کیا اور نہ اس کے ماں باپ نے لیکن یوں ہوا تا کہ خدا کے کام اس میں ظاہر ہوں...''

اردو تراجم بائبل کے بنظر غائر مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تراجم میں بارہا تصحیح شدہ ایڈیشنوں نے غلط فہمیوں کو اس قدر طول دیا کہ تحقیقی مقالے بھی اس کا ازالہ نہ کر سکے دوسری طرف تراجم کی زبان سے بعض بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جو معذرت کے ساتھ آج بھی اردو بائبل کا حصہ ہیں اور معانی کو ایک نیا رنگ پہنائے ہوئے ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عبرانی میں بعض اوقات ایک ہی لفظ کئی معانی میں استعمال ہے مثلاً بائبل کی پہلی کتاب پیدائش کے باب اوّل کی پہلی آیت یوں درج ہے

''خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔'' بائبل کے تمام اردو تراجم میں 'پیدا کیا' یہ فعل عبرانی متن میں دو مختلف عبرانی فعل کے ساتھ استعمال ہوا ہے ''بارا'' اور ''عاسا'' پہلا فعل آیات 2,3,4 اور دوسرا آیات 7, 12, 11, 25, 31, 26 اور باب 2 کی 2، 3,4 آیات میں۔ بارا کسی بھی مقام پر خدا کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوا جبکہ 'عاسا' میں یہ تخصیص نہیں۔ یہاں تک کہ 2 سموئیل 19:24 (عبرانی میں آیت 25) میں یہی فعل شیو بنانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں 'بارا' نیست سے ہست اور 'عاسا' موجود چیز کو کوئی اور شکل دینے پر دلالت کرتا ہے۔ پہلے لفظ 'بارا' سے عربی میں 'باری' آیا ہے جو صرف پروردگار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عبرانی کا 'وُ' حرف عطف 33 مختلف کام سر انجام دیتا ہے لیکن اسے اندھا دھند 'اور' یا 'پھر' 'سو' ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ Exegesis کمزور ہونے کے باعث محض قیاس کی بنا پر قریب ترین معنی لینے کی کوشش کی گئی۔ دوسری طرف مترجمین خود اہل زبان (اردو) نہ تھے اس لیے عوامی اور فطری زبان سے قریب تر رہنے کی شعوری کوشش میں ان کا اکتساب لسانی کمزور رہا اور اردو کے قواعد وضوابط کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا۔ بہرحال ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے بڑی محنت اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات:

(1) 'اردو زبان کی ترویج واشاعت میں دیگر مذاہب کا حصہ' ڈاکٹر محمد عزیز، ص

(2) اردو زبان وادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ از 1498 تا 1947 از ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد، ص 218

(3) صحت کتب مقدسہ از پادری برکت اللہ، ص 158

(4) 'مغرب سے نثری تراجم' از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص 114

(5) ایضاً

(6) 'تاریخ ادب اردو'، جلد دوم از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 1024

بشکریہ: ششماہی تحقیقی مجلہ 'خیابان'، 22 واں شمارہ، جامعہ پشاور

مدیر: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری

قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر

محمد افضل خان

اٹھارویں صدی

.1	تفسیر وہابی	(قدیم دکھنی اردو) عبدالصمد بن نواب عبدالوہاب خاں جلد (1632 صفحات) کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد)	سن عیسوی/ہجری 1087/1686
.2	مخطوطہ	نامعلوم، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد دکن	1150/1737
.3	ترجمہ	شاہ مراداللہ انصاری	1184/1770
.4	ترجمہ و تفسیر	(امامیہ مذہب)، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد	1200/1785
.5	ترجمہ و تفسیر	(مخطوطہ) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	1200/1785
.6	ترجمہ و تفسیر	قاضی سید نورالحق منعم	1205/790
.7	ترجمہ	شاہ عبدالقادر	1205/1790
.8	ترجمہ	شاہ رفیع الدین	1215/1800
.9	ترجمہ	قاضی محمد بن مفتی اعظم سنبھلی (غیر مطبوعہ، مخطوطہ کتب خانہ نورالحسن صاحب، بھوپال)	1131/1718
.10	مخطوطہ	محمد باقر فضل اللہ خیرآبادی، نظام کالج، حیدرآباد، دکن	

انیسویں صدی

.1	ترجمہ	علما کمیٹی کاظم علی، امانت اللہشیدا، میر بہادر علی، مولوی فضل اللہ اور غوث علی حافظ	1218/1808
.2	ترجمہ	حکیم محمد شریف خان ابن حکیم محمد اکمل خاں دہلوی	1222/1807
.3	ترجمہ	عبداللہ ہوگلی	1245/1829
.4	ترجمہ	عبداللہ سید	ایضاً
.5	توضیح مجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید	سید علی مجتہد ین سید دلدار علی	1252/1836
.6	کوکب دری	مولانا کرامت علی جونپوری	1253/1837
.7		شاہ رفیع اللہ محدث دہلوی	1256/1840
.8	مخطوطہ	مولوی انور علی لکھنوی	125/1839
.9	نامعلوم	(بمقام لکھنؤ)	1256/1840
.10	امریکہ مشن		1260/1844
.11	ترجمہ و تفسیر	سید صفدر حسین مودودی	1260/1844
.12	ترجمہ	نامعلوم (برٹش میوزیم، لندن)	1271/1854
.13	مخطوطہ	کامل شاہ دکھنی	1275/1858
.14	فیض الکریم	صبغۃ اللہ قاضی محمد بدرالدولہ	1277/1860
.15	تفسیر مطالب بیضاوی	غلام مہدی خاں واصف	1278/1861
.16	تفسیر القرآن اتخریج لغات القرآن	محمد سلیم	1281/1864
.17	جامع التفاسیر	نواب قطب الدین خاں بہادر دہلوی	1283/186
.18	ترجمہ و تفسیر	مولانا یعقوب حسن خان	1281/1866
.19	حدائق البیان فی معارف القرآن	مولوی عبدالغفور خاں	1284/1867
.20	ترجمہ و تفسیر	محمد ہاشم علی	1284/1868
.21	ترجمہ	سید ظہیرالدین بلگرامی	1290/1873
.22	تفسیر مجددی	رؤف احمد رافت نقشبندی مجددی	1293/1876
.23	تفسیر حضرت شاہی	محمد حسین تقوی	1293/1876
.24	مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن	الحاج سید شاہ، ایم اے	1300/1882

.25	مخطوطہ	نامعلوم	1300/1882
.26	تشریح القرآن	محمد عثمان سلیم الدین تسلیم جے پوری	1301/1883
.27	مخطوطہ	حسین علی خاں	1302/1884
.28	ترجمان القرآن بلطائف البیان	نواب صدیق حسن خان	1302/1884
.29	ترجمہ	محمد احتشام الدین مرادآبادی	1302/1885
.30	کاشف الفہم (ترجمہ)	سید زین العابدین	1304/1886
.31	ترجمہ	سید علی محمد	1304/1886
.32	تفسیر	قادری مولوی فخر الدین احمد	1304/1886
.33	ترجمہ (شیعی عقائد)	نواب محمد حسین قلی خان	1304/1886
.34	غایۃ البرہان (تفسیر)	حکیم سید محمد حسن امروہوی	1305/1887
.35		ابو محمد بن الحکیم عبد العلی آروی	1307/1889
.36	عمدۃ البیان (ترجمہ وتفسیر)	سید عمار علی	1308/1890
.37	ترجمہ وتفسیر	مصطفےٰ بن محمد سعید	1308/1890
.38	خلاصۃ التفاسیر	فتح محمد تائب لکھنوی	1309/1891
.39	ترجمہ	احسان اللہ محمد عباسی گورکھپوری	1310/1892
.40	ترجمہ	مولوی محمد باقر	1311/1893
.41	اعظم التفاسیر	مولانا عبد الرحیم	1311/1893
.42	ترجمہ	ریورنڈ ڈاکٹر امام الدین امرتسری	1312/1894
.43	ترجمہ	فیروز الدین ڈسکوری	1312/1894
.44	بستان التفاسیر	محمد علی چاندپوری	1312/1894
.45	تفسیر ثنائی	مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری	1313/1895
.46	تفسیر اکسیر اعظم	مترجم محمد احتشام الدین مرادآبادی	1313/1895
.47	تفسیر تنویر البیان (اردو ترجمہ)	مترجم محمد حسین معروف بہ سید ملن	1313/1895
.48	حدیث التفاسیر	مولوی حمید اللہ میرٹھی	1315/1897
.49	ترجمہ وتفسیر	مولانا عبد المقتدر بدایونی	1315/1897
.50	ترجمہ وتفسیر	ڈپٹی نذیر احمد	1316/1897
.51	تفسیر فتح المنان	مولانا عبد الحق حقانی دہلوی	1317/1899
.52	تفسیر للقرآن بالقرآن	عبد الحکیم خاں پٹیالوی	1318/1900
.53	ترجمہ	سراج الدین محمد عبد الرؤف	1318/1900
.54	نور ہدایت (ترجمہ وتفسیر)	فتح محمد جالندھری	1318/1900
.55	ترجمہ	عاشق الٰہی میرٹھی	1318/1900

بیسویں صدی

.1	ترجمہ قرآن	مرزا محمد امراؤ حیرت دہلوی	1391/1901
.2	تفسیر مواہب الرحمٰن	سید امیر علی	1392/1902
.3	ترجمہ وتفسیر	سید شریف حسین	1320/1902
.4	تفسیر قادری		1320/1902
.5	تیسیر البیان فی ترجمۃ القرآن	محمد عبد المجید	1321/1903
.6	غایۃ البرہان فی تاویل القرآن الحکیم	سید محمد حسن	1322/1904
.7	ترجمہ وتفسیر جلالین	مترجم ابوذر سنبھلی	1323/1905
.8	تفسیر وحیدی	مولانا وحید الزماں	1323/1905
.9	تفسیر سروری	مولوی سرور شاہ	1323/1906
.10	تفسیر القرآن مع ترجمہ	مولوی محمد انشاء اللہ	1325/1907
.11	ترجمہ	مولانا نظام الدین حسن نیوتنوی	1325/1907
.12	ترجمہ قرآن	مولانا حکیم نور الدین	1328/1910
.13	کنز الایمان فی ترجمۃ البیان	مولانا احمد رضا خاں بریلوی	1330/1912
.14	خزائن القرآن	نسیم الدین مرادآبادی	1330/1912
.15	جواہر الایقان فی توضیح کنز الایمان	مولانا محمد حشمت علی خاں رضوی پیلی بھیتی	1330/1912
.16	مطالب القرآن	سید حسن بہاری	1330/1912
.17	ترجمہ	ڈاکٹر ابوالفضل میرزا	1332/1913
.18	تفسیر بیان للناس	خواجہ احمد امرتسری	1334/1915
.19	احسن التفاسیر	شاہ عبد القادر دہلوی	1334/1915
.20	ترجمہ	ریورنڈ ڈاکٹر احمد شاہ پادری	1334/1915
.21	ترجمہ مع تفسیر	میر محمد سعید قادری	1334.1915
.22	تفسیر روح الایمان فی تشریح الآیات القرآن	محمد فتح الدین ازہر انصاری اختر	1335/1917
.23	ترجمہ	سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی	1335/1917
.24	فخر الدین ملتانی		1338/1919
.25	تفسیر وترجمہ	مقبول احمد دہلوی	1340/1921
.26	تفسیر البیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی	1324/1925
.27	ترجمہ	شیخ الہند مولانا محمود الحسن	1344/1925
.28	الطاف الرحمٰن تفسیر القرآن	محمد عبد الباری فرنگی محلی	1344/1925
.29	لوامع البیان	محمد سعادت اللہ خاں	1345/1926
.30	ترجمہ تفسیر ابن عباس	مفتی محمد رمضان اکبرآبادی	1345/1926
.31	کتاب الہدیٰ	یعقوب حسن سیٹھ مدراس	1345/1926
.32	احسن الفوائد	سید احمد حسن دہلوی	1347/1928
.33	تفسیر واضح البیان	علامہ عبد الماجد	1349/1930
.34	ترجمان القرآن (جزوی تراجم)	مولانا ابوالکلام آزاد	1350/1931
.35	ترجمہ وتفسیر محمدی	مولانا محمد بن ابراہیم جوناگڑھی	1352/1933
.36	ترجمہ وتفسیر بیان السبحان	مولانا سید عبد الدائم جلالی	1358/1939
.37	ترجمہ وتفسیر تسہیل القرآن	مولوی فیروز الدین	1362/1943
.38	ترجمہ وتفسیر تفہیم القرآن (مکمل چھ جلدوں میں)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (ادارہ ترجمان القرآن لاہور)، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی	1368/1949
.39	القرآن الحکیم مع ترجمہ وتفسیر	مولانا عبد الماجد دریا آبادی	1369/1950
.40	کشف الرحمٰن مع تفسیر القرآن و تسہیل القرآن		

بشکریہ: روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' (قرآنِ عظیم نمبر)، نئی دھلی، 14 اکتوبر 2006

Mohd Afzal Khan, 4/76, Sri Nath Poral Lane, Howrah - (WB)

■ شریف احمد قریشی

معنی کی نیرنگیاں اور اُن کا تحفظ

کسی لفظ کے معنی کا تحفظ اور اُس کے مفہوم تک رسائی کا اہم ذریعہ کتبِ لغت اور فرہنگیں ہیں۔ الفاظ کی نیرنگیوں کو سمجھنے اور معانی کے تحفظ کے لیے کتبِ لغات اور فرہنگوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کتب لغت اور فرہنگوں کو نظرانداز کردیا جائے تو پتہ چلے گا کہ الفاظ کے مفہوم تک رسائی اور ان کے تحفظ کے لیے اردو میں بہت کم کام ہوا ہے یعنی گیسوئے معنی ابھی منت پذیر شانہ ہیں۔

کسی لفظ، جملے فقرے، مصرعہ یا شعر کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ظاہری اور اشاراتی یا استعاراتی۔ ظاہری معنی تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اشاراتی یا استعاراتی معنی ایک سے زائد یا متعدد ہوسکتے ہیں۔ ظاہری معنی چوں کہ واضح اور صاف ہوتے ہیں، اس لیے انھیں عام انسان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے لیکن اشاراتی یا استعاراتی معانی کی نیرنگیاں ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ انھیں صرف زبان داں اور مہذب شخص ہی سمجھ سکتا ہے۔ ظاہری معنی پوری بات یا مکمل جملے کے الفاظ کے ذریعے سمجھے جاسکتے ہیں مگر اشاراتی معنی اُن کے جزئیات کی مدد سے ذہن میں آتے ہیں۔ ظاہری معنی کا تحفظ آسان ہے مگر اشاراتی معنی جو جملے کے جزئیات اور سیاق وسباق کے سبب لغوی معنی کے بجائے دوسرے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ ان کا تحفظ کسی دشوار کے مرحلے سے کم نہیں۔ کتبِ لغت کا پہلا کام لفظ، روزمرہ یا اقوال و امثال کے معنی و مفہوم کا تحفظ کرنا ہے۔ فرہنگ کسی لفظ، جملہ، فقرے، محاورے یا اقوال و امثال کے ان معنی و مفہوم کا تحفظ کرتی ہے جو ان کے اشارات، علائم جزئیات یا سیاق وسباق سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرہنگوں کی مدد سے ان علائم و اشارات کے مفہوم کو کتبِ لغات میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔

کسی زبان کے اہم شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات میں مستعمل ظاہری، استعاراتی و اشاراتی الفاظ کے علاوہ فن کاروں، پیشہ وروں، مقامی سطح پر رائج اصطلاحات کو جب تک ان کے معانی و مفاہیم کے ساتھ فرہنگ کی شکل میں یکجا نہیں کیا جاتا، اُس وقت تک اُس زبان کے الفاظ و اصطلاحات کے معانی کا تحفظ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم بہ غائر نظر کسی شاعر یا ادیب کی نگارشات میں مستعمل الفاظ یا کسی سماج اور علاقے میں مروج الفاظ کے معانی و مفاہیم کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ بعض الفاظ یا جملے ایک سے زائد معانی یا مفاہیم کے لیے مستعمل ہیں۔ ایسے الفاظ کے تمام معانی کا تحفظ کرنا لغت نگار، فرہنگ نویس، اہلِ زبان اور ماہرِ لسانیات کی اہم ذمے داری ہے۔ بطورِ مثال 'انتقال' کے معنی مقام تبدیل کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور اصطلاحی معنی موت یا وفات کے ہیں۔ لفظ انتقال کے اصطلاحی معنی سے انتقال ہونا، انتقال کرنا، انتقالِ پرملال جیسے محاورے وجود میں آئے۔ اسی طرح لفظ 'حمل' کے لغوی معنی وزن، بوجھ یا بار کے ہیں اور

> **صلٰوۃ کے معانی نماز، دعا، برکت، رحمت اور مہربانی کے ہیں لیکن اب یہ لفظ دشنام، گالی، کلام نامائم کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے اور محاورات کی شکل میں بھی رائج ہے۔ جیسے برا بھلا کہنا اور گالی دینا کے مفہوم کے لیے صلوتیں سنانا**

اصطلاحی معنی پیٹ، یعنی گربھ (गर्भ) یا اُس بچے کے ہیں جو عورت کے پیٹ میں ہو۔ اس لفظ کے اصطلاحی معنی سے حمل ٹھہرنا، حمل رہنا، حمل ہوجانا، حمل ضائع ہونا، حمل گرانا اور حمل گرنا، حمل ساقط ہونا جیسے محاورے وجود میں آئے۔ جس سے بلاشبہ الفاظ کے خزانے میں واقع ہوتی ہے کہ چلن میں آجاتی ہے۔ عام آدمی کے ذہن سے تو ان کے اصلی یا لغوی معنی قطعی مفقود ہوجاتے ہیں اور بہت سے خواص یا زبان داں حضرات بھی انھیں بھلا بیٹھتے ہیں۔ دادا، خلیفہ، شہید، صلوٰۃ، حرام، مہتر وغیرہ کا شمار ایسے ہی الفاظ میں کیا جاسکتا۔ دادا، خلیفہ، قائم مقام، جانشین اور نائب کو کہتے ہیں۔ اس کے اصطلاحی معنی بدمعاش، چالاک اور ہوشیار کے بھی ہیں۔ نائی، درزی، باورچی وغیرہ کو خوش کرنے کے لیے خلیفہ کہا جاتا ہے۔ شہید کے لغوی معنی گواہ کے ہیں۔ اردو میں شہید اُس شخص کو کہتے ہیں جس نے حق کے لیے یا خدا کی راہ میں جان دی ہو۔ اب اس لفظ کا اطلاق ہر اُس شخص کے لیے ہونے لگا ہے جو وطن کے لیے مرا ہو یا جس کی جان اپنے فرض کو ادا کرنے میں گئی ہو۔ صلوٰۃ کے معانی نماز، دعا، برکت، رحمت اور مہربانی کے ہیں لیکن اب یہ لفظ دشنام، گالی، کلامِ نامائم کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے اور محاورات کی شکل میں بھی رائج ہے۔ جیسے برا بھلا کہنا اور گالی دینا کے مفہوم کے لیے صلوتیں سنانا، لفظ 'حرام' جہاں 'حلال' کے نقیض اور ناروا، ناجائز، ناشائستہ، ناپاک، نجس، پلید اور خلافِ شرع، بدکاری، ممنوعٔ افعالِ شنیعہ کے معانی کے لیے مستعمل ہے، وہیں دوسری طرف بزرگ محترم، قابلِ تعظیم، حرمت والا کے معانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے مسجد الحرام، محرم الحرام وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ کے معانی کا اطلاق استعمال کرنے کے طریقے اور سیاق وسباق پر منحصر ہوں گے۔

لفظ 'مہتر' کے معنی بہتر، بزرگ، سردار، آقا، مالک اور امیر کے ہیں لیکن اب اس لفظ کے اصل معنی سے بیشتر حضرات ناواقف ہیں کیونکہ اب یہ لفظ عام طور پر بھنگی اور خاک روب کے لیے مخصوص ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ خلافِ قاعدہ اس کی تانیث 'مہترانی' بھی رائج ہے۔ اسی لیے بھنگن کو مہترانی کہا جانے لگا ہے۔

مستورات، مستور کی جمع ہے جس کے معنی پوشیدہ،

مخفی یا چھپے ہوئے کے ہیں۔ چونکہ عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں۔ اس لیے اس لفظ کا استعمال عورت کے لیے کیا جانے لگا ہے۔ اب ان عورتوں کو بھی مستورات کہا جاتا ہے جو پردے کی پابندی نہیں کرتیں۔

مقدمہ، تصادم، صحافت، اخبار اور تشریف جیسے الفاظ کے بھی اصل مفہوم ذہنوں سے مفقود ہو چکے ہیں۔ اَب یہ الفاظ اصطلاحی معانی ہی میں مستعمل ہیں۔ مقدمہ کے معنی پیش کرنے والا، آغاز، شروع یا ابتدا کے ہیں۔ کتاب کے آغاز کی تحریر کو اس لیے مقدمہ کہا جانے لگا ہے کہ اسے کتاب کے آغاز میں قلم بند کیا جاتا ہے۔ چونکہ فریقِ اوّل کسی معاملے کو لے کر عدالت میں پیش قدمی کرتا ہے اس لیے دعوے یا استغاثہ اور اس کاروائی کو بھی مقدمہ کہا جانے لگا ہے جو فریقین کے درمیان کسی معاملے کو لے کر نزاع کا سبب بن جاتا ہے۔ محاورے کے طور پر بھی عدالتی نتائج، باہمی تکرار، جھگڑے، یا معاملے کو بھی مقدمہ کہا جانے لگا ہے۔ مثلاً مقدمہ بازی، مقدمہ اٹھانا، مقدمہ لڑنا، مقدمہ لڑانا، مقدمہ جیتنا، مقدمہ ہارنا، مقدمہ کھڑا کرنا، مقدمہ بنانا، یہ کیا مقدمہ ہے؟ عجیب مقدمہ ہے یا کیا مقدمہ پھیلا رکھا ہے؟

تصادم کے لغوی معنی صدمہ دینا یا صدمہ پہنچانا ہے لیکن اب یہ ٹکر یا ایکسیڈینٹ (Accident) کے معنی میں مستعمل ہے۔ تشریف کے لغوی معنی خلعت، لباسِ شاہی جو بادشاہ یا حاکم کے دربار سے بطورِ اعزاز عطا کیا جائے، عزت کرنا، بزرگ بنانا اور شرف بخشنا کے ہیں۔ عوام اس لفظ کے اصلی معنی سے ناواقف ہیں۔ شاید تشریف سے ان کی مراد جسم یا جسم کے کسی حصہ سے ہوتی ہے۔ اسی لیے تشریف لانا، تشریف رکھنا، تشریف لے جانا جیسے محاوروں کا چلن عام ہوگیا ہے۔ شادی کے لغوی معنی خوشی کے ہیں لیکن اب یہ لفظ بیاہ (विवाह) یعنی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی تقریب کے اصطلاحی معنی کے لیے مخصوص ہوگیا ہے۔ اسی لیے بیاہ کے بعد گھر آباد کرنے کو شادی خانہ آبادی اور جس بیاہ کے نتائج اچھے نہ ہوں اُسے شادی خانہ بربادی کہا جانے لگا ہے۔ محاورات کے طور پر بھی اس لفظ کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے مثلاً شادی کرنا، شادی رچانا، شادی مبارک، شادی مچنا، شادی منانا، شادی ہونا، شادی بنانا وغیرہ۔ اسی طرح بدکاری اور فرہنگوں کے ذریعے کیا جانا ناگزیر ہے۔

صحّاف کے لغوی معنی جلد ساز، جلدگر یعنی کتاب کی

جلد بنانے والا کے ہیں اس طرح صحافت کے معنی جلد سازی یا جلدگری اور پیشۂ جلد سازی کے ہوں گے مگر اب یہ لفظ اخباری کاروبار اور اخبار نویس کے معنی کے لیے رائج ہوگیا ہے۔ جسے ہم انگلش میں جرنلزم (Journalism) اور ہندی میں پتّر کارِتا (पत्रकारिता) کہتے ہیں۔ اسی طرح 'اخبار' خبر کی جمع ہے جس کے معنی اطلاع، آگاہی، پیغام،

بعض هندی داں حضرات مخالفت کے مفهوم کے لیے خلافت کا لفظ استعمال کرتے هیں اور بعض حضرات ناواقفیت کی بنا پر جناب کی تصغیر جنابه لکھتے اور بولتے هیں۔ جناب مذکر اور مونث دونوں کے لیے مستعمل هے۔ اسی طرح لفظ مرحوم جس کے معنی هیں رحمت کیا گیا، مغفور یا بخشا گیا کو فوت یعنی مَرا هوا کے مفهوم کے لیے استعمال کرتے هیں جو قطعی غلط هے۔ می

خبر لانا، بتلانا یا اطلاع دینا کے ہیں۔ اب یہ لفظ خبر کے پرچے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے جسے ہندی میں سماچار پتر (समाचार पत्र) اور انگریزی میں نیوز پیپر (News Paper) کہتے ہیں۔ اس کے اصلی یا لغوی معنی لوگوں کے ذہن سے مفقود ہو چکے ہیں۔

بعض ہندی داں حضرات مخالفت کے مفہوم کے لیے خلافت کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور بعض حضرات ناواقفیت کی بنا پر جناب کی تصغیر جنابہ لکھتے اور بولتے ہیں۔ جناب مذکر اور مونث دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اسی طرح لفظ مرحوم جس کے معنی ہیں رحمت کیا گیا، مغفور یا بخشا گیا کو فوت یعنی مَرا ہوا کے مفہوم کے لیے استعمال کرتے ہیں جو قطعی غلط ہے۔ میرے خیال سے ایسے الفاظ اور ان کے معنی کی نشان دہی کرنا بہت ضروری ہے۔

لفظ پیالہ جو عام طور پر کٹورا یا کاسہ کے لیے مستعمل ہے۔ آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں سوئم، مُردے کا تیجا یا تیسرے دن کی فاتحہ کے معنی کے لیے مخصوص ہے۔ پیالہ بندوق میں رنجک یا بالو رکھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں اور فقیروں کی اس دعوت کے لیے بھی مستعمل ہے۔ جو فقیروں کے یہاں ہوتی ہے۔ اسی طرح لفظ بیلا، سمجھ دار شخص کا خود کو ناسمجھ ظاہر کرنے والے یا کسی معاملے سے واقف ہونے کے باوجود ناواقفیت کا اظہار کرنے والے نیز عیار، مکار اور بہانہ باز کے معانی میں رام پور کی مقامی بولی سے مخصوص ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا نے بیلا اور بیلا پن کو انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ رام پور کے علاوہ دہلی یا لکھنؤ میں بھی بولا اور سمجھا جاتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں انشا کے یہ اشعار:

گالی سے رُکا اس کی جو شب میں تو یہ بولا
معلوم ہوا آج کہ تم سخت ہو بیلے
حُسن کے بدرۂ سربستہ پہ ہے ناز کی مُہر
ناف کہنا ہے اِسے سخت، اجی بیلا پن

لہٰذا اِس قسم کے علاقائی الفاظ کے معنی کا تحفظ بھی ضروری ہے۔

کتبِ لغت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر الفاظ کے معانی مترادفات کے ذریعے تحریر کر دیے جاتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ کم ہیں جن کے مترادفات آسانی سے بہم ہو جائیں یا جن کے ہم معنی الفاظ مل جائیں۔ ایسے الفاظ کی اس طرح تشریح کی جانی چاہیے جس سے ان کا پورا مفہوم واضح ہو جائے۔ اس کے علاوہ قدیم اور متروک معانی کی نشاندہی کے ساتھ جدید یا رائج معانی بھی تحریر کرنا ضروری ہے۔ کتب لغت اور فرہنگوں کے علاوہ مضامین، تقاریر، سیمینار، ریڈیو نشریے، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے اس قسم کے الفاظ کی نیرنگیوں اور ان کے صحیح معانی و مفاہیم سے لوگوں کو واقف کرایا جاسکتا ہے۔ تبھی ہم الفاظ کے معانی کے تحفظ کا تصور کر سکتے ہیں۔

■

Dr. Shareef Ahmad Quraishi, Associate Professor, Dept of Urdu Government Raza Post Graduate College Rampur - 244901 (UP)

عبدالواسع

نئی نسل اور اردو زبان و ادب

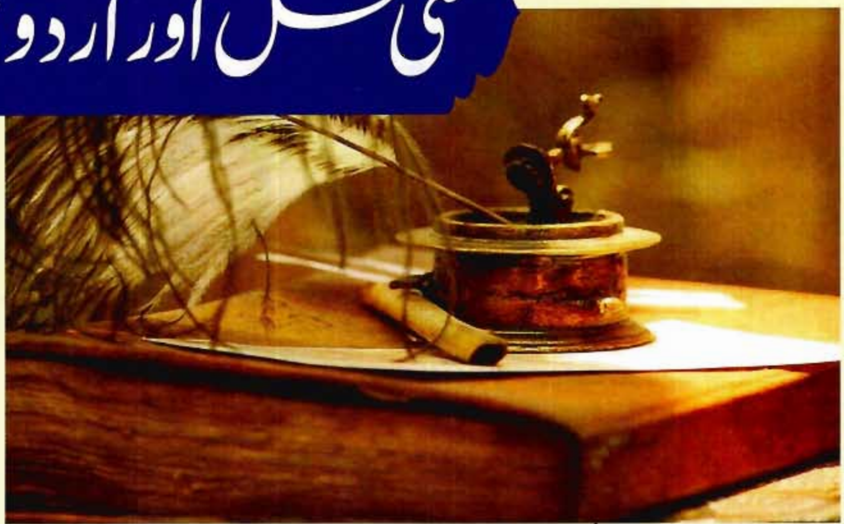

اردو زبان و ادب سے نئی نسل دور ہوتی جارہی ہے۔ آخراس کے اسباب کیا ہیں۔ کیا اردو شعر و ادب کی دلکشی اور جاذبیت میں کمی آئی ہے یا نئی نسل اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے؟ اس مسئلے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اردو شعر و ادب کا حسن تو روز بروز نکھرتا ہی جارہا ہے اس میں نئے علوم وفنون کی سمائی ہورہی ہے، نئے فکر و نظر کے چشمے ابل رہے ہیں۔ نئی کتابیں اور نئے رسائل شائع ہورہے ہیں۔ اردو زبان و ادب ہند و پاک سے باہر نکل کر بین الاقوامی حیثیت پانے میں کامیاب ہورہے ہیں۔ اردو شعر و ادب کے لیے تیسری دنیا کے دروازے کھل رہے ہیں۔ دبئ، قطر، سعودی عربیہ، روس کناڈا، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں مشاعرے اور سیمینار ہورہے ہیں۔ بعض ملکوں میں اردو رسائل بھی شائع ہورہے ہیں گویا اردو برصغیر ہند کی سرحدوں نے نکل کر عالمی سطح پر مقبول و محبوب ہورہی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ گمان کرنا کہ اردو زبان و ادب سے نئی نسل دور ہورہی ہے کہاں تک واقعیت اور صداقت پر مبنی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ظاہری ٹرک بھڑک ہے جب کہ اندرون خانہ کچھ اور ہی گل کھل رہے ہیں۔ نئے ممالک اور نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کا چراغ وہی حضرات جلا رہے ہیں جو برصغیر ہند میں اردو شعر و ادب کے گرویدہ رہے ہیں اور اب دوسرے ممالک میں جاکر اپنے ذوق وشوق کی تسکین و تکمیل کے لیے مشاعرے برپا کررہے ہیں، سیمینار منعقد کررہے ہیں اور رسالے نکال رہے ہیں۔ بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ممالک میں شائع ہونے والے رسائل کے ایڈیٹوریل بورڈ میں اکثر و بیشتر کوئی اردو کا شاعر و ادیب ہوتا ہے جو ہندوستان و پاکستان میں قیام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک صاحب بتارہے تھے کہ بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس ہوتی ہے مگر طلبا کو بنگلہ رسم الخط میں لکھنے کی بھی آزادی ہے چنانچہ اردو پڑھنے والے نوے فی صد طلبا جوابات بنگلہ رسم الخط میں رقم کرتے ہیں۔ کیا یہ کیفیت اردو کے فروغ و بقا میں ممد و معاون ہوگی؟ جواب نفی میں ہے۔ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے ایک تہذیب ہے ایک فکر ہے جو رفتہ رفتہ پروان چڑھی ہے اور رہماری شخصیت میں رچ بس گئی ہے۔ کیا یہی کیفیت آج کی نسل میں دیکھنے کو ملتی ہے تو جواب ہے نہیں پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان و ادب کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہورہا ہے۔ مندرجہ ذیل میں انہی امور پر روشنی ڈالوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچوں۔

اردو زبان و ادب سے نئی نسل کی دوری کے اسباب متعدد ہیں اور یہ دوری یکا یک پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑگئی تھی اور رفتہ رفتہ دوری کی یہ خلیج پیدا ہوئی ہے جو روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ ویسے شعر و ادب کی دنیا میں کوئی واقعہ اچانک واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہونے کے اسباب بہت پہلے سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لیے زمین ہموار ہونے اور ماحول کے تیار ہونے کا کام بہت پہلے ہوتا ہے تب اس کا کونپل پھوٹتا ہے اور شجر سایہ دار بنتا ہے۔ اگرچہ یہ بحث بہت طول طویل ہے اس لیے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے میں ان اسباب کی تلاش و جستجو کرتا ہوں جنھوں نے اردو زبان و ادب کو نئی نسل سے دور کررکھا ہے۔ انھیں تین الگ الگ زمروں میں رکھ کر مطالعہ کرنا مناسب ہوگا۔ (1) تہذیبی اسباب (2) تدریسی اسباب اور (3) معاشی اسباب۔

(1) تہذیبی اسباب:

زبان و ادب اور تہذیب کا رشتہ بہت پرانا اور گہرا ہے۔ زبان تہذیب کی پروردہ ہوتی ہے اور تہذیبیں جب دم توڑتی ہیں تو شعر و ادب کو اپنی آخری پناہ گاہ بناتی ہیں۔ قدیم ایرانی تہذیب فردوسی کے شاہنامہ میں پناہ گزیں ہے بلکہ اس دور کے ایک ایک نقش اس میں ابھر گئے ہیں۔ اسی وجہ سے محمود غزنوی جیسے ادب پرست اور فیاض بادشاہ کے دربار میں فردوسی معتوب ہوا۔

اردو زبان و ادب کی پرورش و پرداخت جس تہذیب میں ہوئی تھی وہ عرصہ ہوا اس سے چھن گئی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اردو زبان و ادب کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا بعض ریاستوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کو اسکول کے نصاب سے خارج کردیا گیا چنانچہ اردو جہاں پیدا ہوئی تھی وہیں اسے دیش نکالا دیا گیا۔ وہ دور اردو زبان و ادب کے لیے بڑے ابتلا کا دور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو بولنے والوں کی دو نسلیں اردو زبان و ادب کے پڑھنے اور لکھنے سے نابلد رہ گئیں۔ وہ لوگ روزمرہ کے کام تو اردو زبان میں سرانجام دیتے تھے بلکہ اپنی گفتگو میں ایک آدھ اشعار بھی بولتے تھے مگر اردو زبان و ادب سے نابلد تھے۔ اس کا اثر آج دیکھنے کو مل رہا ہے۔ نئی نسل اردو زبان و ادب سے دور ہوگئی ہے۔ ایک واقعہ سنیے۔ میں نے اپنے بچوں کو اسکول اور کالج میں آئی ایس سی تک اردو خود پڑھائی تھی اور وہ سب اردو پڑھنے اور لکھنے میں درک رکھتے تھے مگر جیسے ہی ان کا داخلہ انجینئرنگ کالجز میں ہوا وہ خطوط انگریزی میں لکھنے لگے۔ میں نے ان کی والدہ سے اس بات کو کہا غالباً انھوں نے یہ بات ان سے کہی جواب جو ملا وہ بہت افسوس ناک تھا۔ انھوں نے کہا کہ والد صاحب۔ اردو کے پروفیسر ہیں۔ کیسی ہی زبان میں خط لکھوں گا وہ ایک آدھ غلطی ضرور نکال دیں گے۔ اس کی جگہ پر انگریزی میں لکھتا ہوں کہ اس میں سب چلتا ہے۔ سب چلنے کے معاملے میں اردو بہت سخت گیر ہے۔ جب بڑے بڑے شعرا وادبا زبان و بیان کی غلطیوں سے نہیں بچ سکے تو ہما شما کس شمار میں ہیں۔ بہت پہلے داغ نے کہا ہے:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اردو کو انگریزی کی طرح لچکدار اور آسان ہونا ہوگا کہ لوگ با آسانی سے اپنا مدعا اس زبان میں ظاہر کرسکیں گویا اس کو خواص کی جماعت سے باہر آکر عوام کی زندگی سے قریب ہونا ہوگا۔ ویسے بھی زبان تو وہی پیاری ہوتی ہے جو عام بول چال کی ہوتی ہے۔ معرب، مفرس اور قواعد کی زنجیروں میں جکڑی زبان کتابوں کی زینت ہوتی ہے جب کہ عام بول چال کی زبان عوام کے ساتھ کھیت کھلیانوں میں ہاٹ بازاروں میں دوڑتی پھرتی ہے اور روزمرہ کے کام سرانجام دیتی ہے۔ اس میں بڑی زندگی ہوتی ہے وہ خشک نہیں ہوتی بلکہ نیرنگ ہوتی ہے۔ گیان چند جین نے اردو اور ہندی کے تعلق سے لکھتے ہوئے بہت درست لکھا ہے کہ:

''ہندی اور اردو کے مزاج اور روایت میں بڑا فرق یہ ہے کہ اردو میں ہر لفظ کا تلفظ اور املا اور جنس مقرر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور صرف اسی کو فصیح مانا جاتا ہے جب کہ ہندی میں بہت لچک ہے۔'' (ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب: گیان چند جین، ص29-28)

تلفظ، املا اور جنس کے مسئلوں سے اردو کے دامن کو یکسر پاک کرنا تو مشکل ہے مگر انھیں زیادہ سہل اور آسان تو کیا ہی جاسکتا ہے۔ بدلتے حالات میں بہت سے سبک اور دلکش الفاظ جو اگرچہ ہندی کے ہیں انھیں اردو میں خوشی خوشی جگہ دے دیں اور فراخ دلی سے قبول کرلیں تو دامن اردو وسیع تر ہوگا اور آج کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوگی۔ ہندی والے یہ کام بہت دھڑلے سے کررہے ہیں۔ ہندی کا کوئی رسالہ اٹھالیجیے اس میں اردو کے بیشتر الفاظ مل جائیں گے اگرچہ بعض کے املا اور جنس میں فرق ضرور ملتا ہے مگر وہ بہت خوبصورتی سے استعمال ہورہے ہیں اور ہندی زبان و ادب کا حصہ ہورہے ہیں۔ مجھے تو خوف ہے کہ رسم الخط کے علاوہ باقی سب کچھ ہندی والے اردو کا اپنی زبان میں منتقل کرلیں گے۔ ایسے بہت سے ادیب و شاعر ہیں جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنی فنکاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ابتدا میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ اس صورت حال میں نئی نسل اردو رسم الخط سے بیگانہ ہوکر بھی اردو زبان جاننے کا دعویٰ کرے گی تو آپ کیا کریں گے؟ کسی بھی زبان کی زندگی میں ایسے کڑے وقت آتے ہیں۔ آخر سنسکرت جو ایک عرصہ دراز تک ہندوستان کی تہذیبی، ادبی اور سرکاری زبان تھی کیونکر بہت سی ہند آریائی زبانوں میں منقسم ہوگئی۔ میری باتوں کو سہل مت لیجیے بلکہ سنجیدگی سے اس پر غور فرمایئے اور وقت رہتے سدباب کیجیے ورنہ دیر ہوجائے گی اور کچھ کرتے نہیں بنے گا۔

دراصل فی زمانہ جو تہذیب ہے وہ اپنی حدود سے باہر نکل کر بین الاقوامی ہورہی ہے۔ دعا، سلام، پرنام اور آشیرواد کو ترک کرکے 'ہائے ہلو' ہورہی ہے۔ اس صورت حال میں بندھ باندھ کر نہ تو تہذیب کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور نہ نئی نسل کو۔ تہذیب کے تانے بانے بدل رہے ہیں تو زبان کو بھی بدلنا ہوگا کیونکہ تہذیب کی ہر تبدیلی زبان کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی زبان کا فرض اولین ہے کہ وہ اپنے بولنے والوں کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرے چنانچہ آج وہی ہورہا ہے۔ نئی نسل کا کام اردو زبان سے نہیں نکل رہا ہے تو وہ دوسری زبانوں

> **سوال یہ ہے کہ نئی نسل کون ہے کیونکہ ہر 'نیا' دوسرے لمحے میں 'پرانا' ہوجاتا ہے... مطالعے کی سہولت کے لیے ہم فرض کرلیں کہ ابھی جو نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ نئی نسل ہے تو ابھی جو نسل تعلیم و تدریس میں لگی ہوئی ہے اور شعر و ادب کا ذوق رکھتی ہے وہ نئی نسل قرار پائے گی۔**

کی طرف مائل ہورہے ہیں اور اس طرح ان کی اس زبان سے دوری بڑھ رہی ہے۔ اردو زبان و ادب سے نئی نسل کی بڑھتی دوری کا ایک خوبصورت منظر اردو کی مایہ ناز فکشن نگار قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول 'کار جہاں دراز ہے' میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نئی نسل پر انگریزی کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ اردو کے نامی گرامی شعرا و ادبا کے نام بھی انگریزی زبان کے توسط سے یاد رکھیں گے۔ مثلاً فراق گورکھپوری کو Autama گورکھپوری، جگر مرادآبادی کو lever مرادآبادی اور دل شاہجہاں پوری کو Heart شاہجہاں پوری کہیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اردو جس گنگا جمنی تہذیب میں پروان چڑھی تھی وہ اس سے چھن گئی ہے۔ مغلوں نے ہندوستان کو تین نایاب تحفے دیے تھے (1) اردو (2) تاج محل اور (3) لال قلعہ۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ تحفے گرد آلود ہورہے ہیں اور Pollution کا شکار ہیں۔ ان کا فطری حسن کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ دلی جو اردو شعرا و ادبا کا گہوارہ تھی اور معیاری و ٹکسالی اردو کے لیے مشہور تھی آج وہاں پنجابیوں اور ہریانویوں کا قبضہ ہے اور پنجابی و ہریانوی زبان کا غلبہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں غالب کی آرام گاہ کا پتہ بتانے والے بھی خال خال رہ جائیں گے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اردو تہذیب دم توڑ رہی ہے اور جب تہذیب دم توڑ رہی ہے تو اردو زبان کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

گیان چند جین نے لکھا ہے:

''دلی کا شملہ/اہل زبان اس دن سے سکڑنے لگا تھا جب انیسویں صدی کے وسط میں دلی کو دہلی کردیا گیا۔ رہی سہی کسر اس کے انگریزی تسمیے delhi نے پوری کردی۔

اب دہلی میں ہر طرف پنجابی بھرا پڑا ہے۔ غالب اور حسرت موہانی (غالباً اقبال کے خلاف تنقید ہمدرد کے نام سے لکھنے والے) اہل پنجاب کی اردو کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اب آپ اردو کی قبر تلاش کرنے کے لیے چتلی قبر جائیں اور رکشہ یا اسکوٹر والے کو خود کو پوتڑوں کا اردو والا ثابت کرنے کے لیے قبر کو 'ب' ساکن سے بولیں تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ پردیسی مرغا ہے۔'' (ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب: گیان چند جین، ص36-35)

یعنی اگر دلی میں ٹکسالی اردو بولیں تو آپ غیر دلی والے ہوئے اور پردیسی مرغا ٹھہرے۔

(2) تدریسی اسباب: کسی زبان کے فروغ و بقا میں درس و تدریس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا مشہور قول ہے کہ استاد اپنے شاگردوں سے اور شاگرد اپنے استاد سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں درس و تدریس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ درجات ہر جگہ درس و تدریس کی بڑی اہمیت ہے۔ بہتر نصاب، بہتر کتابیں اور بہتر معلم و مدرس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا خصوصاً آج کے دور میں جب گلوبلائزیشن کے سائے میں ہم آپ جی رہے ہیں۔ ایک سے ایک نصاب کی کتابیں اور طریقہ تعلیم سمجھائے جارہے ہیں اور بہتر سے بہتر اساتذہ کی تلاش ہورہی ہے۔ اس پس منظر میں اردو کے نصاب، کتابیں اور طریقۂ تعلیم نیز اساتذہ پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یاران تیز گام بہت آگے نکل گئے ہیں اور ہم غبار راہ دیکھ رہے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ساری دنیا تجارتی منڈی ہوگئی ہے۔ ہر کام اور ہر چیز کو ایک ہی نظریے سے دیکھا جاتا ہے فائدہ نقصان کے نظریے سے۔ چنانچہ تعلیم و تدریس جیسے Noble Profession میں بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح کساد بازاری آگئی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس جن اداروں

میں ہوتی ہے ان کے پاس نہ تو شایانِ شان عمارت ہے، نہ معلم و مدرس اور نہ کتب و دیگر سہولتیں۔ ان کی حیثیت دوسرے مضامین کے مقابلے میں یتیم و یسیر کی ہے۔ جدید سہولتوں کا ذکر کرنا تو فضول اور بے کار محض ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید طریقہ تعلیم کا آغاز اردو کے درس و تدریس میں نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے نئے نئے آلۂ تعلیم اور ذریعہ تعلیم کا استعمال بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ہم وہی پرانے ڈھرے پر چل رہے ہیں۔ لکیر کے فقیر بن کر پرانے طریقہ تعلیم سے درس و تدریس کی انجام دہی کر رہے ہیں۔ یہ ذرائع فرسودہ ہو گئے ہیں اور نئے ذہن و دماغ کو نہ تو مائل کرتے ہیں اور نہ متاثر۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو کا کلاس انتہائی بورنگ ہوتا ہے۔ متعلم جیسے تیسے وقت گزاری کرتا ہے اور دوسرے مضامین کے کلاسوں کی طرف بھاگتا ہے۔ یہ کیفیت ابتدائی درجات سے اعلیٰ تعلیم کے درجات تک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس صورتِ حال میں اردو کے درس و تدریس کا جو حال ہونا ہے وہ بعید از قیاس ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو درس و تدریس کی بنیاد جو رکھی جاتی ہے وہ بہت کمزور اور کم ہوتی ہے۔ چنانچہ:

چوں معمار نہد بنیاد کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہی حال آج کے اردو زبان و ادب کے طالب علموں کا ہے۔ ان کی اردو زبان و ادب کی بنیادی تعلیم معیاری نہیں ہوتی اس لیے وہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درجات میں بھی کمزور رہ جاتے ہیں۔

اس سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ وہ دادیاں، نانیاں، خالائیں اور مائیں بھی نہیں جو بچوں کو کھیل کھیل میں کہہ مکرنیوں، قصوں، کہانیوں اور چٹکلوں کے ذریعے اپنے اسباق یاد کرادیتی تھیں جو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بچوں میں بیت بازی کا مقابلہ تو اب گویا مفقود ہی ہو گیا۔ یہ ایسے اسباق اور درس گاہیں تھیں جہاں شعر و ادب کے ذوق کی تربیت ہوتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ آج ہماری مائیں، خالائیں، اور دوسری بزرگ خواتین اس قدر مشغول ہو گئی ہیں کہ انھیں بچوں کا خیال ہی نہیں رہ گیا ہے اس وجہ سے اردو طلبا کے ذوق شعر و ادب کی تربیت نہیں ہو پاتی اور وہ اس زبان و ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ بچہ تین سال کا ہوا نہیں کہ اسے کسی اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرانے کی فکر دامن گیر ہو گئی جہاں اردو کے علاوہ ہر مضمون اور زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور جس میں اردو کی تعلیم دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ برائے نام ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ دینی مدارس جہاں ذریعہ تعلیم لازمی طور پر اردو ہے وہاں بھی اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہے۔ بعض مدارس کو چھوڑ کر جو سرکاری گرانٹ نہیں لیتے وہ مدارس بھی آج کے ماحول میں رنگے ہوئے ہیں۔ نہ اساتذہ مخلص ہیں اور نہ طلبا۔ یہاں کے فارغین اردو زبان و ادب میں طاق نہیں ہوتے بلکہ ان کی تعلیم ناپختہ ہوتی ہے۔

ان حالات میں نئی نسل اردو زبان و ادب سے قربت بڑھائے تو کیونکر بڑھائے اور کس لیے بڑھائے:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ یار

(3) معاشی اسباب: معاش کی اہمیت سب سے اہم ہے۔ کوئی بھی کام کرنے چلیے سب سے پہلے معاش کی فراہمی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اردو زبان و ادب کا جس دور میں آغاز و ارتقا ہوا وہ معاشی اعتبار سے فراوانی اور آسودہ حالی کا دور تھا۔ راجے، مہاراجے، نواب اور

بادشاہوں کے دربار میں اردو زبان و ادب کا آغاز و ارتقا ہوا جہاں وقت بے وقت مشاعرے برپا ہوتے تھے، محفل داستان گوئی منعقد ہوتی تھی۔ مگر آج وہ دور نہیں ہے۔ نہ کوئی رجواڑہ ہے اور نہ کوئی سلطنت جو اردو زبان و ادب کی سرپرستی کرے۔ لے دے کر ریاستی اور مرکزی حکومتیں ہیں جو ووٹ بینک کے طور پر اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے اکادمیوں اور دوسرے اداروں کو سالانہ گرانٹ مہیا کراتی ہیں جو اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مصداق ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فن اور فنکاری کبھی کسبِ معاش کا ذریعہ نہیں ہو سکتے مگر اس کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔

چنانچہ اردو زبان و ادب کے طلبا فارغ التحصیل ہو کر اپنے کو بے یار و مددگار سمجھتے ہیں۔ میں جب فارسی زبان و ادب کا متعلم تھا دوسرے مضامین کے متعلم جو میرے احباب تھے مذاق مذاق میں کہتے تھے کہ ابھی تم نصف ایم اے کی پڑھائی کر رہے ہو مکمل ایم اے اس وقت ہو گے جب اردو میں ایم اے کرو گے۔ ایسا کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اردو کی پڑھائی بہار یونیورسٹی اور کالجوں میں فارسی کے ساتھ ہوا کرتی تھی اور دونوں مضامین کو ملا کر اردو و فارسی کا شعبہ ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اس وقت کے مقابلے میں آج اردو والوں کے لیے ملازمتیں بڑھی ضرور ہیں مگر سائنس اور ٹکنالوجی کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ طلبا سائنس اور ٹکنالوجی میں ڈگری ڈپلوما لے کر بہت جلد کام سے لگ جاتے ہیں اور کام کے ہو جاتے ہیں جب کہ شعر و ادب اور وہ بھی اردو شعر و ادب کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پاکر بے کار رہتے ہیں۔ جب کہ اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد برسوں معاش کے حصول میں خاک چھاننی پڑتی ہے۔ موجودہ نسل کے پاس نہ تو صبر و سکون ہے اور نہ انتظار کرنے کی قوت۔ وہ ہر عمل کا فوراً نتیجہ چاہتے ہیں وہ حضرت ایوب نہیں ہیں۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا

خم سے جام تک آنے کا عرصہ بہت طول طویل ہے اس لیے وہ Professional Courses کر کے جلد از جلد کام سے لگ جاتے ہیں اور کام کے ہو جاتے ہیں۔ بالفرض خم کے آنے اور خم سے مئے مقصود کو جام تک آنے کی ہمت کوئی جٹائے بھی تو اس بات کی ضمانت کہاں ہے کہ تعلیم مکمل کر کے برسرِ روزگار ہو جائے گا اور کام کا آدمی ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف اندیشہ غالب ہے کہ بقول حضرت غالب اردو زبان و ادب سے عشق کر کے وہ نکما ہو جائے:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حق بات یہ ہے کہ آج کی نسل نکمی ہونے کو تیار نہیں ہے بلکہ وہ اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہے۔ اس وجہ سے اردو زبان و ادب سے اس کی دوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تعلیم وہی لے رہے ہیں جو تعلیمی میدان میں پچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے نئی نسل کو اردو زبان و ادب سے قریب کرنا ہے تو پرانے نصاب کو کھنگالنا ہوگا اور اس کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور ایسے نصاب تیار کرنے ہوں گے جو نئی نسل کو attract کر سکیں اور ان کے carrier building میں معاون ہوں ورنہ ہم یوں ہی نئی نسل کی اردو زبان و ادب سے دوری کا رونا روتے رہیں گے اور وہ دور ہوتے جائیں گے۔

■

Prof. Abdul Wasey, B.R. Ambedkar Bihar University, Mozaffarpur - 842001 (Bihar)

مختار ٹونکی

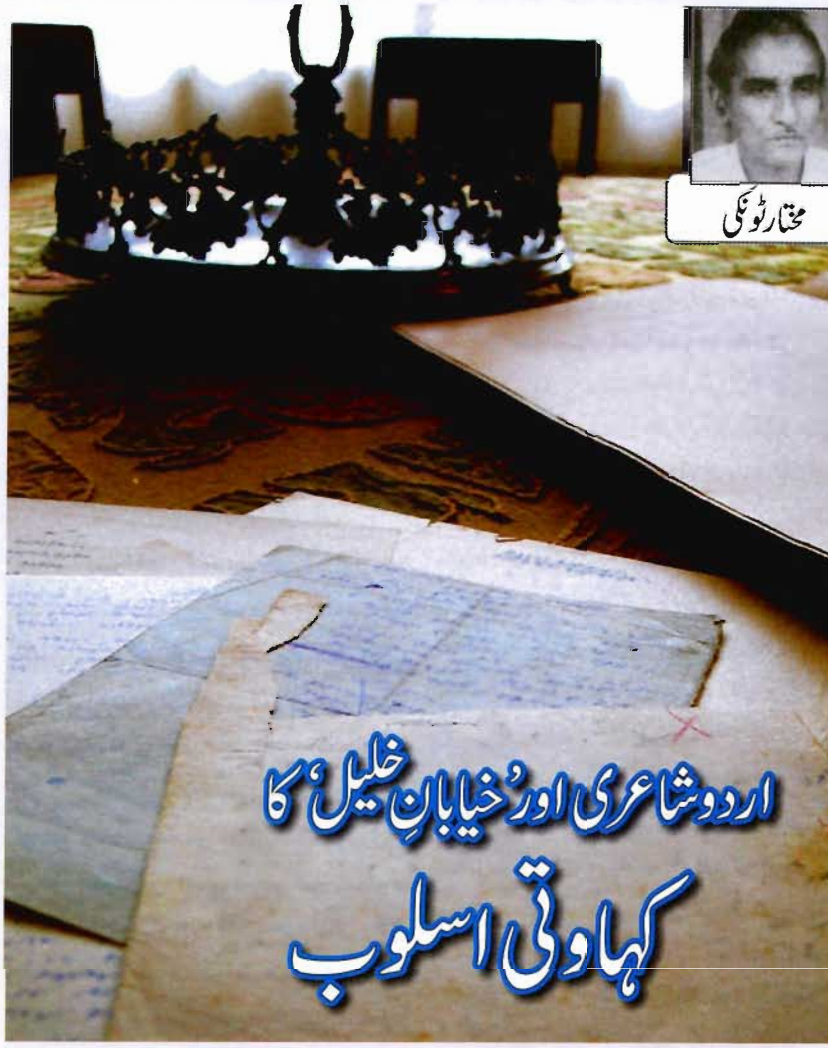

اردو شاعری اور 'خیابانِ خلیل' کا
کہاوتی اسلوب

بالعموم دنیا کی ہر زبان میں کم سے کم الفاظ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معانی کو دل نشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ رائج ہے جسے ضرب المثل یا کہاوت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو زبان ایک ثروت مند زبان ہے اور اپنی گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے اس کو کوئی دیگر السنہ پر تفوق حاصل ہے۔ اردو کے روزمرہ، محاورے اور ضرب الامثال کی تشریح وتوضیح کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اگر ہم اردو شعروادب کے اوراقِ پارینہ کو اٹھا کر دیکھیں تو چاہے نثر ہو یا نظم محاورے اپنی لفظی ومعنوی دلکشی و خوبصورتی سے رمز و کنایہ کا ایک گلستانِ معنی کھلاتے نظر آئیں گے اور کہاوتیں اپنی جامعیت ومعنویت سے قوس قزحی رنگینیاں بکھیرتی دکھائی دیں گی۔ فی الواقع اردو زبان کے محاوراتی اور کہاوتی اسلوب نے شعر و ادب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ محاوارت کیا ہیں؟ زبان کے اعجاز و ایجاز کا مرقع ہیں اور کہاوتیں تشبیہ و تمثیل اور مجاز و مبالغے کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ اَن گنت ایسے محاورات ہیں اور بے شمار ایسی ضرب لامثال ہیں جن کے بولنے والے اور سمجھنے والے اب نہیں رہے مگر زبان کا ذوق وشوق رکھنے والے 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' جیسے ادبی شہ پاروں نیز شعرائے متقدمین کے کلام بلاغت نظام سے بخوبی استفادہ کر کے حظ ونشاط وکیف وسرور حاصل کر سکتے ہیں:

یک قصہ زعشق ہیر گفتم
افسانۂ دل پذیر گفتم

ہمارے زمانے میں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال شعرا کے اشعار میں شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اردو زبان کے ہر دور میں ان کی مدد سے شعرائے کرام نے ابلاغ واظہار کے کمالات دکھائے ہیں اور اس طرح زبان وبیان کے جادو جگائے ہیں۔ گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را کے بطور یہاں کچھ محاوروں کی مثالیں درج کی جاتی ہیں:

خوباں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سوں
دل سرد ہوگیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
(آبرو)

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
(میر)

ہر چند ہوں آئینہ پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں
تردامنی پر شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(درد)

نہ چھیڑا اے نکہتِ بادبہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
(انشا)

مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دیے
صیاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا
(آتش)

تریاق کیا کرے کہ یہاں زہر چڑھ چکا
کام اتنا کر چکے تری زلف دوتا کے سانپ
(نسیم دہلوی)

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں
(انیس)

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل کا دل ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
خدا قیدِ غم سے شتابی نکالے
پڑے اپنے جینے کے اب ہم کو لالے
مُشکیں زلفوں سے مُشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

اسی طرح کہاوتوں نے بھی کلام میں در آ کر معنی ومفہوم کو بلندیاں عطا کی ہیں اور شعر کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ مثلاً:

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا
(ذوق)

ہوگیا ابرو کی سفاکی سے شہرہ یار کا
کام کرجائے سپاہی نام ہو تلوار کا
(قدر)

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر
(نصیر دہلوی)

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

تاہم یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اشعار میں محاوروں کا برمحل استعمال اور ضرب الامثال میں رنگینیِ خیال کا کمال صرف فردات میں یہاں وہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ باقاعدہ اور بالارادہ کسی شاعر نے بطور خاص کہاوتی اسلوب کو کثرت سے نہیں اپنایا مگر اس خوبصورت اسلوب کو پروان چڑھانے اور مقبول بنانے میں فرماں روائے ریاست ٹونک نواب ابراہیم علی خاں خلیل (1868-1931) کو ہر طرح امتیاز اور فوقیت حاصل ہے۔ اپنے 63 سالہ بھرے پرے شاندار دور حکومت میں جہاں نواب صاحب نے ریاستی نظم ونسق کے انتظام و انصرام میں کارہائے نمایاں انجام دیے وہیں شعر و ادب کی ترقی میں بطرز احسن نمایاں خدمات سے بہرہ ور کیا۔ نواب صاحب چونکہ خود بھی شاعر تھے اور شعر وسخن کو دیوانگی کی حد تک پسند کرتے تھے اس لیے انھوں نے ادب نوازی، شعرا کی قدرافزائی اور سخن پروری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اسد لکھنوی، ظہیر دہلوی، مضطر خیرآبادی، بسمل خیرآبادی وغیرہ جیسے بہت سے اساتذۂ سخن ان کے دربار سے وابستہ تھے اور اچھے مشاہرے پاتے تھے۔ نواب ابراہیم علی خاں خلیل کا زبردست شعری کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کہاوتوں پر مشتمل ایک مکمل ردیف وار دیوان کی ضخیم جلد تیار کی تھی جس میں اس نوعیت کی غزلیں، نظمیں، مخمس، مسدس ایک دونہیں، دس بیس نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسی ضمن میں معلوم ہو کہ آج سے پچاسی چھیاسی سال پہلے 1345 ہجری اس قسم کے کلام کا ایک مختصر حصہ 'خیابانِ خلیل' کے عنوان سے شائع کرایا تھا جس کو کہاوتی اسلوب کے دل آویز پھولوں کا نظر فریب گلدستہ کلام الملوک جواہر کلام کا ایک ایک خریطہ کہنا ہی مناسب نہیں ہے بلکہ اردو شعریات کی تاریخ میں ایک زبردست و دل چسپ اضافہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ افسوس کہ ناقدانِ فن نے اس نادر شعری کارنامے پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ شاعر کا منصب و مقام بھی ہنوز تشنۂ تعین ہے۔

'خیابانِ خلیل' میں کہاوتوں کے برمحل استعمال اور شاعر کے ندرتِ خیال نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں، سطورِ ذیل میں چند کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

1. تین میں نہ تیرہ میں

اگر شمار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تیرہ کا عدد کامل اور تین کا عدد ناقص ہے۔ محل مذکور میں اس کے استعمال سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت فضول ہے اور کسی مد میں وہ شمار و لحاظ کے قابل نہیں۔ ناقص اور کامل کا کوئی اطلاق بھی اس پر روا نہیں ہوسکتا۔ شاعر نے غزل کی ہیئت میں دس اشعار کہے ہیں اور اس کہاوت کو منظوم کیا ہے۔ تین شعر ملاحظہ ہوں:

دل کا کیا تین میں نہ تیرہ میں
آگیا تین میں نہ تیرہ میں
قصۂ دل کو جب سنا یہ کہا
سن لیا تین میں نہ تیرہ میں
ہم تو ہیں پانچویں سواروں میں
تیرا کیا تین میں نہ تیرہ میں

نواب ابراہیم علی خاں خلیل کا زبردست شعری کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کہاوتوں پر مشتمل ایک مکمل ردیف وار دیوان کی ضخیم جلد تیار کی تھی جس میں اس نوعیت کی غزلیں، نظمیں، مخمس، مسدس ایک دو نہیں، دس بیس نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسی ضمن میں معلوم ہو کہ آج سے پچاسی چھیاسی سال پہلے 1345 ھجری اس قسم کے کلام کا ایک مختصر حصہ 'خیابان خلیل' کے عنوان سے شائع کرایا تھا

2. گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

وقت زمانہ کا دوسرا نام ہے۔ اس کے وجود کا ظہور اور عدم کے ورود کے مابین سکون کا کوئی لمحہ نہیں، اسی کیفیت کا سبب ہے کہ وقت جاتا ہے تو پھر اس لیے نہیں آتا کہ معدوم کا اعادہ نہیں ہوتا اور یہ گرفت میں بھی نہیں آتا کیونکہ اس کی کوئی جسیمی حیثیت نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک مشہور مقولہ ہے جو بطور ضرب المثل کے زبان زد ہوگیا ہے۔ بہرکیف اس سے قدرِ وقت کی ترغیب ملتی ہے۔ میر حسن دہلوی کا مشہور مطلع ہے:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

نواب ابراہیم خاں خلیل نے اس ضرب المثل کے پامال مضمون کو مخمس کی شکل میں کئی بندوں میں باندھا ہے اور اپنے پیرایۂ بیان کی دل آویزی سے لطیف جذبات کو نت نئے ڈھنگ سے اجاگر کیا ہے۔ صرف دو بندوں سے شاعر کی جودتِ فکر کا اندازہ ہو جائے گا

نہ پائی جو وہ صورتِ دل ربا — کہا آئینہ کچھ ہے بگڑا ہوا
خدا جانے پھر کیا خیال آگیا — بغور اپنی صورت کو دیکھا کہا
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
بہت حرص میں ہے گرفتار تو — جھک اُسکی طرف ہے جو ہشیار تو
کھڑا ہوگا کل پیش داوار تو — نہ کھو ایک دم اپنا بیکار تو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

3. سو سنار کی ایک لوہار کی

سونے اور لوہے کی دھاتوں میں سختی اور نرمی کے اعتبار سے جو فرق ہے وہی سنار اور لوہار کے آلات کی ساخت میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سنار کے سبک اور نازک آلات کی ضرب کی بہ نسبت لوہار کے گراں اور سخت آلات کی چوٹ کا اثر زیادہ شدید ہوتا ہے۔ واقعہ معمولی ہے اور ضرب المثل کا مضمون بھی خشک اور بے رنگ ہے لیکن شاعر نے اپنی وسعتِ خیال کی رنگینی اور فکر رسا کی شادابی سے اس کہاوت کو بھی تنوع کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ دو بندوں کی بانگی ملاحظہ ہو:

وحشی ترا جو سوئے گلستاں کبھی گیا
اک آہ میں پپیہے کی پی کی گئی صدا
فریاد کی تو سکتہ سا قمری کو ہوگیا
اک نالہ نغمہ ہائے عنادل کو لے اڑا
سچ ہے کہ سو سنار کی اوراک لوہار کی
کرکے اسیرِ دامِ مصیبت میں خود پھنسا
ٹھہرایا دل کو اپنے مگر کچھ نہ ہوسکا
آیا جو تیر آہ تو سنبھلا نہ پھر ذرا
صیاد سن کے گر پڑا نخچیر کی صدا
سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لوہار کی

4. لینا ایک نہ دینا دو

جب صورت حال یہ ہو کہ بحث و تکرار میں دو فریق آپس میں مقابل ہوں اور انجام کار بحث وتمحیص سے کوئی خاطر خواہ اور فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہو۔ تضیع اوقات کو مدنظر رکھتے ہوئے بحث کا خاتمہ اس ضرب المثل کے استعمال سے کیا جاتا ہے۔ مدعا اس سے یہ ہوتا ہے کہ اب آگے بحث تحصیل حاصل ہے اس ضمن میں غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

شمار جو رہے بیکار لینا ایک نہ دینا دو
بڑھے گی مفت میں تکرار لینا ایک نہ دینا دو
نہ بیٹھو روٹھ کر، من جاؤ، غصہ تھوک دو بولو
بنے ہو، ہوکے گل کیوں خار لینا ایک نہ دینا دو

ستم گر تیری چاہت سے، جفا جو تیری الفت سے
کریں کیوں اب نہ ہم انکار لینا ایک نہ دینا دو

5. جیسا دیس ویسا بھیس

ضرب المثل کا مضمون صریح لفظوں میں بتاتا ہے کہ انسان جس ملک میں مقیم ہو، وہاں کی تہذیب و معاشرت کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیے۔ لباس و پوشاک تو ایک استعارہ ہے وہ اپنے افعال میں بھی نئے ماحول کو مدنظر رکھے۔ شاعر نے اس پامال ضرب المثل کو اپنی فکر کی بالیدگی اور شعری توانائی سے وسعت دے کر مختلف ڈھنگ سے کئی بندوں میں منظوم کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ تین بندوں میں ندرتِ خیال کی جلوہ گری دیکھیے:

یہاں یہ وصف ہے بے جوڑ، کر صیاد کی تعریف
اب اپنا منہ اُدھر سے موڑ، کر صیاد کی تعریف
چمن کی رشتہ داری توڑ، کر صیاد کی تعریف
قفس میں یادِ گل کو چھوڑ، کر صیاد کی تعریف
سمجھ اے بلبلِ ناشاد، جیسا دیس ویسا بھیس

ترا عاشق گیا جو دشت میں کل جوش وحشت سے
جو دیکھا اس کے حلیے کو ڈرے چیتے، ہرن چمکے
اُدھر وہ تھے اِدھر یہ تھا پریشاں، کیا کہے کس سے
کہا یوں خارِ صحرا نے اڑا کر ٹکڑے دامن کے
تنِ عریاں مبارکباد، جیسا دیس ویسا بھیس

جلا کر اپنے دل کو موم سے اس سنگ کو بدلا
بنایا سرخ رو اس روسیہ کے ڈھنگ کو بدلا
کیا شفاف اس کو اور اس کے زنگ کو بدلا
خلیل اس آتشِ سوزاں نے اس کے رنگ کو بدلا
کہ انگارہ بنا فولاد، جیسا دیس ویسا بھیس

مشتے نمونہ ازخرمن سے یہ تو بخوبی واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی فکر جمیل سے ضرب الامثال میں رعنائیاں بکھیر دی ہیں اور شعریات کو ایک نئی اور قابل قدر جہت سے آشنا کیا ہے۔ بے رنگ کہاوتوں یعنی اتری ہوئی مہندی میں اور سوکھے ہوئے پھولوں میں رنگ و بو پیدا کرنا مشکل ہے مگر اندازِ بیان میں رعنائی ہو، علوئے خیال میں جاذبیت ہو اور طرزِ ادا میں ندرتِ حسن ہو تو صفحۂ قرطاس پر بھی گلہائے رنگارنگ اپنی بہار دکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح کے کلام معجز نظام کی چند اور مثالیں بغیر کسی تمہید و تبصرہ کے ملاحظہ ہوں:

(1)
آئینہ جب کبھی وہ دیکھتے تھے — وہم ہوتا تھا یہ ضرور مجھے
آج آیا وہ اس طرح آگے — اپنی تصویر چوم کر بولے
پہلے خویش اور پیچھے ہے درویش

(2)
تلاشِ دل پر ایسے کیوں وہ بگڑے
مگر کیا چور کی داڑھی میں تنکا

(3)
اپنی اپنی آدمیت ہے ہمارا حرج کیا
وہ ہمیں دشنام دیں او رہم کہیں بے شک بجا
وہ مثل ہے راؤلے کا تیل اور پلو میں جھیل

(4)
شائستگی ادب کو کبھی ہاتھ سے نہ دے
اک لفظ دل شکن نہ نکالے زبان سے
یہ کیا ہنسی کہ جس سے ہنسیں ہم، وہ رو پڑے
بیہودہ دل لگی ہے جو دل کو بری لگے
تہذیب کا مذاق ہے تہذیب کا کمال

(5)
زلف الجھا کر جو میرے سر ہو تم
آدمی ہو یا کہ گھن چکر ہو تم

(6)
وہ دعا سن کے دیتے ہیں دشنام
نیکی برباد اور گنہ لازم

(7)
لیجیے شباب اب ہو گیا رخصت اترا شحنہ مردک نام
شوق سے کیجے ترک محبت اترا شحنہ مردک نام

(8)
نہیں آتا سمجھ میں کوئی پہلو — کوئی کس طرح پائے اس پہ قابو
بلا کا حیلہ جو، مکار، بدخو — بیانِ شوق پر بے چین بابرو
براتِ عاشقاں برشاخ آہو

(9)
قمری نہ شور کر کہ قفس میں ہے عندلیب
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

(10)
کب تک کوئی تیرے پیچھے، سب سے الجھے سب سے بگاڑے
کوئی کہاں تک بات کو لیپے جیسی کرنی ویسی بھرنی

(11)
آنکھوں کے اس کے دو تل، دل لے کے یوں ہیں غافل
گویا کہ ان تلوں میں کچھ تیل ہی نہیں ہے

(12)
نہ سلجھی زلف تو غصے میں آکر
اڑائے آئینہ کے ٹکڑے یکسر
کہاں کا غصہ اترا ہے کہاں پر
پڑھا میں نے یہ مصرع کچھ چبا کر
طویلے کی بلا بندر کے سر ہے

راقم الحروف نے یہ چند منظوم مثالیں بغیر نظر انتخاب کے محض نمونے کے طور پر نقل کر دی ہیں وگرنہ:

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

کے مصداق شاعر کی جدت طبع نے لفظ و معنی کے نادر الوجود کرشمے دکھائے ہیں اور ایک ایک ضرب المثل کو گوناگوں طریقے سے اس طرح شعر بند کیا ہے کہ نفس مضمون دیکھ کر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے اور پھر لطفِ بیان نے یوں سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے کہ بے ساختہ احسنت و مرحبا کے الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ گنجینۂ نظمِ اردو کے ایسے جواہر ریزوں کو منظر عام پر لایا جائے تا کہ ان کی کرشمہ کاری سے جہانِ سخن وری میں اور راچار چاند لگ سکیں کیونکہ درباروں میں پلی بڑھی اردوئے معلیٰ اپنی آن بان کھو چکی، بیگماتی زبان قصۂ پارینہ بن گئی اور عوامی ریختہ کے زمانے بھی لد گئے:

چونکہ عمرت بُرد دیو فاضحہ
بے نمک باشد اعوذ و فاتحہ

■

Mukhtar Tonki, Kali Paltan Road, Pul Mohd. Khan, Tonk-304001 (Rajathan)

اسلم جمشید پوری

افسانچے کے خدوخال اور جدید اردو افسانچے میں عصری حسیت

افسانچہ، کیا ہے؟ پہلا افسانچہ کب تحریر ہوا؟ اردو میں افسانچے کا موجد کون؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات آج بھی اردو قارئین خصوصاً افسانہ پسند قارئین کے دماغ میں کلبلاتے رہتے ہیں۔ جب کہ عظیم راہی کی کتاب 'اردو میں افسانچہ کی روایت'، شاعر کا افسانچہ نمبر اور متعدد افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہی نہیں پیش لفظ، مقدمے اور مضامین کی شکل میں افسانچے کی روایت پر خاصی باتیں ہو چکی ہیں۔ افسانچہ کوئی صنف ہے یا نہیں؟ یہ سوال بھی اکثر گردش کرتا رہتا ہے۔ خاص طرح کی تحریریں صنف کا درجہ کب اختیار کرتی ہیں؟ افسانچہ اکادمی کے پہلے دو روزہ کل ہند سیمینار اور کانفرنس کے موقع پر ان سوالات کا جواب تلاشنا ضروری ہے۔

افسانچہ، کیا چھوٹے چھوٹے افسانوں کا ہی نام ہے؟ کیا منی افسانہ اور افسانچہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟ کیا حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دینے والی ہر مختصر تحریر کو افسانچہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا صرف اختصار ہی افسانے اور افسانچے کا امتیاز ہے؟ اگر افسانچہ ایک صنف ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی یا ضروری اجزا کیا ہیں؟ میرا خیال ہے افسانچہ کسی ایسی تحریر کو کہا جا سکتا ہے جس میں درج ذیل صفات پائی جاتی ہوں:

- کسی واقعے، حادثے یا معاملے کا وہ مختصر بیان جس میں قصہ پن موجود ہو۔
- سماج کی سچی تصویر کشی کرتا ہو۔
- حقیقت پر مبنی ہو۔

افسانچے کے خدوخال کے تعلق سے بھی ہمیں غور کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں بھی میری رائے ہے:

- نثری فن پارہ ہو، نظم نہ ہو۔
- کم از کم دو تین سطروں سے لے کر دو تین صفحات تک طویل ہو سکتا ہے۔

بعض حضرات کے ذہنوں میں ایک غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوگئی ہے کہ نثری نظم اور افسانچہ ایک جیسی ہیئت کی تحریریں ہیں۔ ایسا کہنا قطعی غلط ہے۔ نظم بہر حال نظم ہے کتنی ہی بے بحر اور نثری ہو جائے، نظمیہ رمق ضرور ہوتی ہے۔ افسانچے میں قصہ پن کا عنصر لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں میں کچھ مماثلتوں کے باوجود واضح امتیازات موجود ہیں۔

پہلا افسانچہ کب تحریر ہوا؟ اور اردو میں افسانچہ سب سے پہلے کس نے رقم کیا؟ یہ تحقیق طلب امر ہے۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانچے اب تک کی تحقیق کے مطابق، اردو افسانچے کی روایت میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے افسانچوں کا مجموعہ 'سیاہ حاشیے' 1948 میں شائع ہوا۔ سیاہ حاشیے کا زمانۂ تحریر ایک ڈیڑھ سال ہی رہا ہوگا۔ کیونکہ یہ سارے افسانچے 1947 کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات کا مظہر ہیں:

سوری (سعادت حسن منٹو)

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔ ازار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتاً کلمۂ تأسف نکل گیا۔ ''مشٹیک ہو گیا۔''

اس طرح اردو میں افسانچے کی عمر تقریباً 65 برس ہے۔ ابتدا کے بعد جوگندر پال، رتن سنگھ وغیرہ نے منٹو کی اس عظیم روایت کی پاسداری کی:

فاصلے (جوگندر پال)

''میں ان دنوں کئی بار اپنے راکٹ میں بیٹھ کر چاند تک ہو آیا ہوں۔ لیکن ایک موت ہو گئی دس قدم چل کر اپنے بھائی سے ملنے نہیں گیا۔''

مانک موتی(4) (رتن سنگھ)

''برلن کی دیوار ٹوٹنے پر مشرقی جرمنی میں رہ رہا ایک ہندوستانی، مغربی جرمنی میں رہ رہے پاکستانی سے اس جوش سے بغل گیر ہوا جیسے ان کے اپنے ملکوں کو تقسیم کرنے والی واہگھے کی دیوار ٹوٹ گئی ہو۔''

لیکن ایک لمبا وقفہ افسانچے کے اوپر ایسا گزرا جس نے افسانچے کو بطور صنف establish ہونے کے مقصد کو نقصان پہنچایا ہے۔ 80 کے آس پاس افسانچے کو تقویت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ دراصل 80 کے بعد کا عہد کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویب سائٹس اور دیگر انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ماس میڈیا کا عہد تھا۔ ہر شے اختصار کے لباس میں آگے بڑھنے لگی۔ افسانچے نے اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ موضوعات کی سطح پر زبردست تبدیلیاں آئیں۔ اب تک جو افسانچے لکھے جا رہے تھے ان میں فساد، بھوک، دھوکہ دہی، رشوت ستانی، جنسیت جیسے موضوعات تھے۔ لیکن اب نئے مسائل، انٹرنیٹ کی دوستی، فیس بک کے معاملات، ٹیلیفونک شادیاں اور طلاق، ہائی ٹیک مشینیں، کمپیوٹر کی اسکرین اور کلک کے سہارے زندگی کے بدلتے معیار نے افسانچے کے موضوعات کو یکسر بدل دیا۔ یہ ایسا عہد تھا جسے اردو افسانچے کے احیا کا زمانہ کہا جا سکتا ہے یا پھر جدید اردو افسانچے کا عہد بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں قدیم و جدید کئی نسلوں نے افسانچے کی آبیاری کی ہے۔ موجودہ عہد میں افسانچے کا مستقبل روشن ہے اور اب اسے صنف کا درجہ حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہاں ہمیں

افسانچہ نگاری کو، لطیفہ بازی بننے سے بچانا ہوگا اور یہ قصہ پن اور اختصار کی بنیادوں پر ہی ممکن ہے۔

افسانچے کے فروغ میں اردو رسائل کا بھی خاصا ہاتھ رہا ہے۔شمع، روبی، فلمی ستارے، گلفام جیسے فلمی رسائل، آج کل، شاعر، انشاء، سلگتی لکیریں، روشن ادب، بزم سہارا، صوبیہ، حرف آخر جیسے ادبی رسائل اور فلم ویکلی، گونج، تنویر ہفت روزہ اخبارات کے ساتھ متعدد روزناموں کے ضمیموں نے افسانچوں کو خوبصورت ڈھنگ سے شائع کر کے افسانچے کو مقبولیت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جدید اردو افسانچے میں عصری حسیت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو افسانچہ ہر عہد میں عصری حسیت کا غماز رہا ہے۔ ادھر جدید اردو افسانچے میں موضوعات کی بوقلمونی کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔بعض موضوعات تو انفرادیت لیے ہوئے ہیں اور بعض قدیم روایت کا احترام کررہے ہیں جب کہ موضوعات میں مماثلت بھی خاصی پائی جاتی ہے۔

'فساد' اردو افسانے کا اور افسانچے کا مشترکہ پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ فساد کے موضوع پر بے شمار افسانچے منظر عام پر آچکے ہیں۔خود سعادت حسن منٹو نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'سیاہ حاشیے' میں فساد کو موضوع بنایا ہے۔آج کا دور بھی فسادات، قتل و غارت گری اور ظلم وستم سے گزر رہا ہے۔ ہمارے متعدد افسانچہ نگاروں نے اس کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔نگار عظیم، دہلی (محافظ)، عبدالعزیز خاں، ممبئی (رشتہ)، اطہر مسعود خاں، رامپور (پیشگی شکریہ) وغیرہ افسانچے فساد کے مناظر کو زندہ کرتے ہیں۔ فسادات کا ہندوستان میں پس منظر مذہبی ہوتا ہے۔ مذہبی منافرت آج ہر جگہ اپنے پاؤں پسار رہی ہے۔ مذہبی جنون، انسانیت کو خاکستر کرنے پر تلا ہے۔ ہمارے متعدد افسانچہ نگاروں کے یہاں مذہبی جنون، مذہبی ڈھونگ اور مذہبی شناخت موضوع کے طور پر عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں۔ بشیر مالیر کوٹلوی (وارننگ)، عارف خورشید، اورنگ آباد (ایمان کی حرارت) شیما رضوی، لکھنؤ (کون ہے وہ)، سراج الدین فاروقی، ممبئی (نام)، نیاز اختر، جمشید پور (تصویر درد)، اسلم جمشید پوری، میرٹھ (مجھے معاف کرنا رام سنگھ)، اقبال حسن آزاد، مونگیر (لامکاں) وغیرہ نے اپنے افسانچوں میں ان موضوعات کا بہترین استعمال کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں پولیس کا ظالمانہ رویہ سب پر عیاں ہے۔خصوصاً فسادات کے زمانے میں پولیس کا مخصوص فرقے کے خلاف رویہ، کرشن بیتاب، جیند (علاج)، مظفر حنفی، دہلی (پاگل اور پولیس) سالک جمیل براڑ، مالیر کوٹلہ (دوسری جیب) کے افسانچے پولیس کے رویے پر طنز کرتے ہیں۔آج کے پر آشوب ماحول میں بے راہ روی کی شدت نے رشتوں کو داغدار کرنا شروع کردیا ہے۔ قدریں زوال پذیر ہورہی ہیں۔رشتے مشکوک ہوگئے ہیں۔ جوگندر پال، دہلی (فاصلے)، اشتیاق سعید، ممبئی (ابو نمبر ون)، انجم عثمانی، دہلی (آدمی) نذیر فتح پوری، پونہ (خون کا رشتہ)، شیخ رحمان آکولوی، اورنگ آباد (سمجھوتہ)، مہتاب عالم پرویز، جمشید پور (ایگریمنٹ) اس سلسلے کے عمدہ افسانچے ہیں۔ کرپشن آج کا تازہ ترین ایشو Issue ہے۔ ہمارے افسانچہ نگاروں نے اسے بخوبی موضوع بنایا ہے۔ رونق جمال، درگ (جھٹکا اور حلال)، اثر فاروقی، اورنگ آباد (ازل تا ابد) وریندر پٹواری، دہلی (چوہا) حسن نظامی کیرانی، جمشید پور (خوف) کے افسانچے رشوت اور کرپشن کو خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

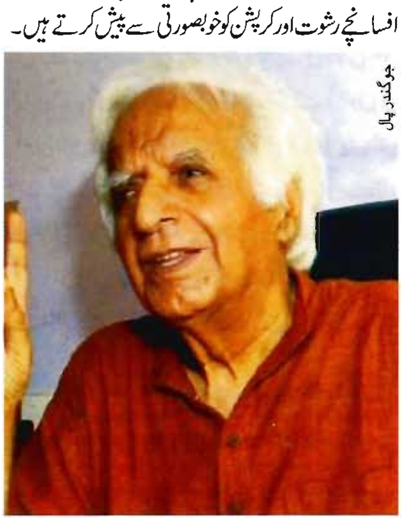

جوگندر پال

جنسیت بھی ہمارے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ خاص کر منٹو نے جنسیت کے کیچڑ میں کنول کھلانے کا بڑا کام کیا ہے۔ ہمارے متعدد جدید افسانچہ نگاروں نے جنسیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اشرف جہاں، پٹنہ (شرم کیوں)، ارشد منیم، مالیر کوٹلہ (ثبوت)، قمر قدیر ارم، مرادآباد (اپنی پیر)، اختر آزاد، جمشید پور (ایکسٹرا کوالی فیکیشن)، عباس خان، پاکستان (یوں) کے افسانچے ہمیں جھنجھوڑتے ہیں۔

جدید افسانچہ نگاروں میں متعدد ایسے ہیں جن کے یہاں موضوعات کی فراوانی ہے۔ دراصل موضوع کو فنی پختگی سے اختصار کے سانچے میں ڈھالنے پر اچھے افسانچے تخلیق ہوتے ہیں۔ بہت سے پرانے موضوعات کو ہمارے افسانچہ نگاروں نے نئے ڈھنگ سے افسانچہ کیا ہے اور نئے زمانے کے مسائل کو بھی موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً م ناگ، ممبئی نے زندگی کے تضاد کو گھٹن میں، بلند اقبال، امریکہ نے بھوک کو خدا کا بت میں اور محمود واجد، کراچی نے زندگی کی بے ثباتی کو لمحہ زندگی میں منظوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ طالب زیدی، میرٹھ نے تحیر کو شگون میں اور محمد طارق، کولہاپور نے تقلید میں رہبروں پر طنز کیا ہے۔ شان الحق حقی، کراچی نے بھوک کو کال چکر جب کہ ایم آئی ساجد، مہاراشٹر نے بھوکا میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ایم اے حق، رانچی نے Selfishness کو بے چینی میں اور مشتاق اعظمی، کلکتہ نے حرامزادے میں کنفیوژن کو پیش کیا ہے۔ عصری پیغمبر میں تنویر اختر رومانی، جمشید پور قیادت کے کرپشن اور معین الدین عثمانی، اورنگ آباد علاج میں کرپشن کو پیش کرتے ہیں۔ خورشید حیات، بلاس پور سماج کے مختلف رنگوں کو خبر ہونے تک میں، نورالحسنین، اورنگ آباد بناوٹ اور تصنع کو اطمینان میں، عظیم راہی، اورنگ آباد، غریبی کو نئے انداز میں زر مبادلہ میں اور زارا فراز جمشید پور، زندگی کے رنگوں کو حوا کی بیٹی میں سلیقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ شاداب علیم، میرٹھ 'انسان' میں انسان کو تلاش کررہی ہیں تو رتن سنگھ، نوئیڈا مانک موتی (4) میں جرمنی کی دیوار ٹوٹنے میں ہندوستان اور پاکستان کے انضمام کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ریحانہ سلطانہ، نوئیڈا ادھوراپن میں گونگے بیٹے کی ماں بننے کا درد سمیٹ رہی ہیں تو طاہر انجم صدیقی، مالیگاؤں 'کمال' میں انتقام کو لفظوں کا جامہ دے رہے ہیں۔ ذکیہ ظفر دہلی 'عیدی' میں ظلم وستم کا دردناک منظر نامہ ترتیب دے رہی ہیں تو مہ جبیں نجم، میسور 'وہ بوڑھا' میں جذبہ خودداری بیدار کررہی ہیں۔ نسیم محمد جان، موتیہاری ایک پرانی کہانی میں 'ہاتھی چلتا ہے کتے بھونکتے ہیں' کو ثابت کررہے ہیں۔ مبینہ امام، دہلی 'جرم' میں غنڈہ گردی کی نئی عبارت تحریر کررہی ہیں۔

جدید افسانچے میں موضوع کی سطح پر خوش آئند توسیع ملتی ہے۔ فنی پختگی اور قصہ پن کا جہاں تک تعلق ہے۔ ادھر عمدہ افسانچے منظر عام پر آرہے ہیں۔ لیکن بعض لطیفے بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر افسانچہ لکھنا بعض حضرات کی نظر میں بہت آسان کام ہے جب کہ افسانچہ لکھنا مشکل کام ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جو طویل افسانے اور مختصر افسانے بخوبی لکھ سکتا ہو اور فن افسانہ نگاری سے کما حقہٗ واقف ہو۔ افسانچہ لکھنا کوزے میں سمندر سمونے کے مصداق ہے۔

آخر میں ایک مشورہ یہ زمانہ افسانچہ کا تعمیری دور ہے، ایسے میں ضرورت ہے کہ ہم اپنے فن سے اس کی آبیاری کریں اور اسے مضبوط و مستحکم صنف کے طور پر ادب میں establish کریں۔

Dr. Aslam Jamshedpuri, HOD, Urdu, CCS University, Meerut - 250006 (UP)

عبدالرشید خان

اردو ادب میں کتے کا علامتی استعمال

دنیا بھر کے قلمکاروں نے قلم کی نزاکت سے کیا کیا حسین پیکر تراشے ہیں جن میں بلا کی جاذبیت اور دل کشی پائی جاتی ہے ان کی گنتی کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مُردہ پتھروں کو بات کرنے کی جرأت بخشنا اور بے حس پہاڑوں کو غلغلہ بپا کرنے کی طاقت عطا کرنا قلم کی ہی کرشمہ سازی ہے۔ حیوانوں کو شخصایا گیا ہے اور اعلیٰ قسم کے اخلاقی درس دینے میں اُن سے قابلِ قدر مدد لی گئی جس کی مثال منشی پریم چند کی مشہور کہانی 'دو بیل' میں ملتی ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر فریدالدین عطار نے بھی اپنے صوفیانہ اور عالمانہ خیالات کو عام مخلوق تک پہنچانے کے لیے 'منطق الطیر' میں جانوروں کی ایک خاص تعداد کو شامل کیا ہے اور اسی طرح نصراللہ منشی نے بھی 'کلیلہ و دمنہ' میں دو گیدڑوں کا سہارا لے کر عقلمندی اور دانائی کی حیران کن کہانیاں تحریر کی ہیں۔

یوں تو ادیبوں نے اکثر و بیشتر جانوروں اور حیوانوں کو بطور علامتی کردار ادبی تخلیقات میں برتا ہے لیکن جہاں تک 'کُتے' کی علامتی اہمیت کا تعلق ہے اس کا سہارا تقریباً ہر ادب کے قلم کار نے لیا ہے اور اسی عام استعمال کی بنا پر کتے کو ادب کا common character کہا جاسکتا ہے۔ کتا اگرچہ انسانوں کی نظر میں ایک حقیر حیوان شمار کیا جاتا ہے لیکن موجودہ صنعتی اور سائنسی دور کے پراگندہ ذہن انسان کے دِل بہلائی کے لیے یہی حقیر وجود ایک نمایاں اور اہم رول ادا کرتا ہے۔ فلمی دنیا میں کتے کی اداکاری ایک خاص انفرادیت کی حامل ہے۔ بعض فلموں کی شہرت اور مقبولیت کے پس منظر میں کتا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سرکس کے تعجب انگیز کھیلوں میں کتے کے کرتب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ملکی دفاع یعنی افواج میں بھی کتا ایک اہم مقام رکھتا ہے دشمنوں کی کھوج، ان کے ساتھ مقابلہ اور دیگر جنگی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لیے اُس کی پوری تربیت کی جاتی ہے اور اسی لحاظ سے اس کو بھی مختلف مراتب سے نوازا جاتا ہے۔

ادیبوں نے کتے کی حرکات و سکنات کو انسانیت کے اہم مدارج اور محاسن سے تطبیق کی ہے۔ 'ام الکتاب' قرآنِ مجید میں چرند و پرند کا ذکر ملتا ہے اس میں مذکور 'اصحاب کہف' میں کتا ایک اہم کردار ہے جو برابر سیکڑوں سال تک غار میں چھپے اصحاب کا ساتھ دے کر وفاداری کی علامت اور تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ Gardiner کے ایک اہم ادبی مضمون 'All about a Dog' میں کتا ہی وجہ تحریر بن جاتا ہے اس میں مضمون نگار بس میں سوار مسافروں کی ان پریشانیوں اور تکالیف پر افسوس کرتا ہے جو بس کنڈکٹر قانون کا غلط اور بے جا استعمال کرنے سے پیدا کرتا ہے۔ فارسی ادب میں چوٹی کے شاعروں نے اپنے گراں قدر کلام میں کتے کا ذکر بالواسطہ یا بلاواسطہ کیا ہے۔ سعدی شیرازی، مولانا رومی، حافظ شیرازی اور دوسرے اعلیٰ پایے کے شاعروں نے کتے کا سہارا لے کر شاعری میں پند و نصائح کے ذخیرے جمع کیے ہیں۔ سعدی نے بعض اشعار میں کتے کو اعلیٰ صفات کا حامل ہونے کی بنا پر اُس بنی نوع انسان سے ہزار گنا بہتر قرار دیا ہے، جو شکل و صورت کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود بھی انسانی خصائل سے محروم ہے۔ کسی شاعر نے یہاں تک پیش رفت کی ہے کہ اُس نے مجنون کو پائے سگ چومتے ہوئے دیکھا ہے:

کتا اگرچہ انسانوں کی نظر میں ایک حقیر حیوان شمار کیا جاتا ہے لیکن موجودہ صنعتی اور سائنسی دور کے پراگندہ ذہن انسان کے دل بھلائی کے لیے یہی حقیر وجود ایک نمایاں اور اہم رول ادا کرتا ہے

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود؟
گفت گاہی گاہی ایں در کوی لیلیٰ رفتہ بود

(مجنوں نے کتے کے پاؤں چومے۔ وجہ پوچھنے پر جواب دیا کیونکہ کبھی کبھی لیلیٰ کے کوچے سے گزرا ہے۔)

ایران کے ایک مشہور افسانہ نگار صادق چوبک کی کہانی 'آتما-سگِ مَن' یعنی 'آتما- میرا کتا' فارسی ادب کی ایک مشہور کہانی ہے۔ کہانی کا کردار 'میں' اپنے کتے آتما کی بیماری سے تنگ آکر اُس کے خاتمے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے مثلاً اس کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی بیکار کوشش کی جاتی ہے کیونکہ حیوان نے کبھی بھی ایسا غیر اخلاقی طریقہ اپنا کر اپنے وجود کا خاتمہ نہیں کیا ہے۔ یہاں انسانیت پر طنز کیا گیا ہے کہ خود کو مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے والا انسان خودکشی کرے انتہائی احمق ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ موت واقع ہونے کے بجائے صحت یاب ہونے کے بعد آتما جس شفقت، ہمدردی اور خلوص کے ساتھ پیش آتا ہے اُس سے نہ صرف وہ پشیمان ہوتا ہے بلکہ شرمندہ بھی۔ مذکورہ کہانی میں

نسان اور کتے کے مزاج اور جبلت کا تقابل کر کے کہانی کار نے اس حقیقت کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ کشت وخون، بے رحمی اور ناانصافی جیسے مُضِر خصائل بنی نوع انسان کو ازل سے ہی ملے ہیں۔ اسی طرح فارسی ادب کے مشہور افسانہ نگار صادق ہدایت کی کہانی 'سگِ دیگر' یعنی 'آوارہ کتا' میں پات نام کا کتا ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پات بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس بات کا متمنی ہے کہ کوئی بھی انسان اُس کے ساتھ پیار ومحبت سے پیش آئے مگر اُسے اس کے برعکس حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُسے لاتوں، پتھروں اور بے عزتی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا ہے جب کہ وہ اپنی طرف سے انتہائی وفاداری اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں حیوان کو انسان سے کئی گنا بہتر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاں تک اُردو ادب میں 'کتے' کے وجود کا تعلق ہے، اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو دنیا کی یہ حقیر مخلوق بعض ادب پاروں پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ اس کے بغیر اُن کی ماہیت اور اہمیت کا تصور تک کرنا رائیگاں ثابت ہوگا۔ اُردو ادب کے بعض شاہکار ناولوں اور افسانوں میں کتا ایک ایسا کردار ہے جو اپنی دنیا آپ بسانے اور سجانے میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے اُس نے تخلیق کرنے والے اپنے آقاؤں کے دل کی بات عوام تک پہنچانے میں بڑی نزاکت اور لچک کے ساتھ ایک اہم فرض نبھایا ہے۔ پریم چند کی کہانی 'پوس کی رات' میں کتا ایک بھرپور علامت کی حیثیت رکھتا ہے، ہلکو کی غربت، تنگ دستی اور مجبوری پر رحم کھانے کے لیے سماج کے نقلی خداؤں میں سے ایک بھی تیار نہیں البتہ اگر کوئی اس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے تو وہ اس کا کتا 'جبرا' ہے جو اس کے ہر نشیب وفراز میں شانہ بشانہ ساتھ چلتا ہے۔ منٹو کی کہانی 'ہتک' میں کام کرنے والی اداکارہ 'سوگندھی' انسانوں سے زیادہ اپنے کتے کو قابل اعتماد سمجھتی ہے۔ سوگندھی ایک طوائف ہے جو دس روپے میں اپنا جسم بیچنے کا دھندا کرتی ہے۔ ڈھائی روپے اس کا دلال لیتا ہے اور ساڑھے سات روپے میں وہ اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اتنی گری ہوئی ہوتے ہوئے بھی اُس میں اصل عورت ہونے کا احساس ہے۔ ایک دن دلال ایک گاہک کو سوگندھی کے پاس لاتا ہے۔ حالانکہ سخت درد ہونے کی وجہ سے وہ اپنا جسم بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ لیکن اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک غریب خاتون کو پیسے کی سخت ضرورت دیکھ کر وہ آمادہ ہوگئی آدھی رات کو جب گاہک نے اُس کے چہرے پر ٹارچ جلائی تو 'اونہہ' کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ سوگندھی اس اونہہ کو عورت ذات کے لیے ہتک سمجھ کر یکدم اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور دیوار پر لگی مردوں کی تمام تصویروں کو پھاڑ دیتی ہے اور خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھا کر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے۔ گویا سوگندھی اپنے خارش زدہ کتے کو ان مردوں پر ترجیح دیتی ہے جو انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر انسانی خصائل سے محروم ہیں۔ انتظار حسین نے اپنی ایک کہانی کا عنوان ہی 'زرد

کتا' رکھا ہے۔ اس کہانی میں زرد کتا اس روحانی انحطاط کی سرگزشت ہے جو ہوس پرستی اور طمع دنیا سے پیدا ہوتا ہے' کتے کی دم' ہری کرشن کول کی ایک مشہور کہانی ہے جس کا مرکزی کردار چمن انتہائی ذہین اور خوبصورت ہے لیکن غربت اور تنگ دستی اُسے بغیر بوٹ کے کالج جانے پر مجبور کرتی ہے۔ پروفیسر سومناتھ کول یہ سب کچھ سہتے ہوئے چمن کو بوٹ کے لیے بیس روپے دیتا ہے لیکن یہ رقم بھی بھوکے پیٹ ہی کی نذر ہوتی ہے۔ پروفیسر کی بیوی پربھا چمن کی حالت زار کو محسوس نہ کرتے ہوئے اُسے 'کتے کی دم' کہہ کر اپنی ذہنی پستی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

اُردو کے بعض شاعروں نے بھی اپنے کلام میں کتے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ نظموں کو اسی عنوان کے تحت رشتۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ مثلاً فیض احمد فیض نے اپنی نظم کا عنوان ہی 'کتے' رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم 'کتے' میں مظلوم قوموں کی قوت خفتہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ فیض نے اپنے خیالات اور احساسات کی نمائندگی کے لیے کتے کی علامت کو بہترین ذریعہ اظہار سمجھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ 'کتے' نظم میں فیض نے بڑی مہارت کے ساتھ علامت نگاری کے فن کو نبھایا ہے۔ بقولِ فیض احمد فیض ایک مظلوم قوم کی مثال عین اُس کتے کی طرح ہے جو آوارہ، بے کار، اور بے عزتی کے پیکر ہیں اور جنھیں روٹی کے ایک ادنیٰ ٹکڑے پر لڑایا جاسکتا ہے لیکن اگر یہی کتے سرکشی پر کمربستہ ہوجائیں گے تو اپنے آقاؤں کی ہڈیاں چبا کر آبرو کا مقام حاصل کر کے ہی دم لیں گے مگر شرط یہ ہے کہ ان غافلوں کو ذلت کا احساس دلایا جائے۔ مذکورہ نظم اس طرح ہے:

یہ گلیوں کے آوارہ بیکار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ اُن کا
جہاں بھر کی دُھتکار ان کی کمائی
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مرجانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سَر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلاوے
کوئی اِن کی سوئی ہوئی دم ہلاوے

جہاں تک اصنافِ ادب میں علامت نگاری کے بڑھتے ہوئے رجحان کا تعلق ہے چرند وپرند اور دیگر اشیا کے استعمال میں مزید اضافہ جاری رہے گا اور کتا خاص طور پر ادب کا علامتی کردار بن کر تخلیق کاروں کے احساسات اور جذبات کی نمائندگی کرنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوگا۔

■

Prof Abdur Rasheed Khan, Head Dept of Urdu, Government Degree College Bervah (Kashmir)

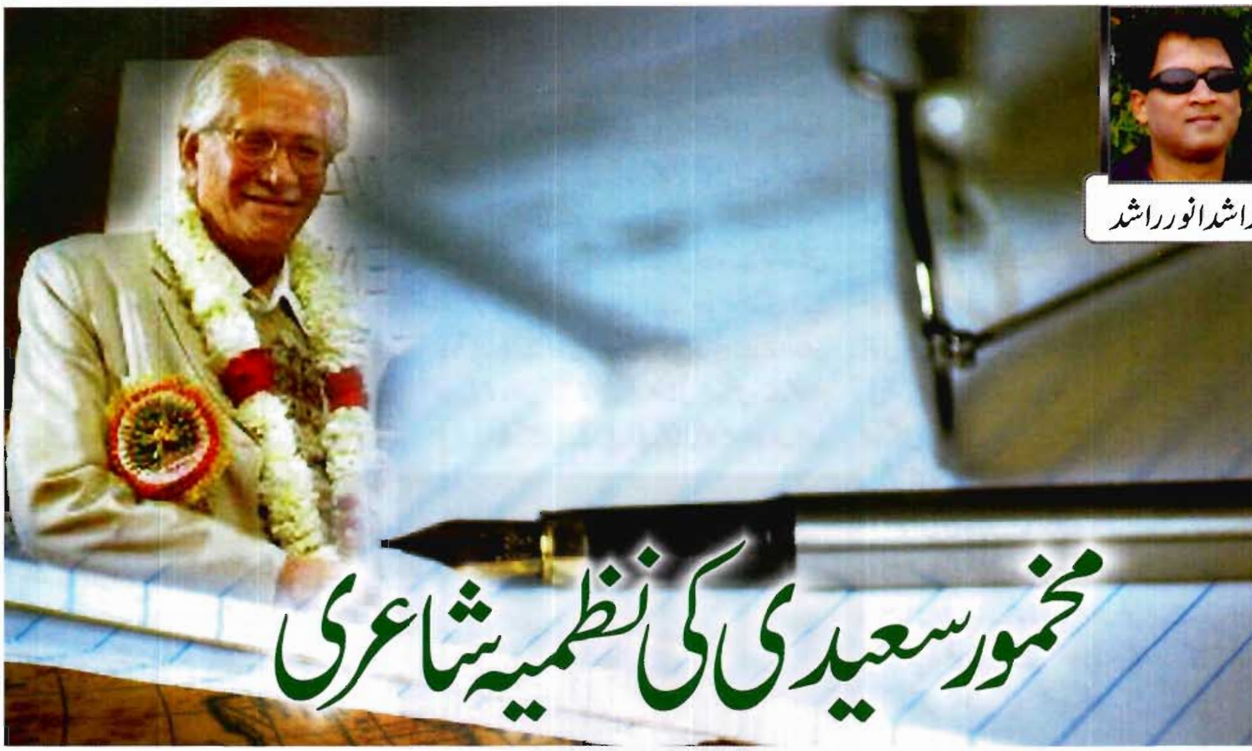

راشد انور راشد

مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری

تخلیق کار بھلے ہی اپنی تخلیقی ترجیحات میں غزل اور نظم کو یکساں اہمیت دیتا ہو، لیکن دونوں اصناف میں اس کی اہمیت مشکل سے ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ کسی کی پہچان غزل کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے تو کوئی نظم کے حوالے سے اپنی مخصوص شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایسے شعرا کی تعداد محدود ہوتی ہے جنھیں دونوں حوالوں سے جانا جائے۔ مخمور سعیدی کو ہم ایسے ہی شاعروں میں شامل کر سکتے ہیں۔ تخلیقی سطح پر انھوں نے خود بھی دونوں اصناف کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی۔ ان کے تمام مجموعوں میں غزلوں اور نظموں کا تناسب تقریباً یکساں ہے۔ حسن اتفاق سے شاعری کے پارکھوں نے بھی ان کی شناخت کو کسی ایک صنف تک محدود نہیں رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ بھی ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے لکھا گیا وہ ناکافی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ مخمور سعیدی کی شاعری کو مختلف تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں میں مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے چند باتیں کہنا چاہوں گا۔

نظم کی شاعری، تخلیق کار کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے۔ نظمیہ شاعری میں محسوسات کا کینوس بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جس میں خیال کی رنگ آمیزی اہم کردار ادا کرتی ہے، لیکن سب سے دشوار مرحلہ بیان کے فطری بہاؤ کو تخلیقیت سے ہم آہنگ کرنا ہے، ذرا سی بداحتیاطی سے پوری نظم کا تاثر مجروح ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے نظم نگار محتاط رویہ اختیار کرتا ہے اور ایجاز و اختصار کے سہارے اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن یہ روش زیادہ سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا کرتی ہے، کیونکہ ایسی صورت میں مجموعی تاثر قائم ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے۔ ان پہلوؤں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے جب ہم مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ذہن ملے جلے تاثرات سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یعنی کبھی تو ہم خوش گوار کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں تو کہیں تاثرات کی سطح عمومی معلوم ہوتی ہے اور کہیں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں ہمیں تھوڑی مایوسی بھی ہوتی ہے، لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عموماً پہلی قرأت کے بعد نسبتاً عمومی تاثرات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ نظموں کی دوسری تیسری قرأت سے معاملہ بہت حد تک صاف ہونے لگتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ شاعر کے اندرون میں جھانکنے کی سبیل پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر تو شاعر کا مخصوص ذہنی سفر، ہمیں اپنا تخلیقی سفر معلوم ہونے لگتا ہے اور مخمور سعیدی کی امیج ایک ایسے نظمیہ شاعر کے طور پر ابھرتی ہے جو غنائی لہجے میں اپنے دل کا غبار، ذہن کی اذیت اور عالم اضطراب کی المناکی کو بیان کرنے پر قادر ہے۔ خوش گوار تاثرات کو مترنم آہنگ میں ادا کرنا شاعر کی بنیادی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے، لیکن مخمور سعیدی ناگفتہ بہ صورتِ حال کو بھی اسی نغمگی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں اور یہ وصف ان کے شعری استحکام میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری میں 'لفظ' کا تخلیقی اظہار مختلف صورتوں میں اجاگر ہوتا ہے۔ 'لفظ' ان کے شعری اظہار کا بنیادی وسیلہ ہے۔ وہ معنی کی مرکزیت کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن مخصوص جذبات کی معنویت کو 'لفظ' کے توسط سے ہی گویائی عطا کرتے ہیں۔ وہ ذہن میں موجود تصورات کو مناسب لفظ کا جامہ پہنا کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجموعہ 'آواز کا جسم' کے منظوم پیش لفظ میں انھوں نے 'لفظ' کی مرکزی حیثیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

لفظ آواز کا جسم ہے
لفظ کو اپنے احساس کے گرم ہونٹوں سے چھو
ذہن کی نرم بانہوں میں بھر اور محسوس کر
لمس آواز کا
قربِ خاموش لمحوں کے دمساز کا

مخمور سعیدی نے نظموں کی تخلیق کے دوران معریٰ نظموں کی ہیئت کو بہ طور خاص استعمال کیا ہے۔ اس ہیئت کے ذریعے انھوں نے محسوسات کے فطری بہاؤ کو زیادہ روانی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وقفے وقفے سے ردیف و قافیے کا استعمال نظموں کے صوتی اور معنوی حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مخمور سعیدی نے اپنی نظموں میں یہی روش اختیار کی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے آزاد نظموں کا فارم بھی استعمال کیا ہے، لیکن چھوٹے بڑے مصرعوں میں ردیف و قافیے کو منفرد انداز

سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس بنا پر آزاد نظموں میں بھی معریٰ اور پابند نظموں کا حسن شامل ہو جاتا ہے اور قاری نظم کے حصار سے فوراً آزاد نہیں ہو پاتا۔

مخمور سعیدی کی نظموں میں موضوعات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی زندگی اور اس زندگی کے ارتعاشات پوری شدت کے ساتھ ان کی نظموں میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ گرد و پیش کی زندگی کا مشاہدہ بھی حیرت انگیز معلوم نہیں ہوتا، لیکن عصری حسیت کے نام پر جو کچھ ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے، اسے کسی بھی طرح سرسری نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی نظموں میں ایک ذمے دار شہری کا کردار متحرک طور پر ابھرتا ہے جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرے کا ایک حساس فرد سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں کے پیش نظر اپنا خاموش احتجاج جاری رکھتا ہے۔ اس فرد کا احتجاج کبھی تہذیب اور شائستگی کی حدوں کو عبور نہیں کرتا۔ ایک نوع کی نفاست اس کے ہر عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس حساس کردار کے پس پردہ خود مخمور سعیدی کی تہہ دار شخصیت ابھرتی ہے۔

مخمور سعیدی کی زیادہ تر نظموں میں ارتقا اور پھیلاؤ کے لحاظ سے اعتدال اور توازن نظر آتا ہے۔ جو نظمیں نسبتاً طویل بھی ہیں، وہ ان نظموں سے یقیناً مختلف ہیں جو طویل نظموں کی روایت کا حصہ ہیں۔ ذات کا سفر اور ایک دو نظمیں مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہیں۔ زیادہ تر نظمیں ایک سے ڈیڑھ صفحے کا احاطہ کرتی ہیں۔ تقریباً ہر نسل میں ارتقائی تسلسل اپنی اہمیت کا احساس کراتا ہے۔ نظم غنائی کیفیت کے سہارے آگے بڑھتی ہے، لیکن مجموعی تاثر نظم کے اختتامی چار پانچ مصرعوں کے ذریعے ہی قائم ہوتا ہے۔ پوری نظم میں ربط تو موجود ہوتا ہے، لیکن وہ ربط محسوسات کی اندرونی لہروں سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یعنی نظم کے ابتدائی ٹکڑوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو نظم کے اختتامی بند سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ مخمور سعیدی کی نظمیں فضا آفرینی میں پوری طرح کامیاب نہیں اور نظم کی ابتدائی کڑیاں، مرکزی مفہوم کے استحکام میں کلیدی کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ غور کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ اتنا سہل نہیں، بظاہر جتنا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی نظموں کی پہلی قرأت سے تھوڑی مایوسی ضرور ہوتی ہے، لیکن ان کی مزید قرأت سے نظم کی ابتدائی کڑیوں میں ایک نوع کا معنوی ربط قائم ہونے لگتا ہے۔ ربط تو ان میں پہلے سے موجود ہوتا ہے، لیکن محسوسات کی اندرونی لہروں سے وابستگی کی کلید ذرا دیر میں کھلتی ہے۔ موضوع خواہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو، مخمور سعیدی ایک مخصوص نغمگیت کے سہارے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں حساس فرد کا المیہ مختلف شکلوں میں بیان ہوتا ہے جو متعدد مسائل سے دوچار ہے اور وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ صورتِ حال اس کے لیے کسی طرح سازگار ہو جائے، لیکن بدقسمتی اسے قدم قدم پر مختلف آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری میں خواب و خیال کے رشتے حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ خیال میں کبھی ماضی کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔ کبھی لمحاتی حسن کا جادو اپنی اہمیت کا احساس کراتا ہے۔ انھیں اپنا ماضی خوابوں کا جہان معلوم ہوتا ہے جو شکستہ در و بام میں خوابیدہ ہے۔ اونگھتے ماحول کے سناٹے میں دل کے دھڑکنے کی صدائیں گونجتی ہیں اور ان کا وجود ایک غم آگیں تصور میں تبدیل ہو جاتا ہے:

تماشہ کب سے جاری ہے اس اندیشے سے بے پروا
وہ بے حس غیر مرئی ہاتھ کس جانب سے بڑھتا ہے
کسے کب منظر موجود سے نابود کرتا ہے
تماشائی پرانے ہیں، تماشہ بھی پرانا ہے
مگر جو دیکھتے ہی دیکھتے گم ہوتے جاتے ہیں
تماشہ گاہ میں کس کو وہ چہرے یاد آتے ہیں
(نظم 'تماشہ گاہ میں')

دھوئیں کی پھیلتی چادر
لہو میں ڈوبتا منظر
اجل کی تیرگی نے چھین لی آنکھوں کی بینائی
نظر سے زندگی کے جانے کیوں آثار بھی گم ہیں
یہ کوئی معجزہ ہوگا ابھی زندہ جو ہم تم ہیں
(نظم 'لہو میں ڈوبتا منظر')

کیا ہے تارِ رگِ جاں سے استوار جنھیں
خبر نہ تھی کہ وہ رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے
بھرے جہاں میں یہ محسوس کر رہا ہوں میں
کہ ڈس رہی ہے مجھے ہولناک تنہائی
(نظم 'شمع بجھتی ہے تو')

جدید شاعری کے عمومی موضوعات مخمور سعیدی کی نظموں میں بہ طور خاص دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تنہائی، بکھراؤ، خموشی کی اذیت، بے گانگی کا احساس اور اضطرابی عمل کی ناگفتہ بہ صوتِ حال ان کی نظموں میں ابھرتی ہے، لیکن یہ ساری کیفیات جدید نظموں کے عمومی رویوں سے مختلف ہیں۔ ان میں ترسیلی سطح پر کوئی پیچیدگی نہیں، نہ ہی ان میں زندگی کی بے معنویت کے شیڈس نمایاں ہیں۔ یہ تمام ترکیفیات شاعر کے مخصوص جذبات کی ترجمان تو ہیں، لیکن ان میں معاشرے کے دیگر افراد بھی اپنی زندگی کا عکس تلاش کر سکتے ہیں۔ ان معنوں میں یہ نظمیں انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعیت کے تصور سے وابستہ دکھائی دیتی ہیں۔

مخمور سعیدی کی مختصر نظموں کے مطالعے کے بعد قاری خوش گوار حیرت سے دوچار ہوتا ہے۔ انھوں نے مختصر نظمیں زیادہ تعداد میں نہیں لکھی ہیں، لیکن ایسی جتنی بھی نظمیں ان کے قلم سے وجود میں آئی ہیں، ان میں تکمیلیت کا احساس قاری کو متاثر کرتا ہے۔ مختصر ہوتے ہوئے بھی یہ نظمیں نہ تو اچانک شروع ہوتی ہیں، نہ ہی شاعر، حیرت انگیز اختتام کے ذریعے قاری کو چونکانے کی کوشش کرتا ہے۔ ابتدا، وسط اور انجام کی مناسب ترتیب نہ ہونے کے باوجود ان نظموں میں کسی قسم کا خلا محسوس نہیں ہوتا۔ چار پانچ مصرعوں پر مشتمل یہ نظمیں اپنے اندر غزل کی رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کو سمیٹے ہوتی ہیں۔ ایسی نظموں میں مخمور سعیدی، غزلیہ آہنگ، نغمگیت، اور ترنم کو بھی بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیشتر مختصر نظمیں، مخصوص جذبے کے مخصوص ردعمل سے متعلق ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کا انفرادی وجود مرکزی حوالہ بنتا ہے اور کفایت لفظی کے باوجود یہ نظمیں ترسیل میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

صدیوں کے غبارِ روز و شب سے
چہرہ، کوئی تابناک چہرہ
ابھرا ہے کچھ اس طرح اچانک
جیسے مرا گم شدہ عقیدہ
مجھ کو سر راہ مل گیا ہے
(نظم 'باز دید')

پرانے پیڑ گرتے جا رہے ہیں
گزرتے موسموں کی تیز آندھی
انھیں جڑ سے اکھاڑے دے رہی ہے
سڑک، لمبی سڑک کے دونوں جانب
جو منظر تھا بدلتا جا رہا ہے
(نظم 'تبدیلی')

گاؤں کی فضاؤں میں، ڈولتی ہواؤں میں
نغمگی مچلتی ہے، مستیاں سنکتی ہیں
اک شریر آہٹ پر، پرسکون پنگھٹ پر
گاگریں چھلکتی ہیں، چوڑیاں کھنکتی ہیں
سلسلے رقابت کے دور تک پہنچتے ہیں
زنگ خوردہ تلواریں دیر تک کھنکتی ہیں
(نظم 'پنگھٹ')

گئے دنوں کی جگمگ یادو

آؤ میرے سامنے آؤ
مجھے بتاؤ یہ کیسا اندھیر بپا ہے
اب میری تقدیر میں کیا ہے
وہ نورانی چہروں والے لوگ کہاں ہیں
جو کہتے تھے ان کی جوت امر ہوتی ہے

(نظم 'گئے دنوں کی جگمگ یادؔ')

مخمور سعیدی کی نظموں میں سیدھے سادے لفظوں کے سہارے فکر و خیال کی رہگزر آباد نظر آتی ہے۔ وہ ماضی کی جانب پلٹ کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ آخر کس نے انھیں دستِ خامشی سے پکارا ہے لیکن احساس کی دل نشیں صدائیں انھیں خوف میں مبتلا بھی کرتی ہیں کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا عمل پتھر میں تبدیل ہونے جیسا ہے۔ ان کی مختصر نظموں میں الفاظ کو پرانی حد بندیوں سے نکل کر نئی فضا میں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے میں کئی ان کہے افسانے الفاظ کی جادوگری سے چمک اٹھتے ہیں اور نغمگیت نئے مفہوم سے آراستہ ہوتی ہے۔ مخمور سعیدی کی مختصر نظموں میں اپنے باطن کو ٹٹولنے کی خواہش مختلف صورتوں میں ابھرتی ہے۔ اضطراب ان کے وجود کو اپنے حصار میں مقید رکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے۔ مختلف سوالوں کے تشفی بخش جوابات حاصل کرنے کی بے چینی ان کا مقدر بنتی ہے اور بیان کا یہی اضطرابی عمل ان کی مختصر نظموں کو بامعنی بناتا ہے۔ مخمور سعیدی کی مختصر نظمیں کم ہیں، لیکن ان میں قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت دوسری نظموں کے مقابلے زیادہ ہے۔

مخمور سعیدی کی نظموں میں عام طور پر عشق کی دل نواز کیفیات دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ وہ عشق و محبت کے شاعر نہیں، لہٰذا ان کی نظموں میں عشقیہ جذبات کا بیان کم کم ہے۔ وہ زندگی کے متعدد مسائل میں الجھے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب بھی انھیں ان چیزوں سے نجات ملی ہے، انھوں نے دل کی آواز پر لبیک کہنے کی کوشش کی ہے:

تجھے جو دیکھا تو دل میں کیسی امنگ جاگی
کسی سہانے سفر پہ نکلیں
نئی نئی وادیوں سے گزریں
ہرے بھرے جنگلوں میں گھومیں
جواں ندی کے کشادہ سینے پہ ہونٹ رکھ دیں
سجل پہاڑی کی سرمئی چوٹیوں کو چھو لیں
ہوا کے جھولے میں خوب جھولیں
تجھے جو دیکھا
تو دل کے ٹھنڈے لہو میں کتنے ابال آئے
نہ جانے کیا کیا خیال آئے

(نظم 'خاک و باد سے آگے')

ابھی کوئی میرے سامنے تھا
نگاہ اس کے گلابی پیکر کو چھو کے گلنار ہو گئی تھی
یہ لمس رنگیں تھا ایک نشہ
کہ روح سرشار ہو گئی تھی
خزاں زدہ حسرتوں کا دامن
مہکتے پھولوں سے بھر گیا تھا
چمن چمن وادیِ نظر تھی کہ رنگ ہر سو بکھر گیا تھا
ابھی ابھی میں نے اس کو دیکھا تھا

(نظم 'لمحے کا حسن')

مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری میں 'لفظ' کا تخلیقی اظہار مختلف صورتوں میں اجاگر ہوتا ہے۔ 'لفظ' ان کے شعری اظہار کا بنیادی وسیلہ ہے۔ وہ معنی کی مرکزیت کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن مخصوص جذبات کی معنویت کو 'لفظ' کے توسط سے ہی گویائی عطا کرتے ہیں۔ وہ ذہن میں موجود تصورات کو مناسب لفظ کا جامہ پہنا کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجموعہ 'آواز کا جسم' کے منظوم پیش لفظ میں انہوں نے 'لفظ' کی مرکزی حیثیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے

ان دو مثالوں کے ذریعے ہی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عشقیہ جذبات کے بیان میں مخمور سعیدی کا انداز ان کی دوسری نظموں سے کتنا مختلف ہے۔ دونوں نظموں میں شاعر کا محبوب گفتگو کا مرکز ہے۔ پہلی نظم میں محبوب سے براہِ راست تخاطب کا انداز اختیار کیا گیا ہے جو قاری کو زیادہ متوجہ کرتا ہے۔ یہاں ایک نوع کی سرشاری بھی بہ طور خاص محسوس کی جا سکتی ہے۔ دوسری نظم میں محبوب کے حسی پیکر کو مخصوص پیرائے میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قابلِ توجہ ہے۔

مخمور سعیدی نے اپنی نظموں میں فطرت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ فطرت کے اسرار و رموز انھیں مختلف مرحلوں پر غور و فکر کے لیے اکساتے ہیں۔ گھٹن سے نجات کے لیے وہ ہواؤں کی دستک سننے کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کے خیالوں میں خوابوں کا ایک ایسا گاؤں آباد ہے جس کی سرحد پہ شفق رنگ گلاب مہکتے ہیں، جہاں پیڑوں کی گھنیری چھاؤں، آگ اگلتے لمحوں کی جگر سوزی کو تھپکیاں دے کر سلاتی ہے، جہاں تاروں بھری جھیل کی انگنائی میسر آتی ہے، جہاں سرمئی سرد سبک سیر ہوا کے جھونکے ذہن و دل کے دریچوں کو معطر کرتے ہیں:

افق سے افق تک جو چھائے ہوئے تھے
وہ کہرے کے بادل نکھرنے لگے ہیں
اجالے زمیں پر اترنے لگے ہیں
در و بام شہر تمنا کا چہرہ نکھرنے لگا ہے
کہ اب رستہ رستہ سنورنے لگا ہے
نظر زندگی کے خد و خال پہچانتی جا رہی ہے
کہ گم گشتہ صبح ملاقات یاراں
شبِ ہجر کی آخری سرحدیں پار کرتی چلی آ رہی ہے

(نظم 'دھوئیں کی سیہ دلدلوں' سے)

مخمور سعیدی نے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کی غرض سے نظمیں نہیں لکھیں۔ ان کا تخلیقی مزاج، نظم کے فطری آہنگ سے مانوس دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزلیہ شاعری کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے نظمیہ شاعری کو یکساں سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ برتنے کی کوشش کی۔ یہاں میں مخمور سعیدی کی ایک نظم سنا کر اپنی گفتگو مکمل کرنا چاہوں گا جس میں یاد رہ جانے والی عجیب و غریب کیفیت ہے۔ میرے لیے یہ ان گنی چنی نظموں میں سے ایک ہے جس کی پہلی قرأت نے ہی میرے حافظے میں جگہ بنا لی اور مخمور سعیدی سے باقاعدہ تعارف کا وسیلہ بنی۔ نظم کا عنوان ہے۔ 'ایک چڑیا' ملاحظہ ہو:

ننھی منی سی اک چڑیا/ میری کھڑکی میں آ بیٹھی
میں نے اس کو پیار بھری نظروں سے چوما
جی یہ چاہا/ اٹھا کے دل کے اندر رکھ لوں
میں اس کا پنجرہ بن جاؤں
ننھے منے اس کے پروں میں
لہر سی جاگی
پھر پھر کرتی دور آکاش کی اور وہ بھاگی
اب وہ چڑیا/ ننھی منی سی وہ چڑیا
میری آنکھوں سے اوجھل ہے/ سوچ رہا ہوں
میرا وحشی کٹھور ارادہ
اس نے جس دم بھانپا ہوگا/ ننھا منا سا دل اس کا
کتنے زور سے دھڑکا ہوگا

■

Dr. Rashid Anwar Rashid, Assistant Professor, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

شبیر احمد لون

انانیت اور انانیتی ادب

انانیتی ادبیات (Egoistic Literature) ایک ایسا موضوع جس پر ہمارے اردو ادب میں سوائے مولانا ابوالکلام آزاد کے آج تک کسی نے بات نہیں کی، شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ موضوع قارئین کے لیے لطف اندوزی کا کام نہیں دیتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ موضوع کبھی کبھی فلسفیانہ انداز اختیار کرتا ہے جس سے قارئین اکتا جاتے ہیں۔

بنی نوع انسان کی یہ خوبی ہے کہ وہ چپ نہیں رہ سکتا کیونکہ قدرت نے اسے قوت گویائی کی نعمت سے نوازہ ہے اور یہی قوت گویائی اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز بناتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسی کی بدولت سماج کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ سماج میں مختلف افراد کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، باتیں کرتا ہے، کبھی ان کی سنتا ہے اور کبھی ان کو خود کی سناتا ہے۔ لیکن سماج میں رہ کر ایک انسان ہر وقت اور ہر مرحلے پر اپنے ضمیر کی استواری کے لیے سخت کوشاں رہتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے یا باتیں کرتے کرتے جب کبھی اس کے ضمیر کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ چپ نہیں بیٹھتا بلکہ بے ساختہ اپنی ذات کی نمائش کر ڈالتا ہے۔ اپنی ذات کی نمائش وہ عموماً دو طریقوں سے کرتا ہے، ایک اپنی ذات کو دوسروں سے اعلیٰ یا بڑی ثابت کر کے اور دوسرا اپنی ذات کو ادنیٰ یا حقیر ثابت کر کے۔ غرض اپنی ذات کی نمائش خواہ وہ اعلیٰ یا ادنیٰ کی صورت میں کرے، مقصد تو ایک ہی ہے اور وہ ہے شخصیت یا ذات کا اظہار۔ ذات کا اظہار جس لفظ سے ممکن ہے وہ 'میں' یعنی ضمیر متکلم ہے۔ اسی ضمیر متکلم سے انانیت وجود میں آتی ہے۔

'انانیت' عربی زبان کے لفظ 'انا' سے نکلا ہے جس کے معنی 'میں' ہیں۔ انگریزی میں انانیت کے لیے 'ایگو (Ego)' کی اصطلاح رائج ہے۔ ایگو دراصل یونانی لفظ ہے جس کا تصور ارسطو نے ابتدائی عربی مترجموں سے حاصل کیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے 'ایگو' کے بہت سارے معنی ہیں جیسے اہنکار، خودستائی، خودفروشی، خودی، انانیت اور لاف زنی وغیرہ۔ لیکن اردو میں سب سے قرین معنی انانیت ہی تصور کیا جاتا ہے۔ انانیت کا تعلق علم اخلاق یا اخلاقیات (Ethics) سے ہے اور بعض کے نزدیک اس کی قربت نرگسیت (Narcissism) سے ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد انانیت کے متعلق فرماتے ہیں:

''انانیت فکری انفرادیت کا قدرتی سرجوش ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا اور اگر کوئی اسے دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔''

(غبارِ خاطر، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1946، ص 181)

جہاں تک انانیت کا تعلق ہے یہ تصور تشکیل کائنات کے وقت ہی وجود میں آیا جب ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس وقت بھی شاید ابلیس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی اور اسی لیے اپنی بڑائی یا برتری کا مظاہرہ کیا تھا جس کا واضح ثبوت قرآن مجید میں یوں موجود ہے:

''(حق تعالیٰ نے) فرمایا، تو جو سجدہ نہیں کرتا، تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے، جبکہ میں تجھ کو حکم دے چکا۔ کہنے لگا 'میں' اس سے بہتر ہوں۔ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی (خاک) سے پیدا کیا۔''

(سورۃ الاعراف، آیت نمبر 11، رکوع نمبر 2)

مذہب کو ایک طرف کر کے اگر سماجی سطح پر دیکھا جائے تو ہر فرد خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، گورا ہو یا کالا، مرد ہو یا عورت کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی موڑ پر اپنی انانیت کا مظاہرہ کرتا ہی رہتا ہے کیونکہ بقول ابوالکلام آزاد:

''ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔''

(غبارِ خاطر، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1946، ص 180)

'میں' جس کی نوعیت حیاتی (Biological) ہوتی ہے۔ لیکن یہ حیاتی نوعیت بھی سماجی اثرات سے آزاد نہیں ہوتی۔ یہ بات تو ہمیں تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ 'میں' حیاتی دور میں بھی سماجی عوامل کو قبول کرتا ہے۔ فرد جب اپنی ذات کے متعلق واضح شعور حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور معاشرتی پابندیوں اور سہولتوں کے پیش نظر اپنے بارے میں ایک خاص انفرادی تصور قائم کرنے لگتا ہے تو یہ 'میں' اس کا ضمیر بن جاتا ہے جس کو وہ آئینے کی طرح سنبھالتا ہے۔ اسے ہر قدم پر یہ احتیاط ملحوظ نظر رہتی ہے کہ کہیں اسے ٹھیس نہ لگ جائے۔ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اس کی حفاظت میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ ضمیر کی استواری اور استحکام کے لیے اسے دو جہتوں، مثبت و منفی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک

اگر چہ صرف منفی جہت وجود رکھتی ہے لیکن اتنی بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات صرف نفی کا ہی شہکار نہیں بلکہ منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اس کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور جو کچھ اس عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اسے ہٹانے یا دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر فرد کو مثبت جہت میں بڑھنے میں کامیابی ہوتی ہے تو وہ امید اور اعتماد کا مظاہرہ کرتا ہے اور اگر اسے رکاوٹ درپیش آتی ہے تو ناامیدی، بیقراری اور پریشانی کا شکار ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی اسے لگتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اب اتنی مشکل نہیں ہیں تو دوبارہ منفی سے مثبت جہت کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے۔ اس طرح سے ضمیر سماجی ونفسیاتی (Social & Psycological) اثرات کے تحت ایک واضح اور متعین شکل اختیار کر لیتا ہے جو انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہی انفرادیت پھر انانیت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

انانیت اپنے آپ میں مختلف نوعیتوں کی حامل ہوتی ہے مگر دو خاص نوعیتیں جن پر بات کرنا لازمی ہے ان میں ایک ہے اضافی نوعیت اور دوسری ہے مطلق نوعیت۔ اضافی نوعیت (Relative type) انانیت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں فرد کو اپنی ذات جتنی بڑی یا اعلیٰ نظر آتی ہے اتنی ہی دوسرے افراد کی نگاہوں میں یکسر غیر اہم اور چھوٹی ہوتی ہے یعنی جتنی بھی وہ اپنی تعریفیں کرتا ہے اس کے مخاطبین اسے بالکل رد کرتے ہیں یا پھر مبالغہ آرائی سے منسوب کرتے ہیں۔ غرض اس شخص کو اپنی ذات جتنی اچھی نظر آتی ہے اتنا ہی دوسرے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ اضافی نوعیت کی انانیت ہے یعنی فرد اپنی ذات کے اظہار میں کچھ گھٹا کر یا بڑھا کر اضافہ کرتا ہے۔ ایک مصنف کے لیے یہ انتہائی دشوار گزار منزل ہے اور اس سے بچ کر جو مصنفین نکلتے ہیں ان کی انانیت مطلق نوعیت (Absolute type) کی ہوتی ہے۔ مطلق نوعیت انانیت سے مراد وہ انانیت ہے جو مصنف کو خود جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی بڑی دوسروں کو بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس انانیت کا پرتو خواہ اندرونی آئینے پر پڑے یا بیرونی، اس کی جہت ہمیشہ یکساں طور پر نمایاں ہوگی۔ اردو ادب میں مرزا غالب، میر تقی میر، اور میر انیس وغیرہ جیسے شعرا ایسے ہیں جن کی انانیت مطلق نوعیت کی ہے۔ ان شعرا نے اگر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر فخر کیا ہے تو زمانے نے بھی ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ ان شعرا نے اگر کبھی ایسا کہا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

یا

دریا میں قطرہ قطرہ ہے آب گہر کہیں
ہے میر موجزن ترے ہر اک سخن میں آب

یا

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تو بے جا نہیں کہا۔ غالب کے انداز بیاں کو کس نے نہیں سراہا، میر کی روانی کا اعتراف کس نے نہیں کیا اور

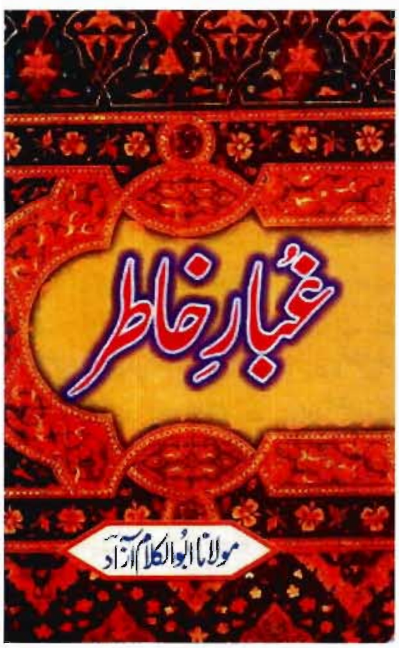

انیس کا الگ الگ انداز سے مضامین تراشنا، اس سے بھی کس کو انکار ہے۔ غرض ایسے افراد جن کی انانیت مطلق نوعیت کی ہوتی ہے وہ بغیر کسی تصنع اور مبالغے کے اپنی ذات کو دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی تحریروں میں پھر دلکشی اور تاثیر ہوتی ہے جو قارئین کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی انا کو ظاہر کرنے کا سب سے موثر اور بہتر ڈھنگ کون سا ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ ہر مصنف یا فرد کی انفرادیت مختلف طریقوں سے اور مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہے جس طرح ہر شخص کے سوچنے کی صلاحیت الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح تمام فنکاروں کی انانیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طریقوں سے سامنے آتی ہے۔ کچھ کی انانیت دھیمے سروں میں بولتی ہے اور کچھ کی اس طرح چیختی ہے کہ سارا گرد و پیش گونج اٹھتا ہے۔ ایسے مصنفین اپنی 'انا' کو دبا نہیں سکتے۔ ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور ان کا سکون بھی چیخنے چلانے سے کم نہ ہوگا۔ وہ جتنا بھی اپنی انفرادیت کو دبانا چاہیں تو وہ اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جیسے مغربی ادبیات میں روسو، ٹالسٹائی، اناطول فرانس، آندری ژید اور سینٹ آگسٹائن وغیرہ۔ مشرقی ادبیات میں ابن خلدون، غزالی، بابر، جہانگیر وغیرہ کی اور اسی طرح ہمارے اردو ادب میں مرزا غالب، انیس، شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی۔

یہاں پر ایک اور سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا ادب میں انانیت کا استعمال ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو انانیتی ادبیات سے کیا مراد ہے؟ دنیائے ادب میں انانیت کا پرتو ہر جگہ نظر آتا ہے کیونکہ ہر ادب میں خودنوشت سوانح عمریاں، روزنامچے، مکتوبات، ذاتی واردات و مشاہدات وغیرہ قلمبند کرنے کا چلن ہے اور جہاں جہاں ایسے فنون لطیفہ موجود ہوں وہاں انانیتی ادب ضرور نظر آئے گا۔ انانیتی ادبیات سے مراد وہ تحریریں جن میں تخلیق کار کا 'میں' یعنی ایگو واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ عام طور پر ہر تخلیق میں مصنف کا 'میں' نمایاں ہو جاتا ہے مگر خودنوشت سوانح عمریاں' ذاتی واردات و مشاہدات اور تجربات کے علاوہ روزنامچے اور مکتوبات انانیتی ادب (Egoistic Literature) کے زمرے میں آتے ہیں۔ انانیتی ادبیات کا آغاز دنیائے ادب میں پاپولر انگریزی کی وساطت سے 1754 کے آس پاس ہوا۔ آگے چل کر سگمنڈ فرائڈ اس موضوع پر تفصیل سے بات کی۔ ہمارے اردو ادب میں انانیتی ادبیات سے متعلق سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط کے مجموعہ 'غبار خاطر' میں بات کی۔ مولانا کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے 'تنقیدی افکار' میں اور ملک زادہ منظور احمد نے 'غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ' میں اس موضوع سے متعلق ہلکی سی بحث کی ہے۔

■

Shabbir Ahmad Lone,
Jammu & Kashmir

شفیع الزماں معظم

وہاب اشرفی

شخصی و ادبی جائزہ

(پہلی برسی)

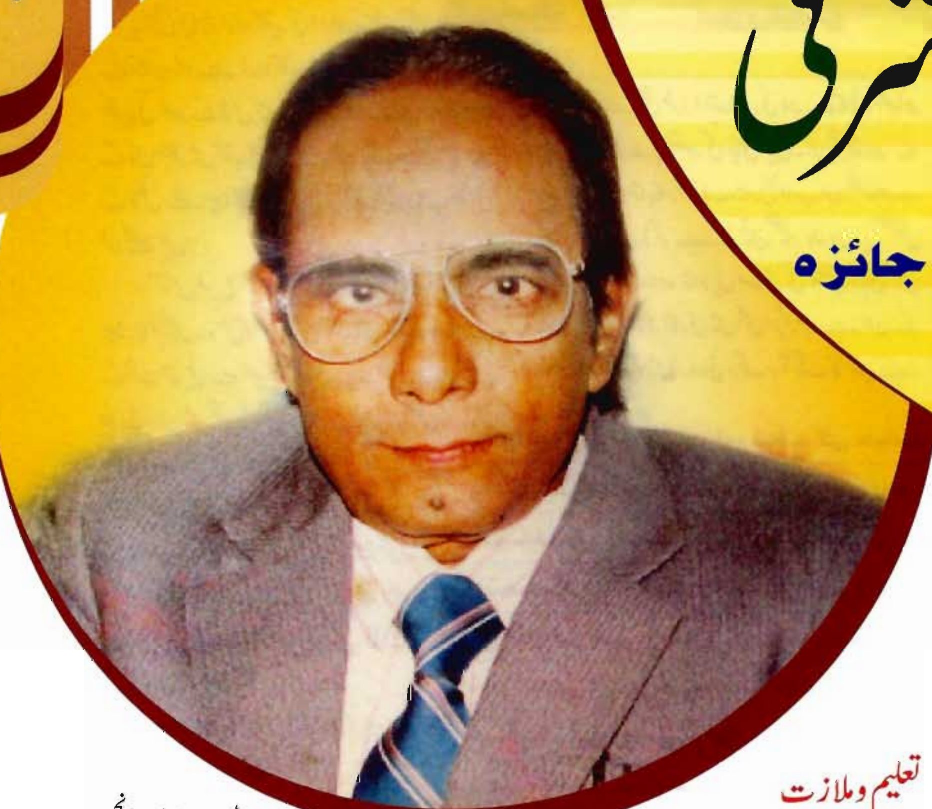

بہار کی سرزمین عظیم آباد کو جس طرح سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے اسی طرح علم وادب کے میدان میں بھی عظیم آباد کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں یہاں لوح وقلم کی پرورش کرنے والوں کی ایک طویل فہرست رہی ہے۔ خصوصاً اردو و فارسی شعر وادب کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو بیدل عظیم آبادی سے شاد، راسخ، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، ڈاکٹر مغنی اور کلیم عاجز تک اردو شعر وادب کے مشاہیر کی ایک طویل فہرست ہے۔ مذکورہ مشاہیر ادب نے اردو شعر وادب کی اس طرح مشاطگی کی کہ عظیم آباد کو ایک الگ دبستان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ خواہ وہ شعری ادب ہو یا نثری تحقیق وتنقید، تاریخ ہو یا سوانح نگاری یا لغت کی ترتیب غرض مشرقی علوم کے ہر شعبے میں عظیم آباد کے باکمال حضرات سرفہرست رہے۔

اردو کی ان باکمال شخصیات میں ایک اہم شخصیت ڈاکٹر وہاب اشرفی کی بھی تھی۔ ان کا پورا نام سید عبدالوہاب اشرفی تھا۔ ان کا آبائی وطن جنوبی بہار کے ضلع جہان آباد میں بی بی پور (کاکو) تھا۔ جہاں وہاب اشرفی نے 2 جون 1936 کو پیدا ہوئے اور چھہتر سال کی عمر میں 15 جولائی 2012 کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف پرواز کر گئے اور اپنی جائے پیدائش بی بی پور میں مدفون ہوئے۔

تعلیم وملازمت

وہاب اشرفی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی، پھر ڈھاکہ (موجودہ بنگلہ دیش) چلے گئے اور وہیں رحمت اللہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، سٹی کالج کولکاتا سے انٹرمیڈیٹ کیا اور سنٹرل کالج کولکاتا سے انگریزی آنرس کے ساتھ بی اے کیا اور بہار یونیورسٹی مظفرپور سے انگریزی واردو میں امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم اے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا اور قانون کی سند بھی حاصل کی۔

وہاب اشرفی نے ملازمت کا آغاز لائف انشورنس کارپوریشن میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس ملازمت کو ترک کرکے اروند مہیلا کالج پٹنہ میں عارضی لکچرر کی حیثیت سے ایک سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر گیا کالج گیا میں اردو لکچرر کی حیثیت سے مستقل ملازمت میں آگئے۔ ترقی کرکے ریڈر ہوئے اور رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں آگئے۔ مزید ترقی کرکے صدر شعبۂ اردو کا عہدہ سنبھالا۔ اسی دوران بہار یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین ہوئے۔ چیئرمین کی حیثیت سے موصوف نے بڑے پیمانے پر تقریباً ڈیڑھ ہزار لکچرر کی بحالی بہار کی یونیورسٹیوں میں کیا۔ یونیورسٹی تعلیم کے حوالے سے یہ ان کا نمایاں کارنامہ تھا۔ اس حسن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حکومت بہار نے وہاب اشرفی کو بہار انٹرمیڈیٹ کونسل کا چیئرمین بنایا۔

ادبی سفر

اردو ادب کے دانش ور اور ناقد کی حیثیت سے وہاب اشرفی نے عالمی سطح پر اپنی ایک پختہ شناخت بنائی۔ موصوف کو بلاشبہ کثیر التصانیف دانشور کہا جاتا ہے۔ اردو

ادب وتنقید کے حوالے سے ان کی شخصیت مختلف الجہات تھی لیکن ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کی تنقید نگاری ہے۔ وہاب اشرفی کا ادبی سفر نصف صدی کی طویل مدت پر محیط ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی تنقیدی روایت کے بعد وہاب اشرفی نے نہ صرف یہ کہ تنقیدی روایت کو فروغ دیا بلکہ اردو تنقید میں ایک واضح تنقیدی نظریہ پیش کیا جو اردو تنقید کی موجودہ نسل کے لیے نشان راہ ہے۔ اردو تنقید میں وہاب اشرفی نظریاتی جمود کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ حالات و واقعات کے پس منظر میں تنقیدی نظریات میں لچک اور تغیر پذیری کے قائل تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک جگہ وہاب اشرفی خود لکھتے ہیں:

''جس طرح شاعری کسی مخصوص مزاج و منہاج پر ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح تنقید بھی، وقت و حالات کے تحت تبدیلی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ نظریے جامد نہیں ہوتے، ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، دراصل بعض ادبی قدریں آفاقی اور بنیادی ہونے کے باوجود نئے تصورات سے ہم آہنگ ہوتی رہتی ہیں۔ اس پس منظر میں تنقید کے سامنے بھی نئے چیلنجز، نئے مطالبات اور نئے امکانات ابھرتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ذہن کو کسی ایک خانے میں بند رکھنا بہت حد تک مشکل ہوتا ہے۔''

(معنی سے مصافحہ: وہاب اشرفی، بحوالہ زبان و ادب، اگست 2012،ص46)

اس اقتباس سے تنقید میں وہاب اشرفی کا یہ نظریہ واضح ہوجاتا ہے کہ نظریے جامد نہیں ہوتے بلکہ تغیر پذیر ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادب میں ایک مستحکم اور واضح فکر کے حامل تھے۔ جو انھیں اردو ادب کے محققین و ناقدین کے درمیان ایک انفرادی مقام عطا کرنے کا ضامن ہے۔

تخلیقات وانعامات

وہاب اشرفی نہ صرف یہ کہ اردو کے عالمگیر دانش ور اور مصنف تھے بلکہ انگریزی زبان و ادب کے بھی بڑے قلم کار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے عالمی ادب میں نصف صدی کا کامیاب سفر طے کیا ہے۔ اردو ادب میں تحقیق وتنقید کے حوالے سے مختلف موضوعات پر موصوف نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھیں جو سب کی سب علمی تحقیق وتنقید، مواد اور منطقی طرز استدلال کی وجہ سے کافی اہم اور دستاویزی نوعیت کی تصور کی جاتی ہیں۔ ان تخلیقات کے درمیان ان کی شاہکار تصنیف، تاریخ ادب اردو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ تنقید کے علاوہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں وہاب اشرفی افسانہ نگاری میں بھی سرگرم رہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانی رنگ و آہنگ کا غلبہ ہے۔

اردو ادب کے دانش ور اور ناقد کی حیثیت سے وہاب اشرفی نے عالمی سطح پر اپنی ایک پختہ شناخت بنائی۔ موصوف کو بلا شبہ کثیر التصانیف دانش ور کہا جاتا ہے۔ اردو ادب و تنقید کے حوالے سے ان کی شخصیت مختلف الجہات تھی لیکن ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کی تنقید نگاری ہے۔ وہاب اشرفی کا ادبی سفر نصف صدی کی طویل مدت پر محیط ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی تنقیدی روایت کے بعد وہاب اشرفی نے نہ صرف یہ کہ تنقیدی روایت کو فروغ دیا بلکہ اردو تنقید میں ایک واضح تنقیدی نظریہ پیش کیا جو اردو تنقید کی موجودہ نسل کے لیے نشان راہ ہے۔

لیکن بعد کے افسانوں میں بتدریج سماجی ومعاشرتی احوال و قواعد پر بطور خاص توجہ دی ہے۔ ان کے افسانے مقصدیت پر مبنی ہیں۔ اب تک ان کے بیالیس افسانے اشاعت پذیر ہوچکے ہیں۔ افسانوی تخلیق میں ان کی فکر و دیگر فنکاروں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار میں 'اردو افسانہ نگاری' کے عنوان سے موصوف نے نہ صرف یہ کہ بہار کے اردو افسانہ نگاروں کا فکری وفنی جائزہ لیا ہے بلکہ افسانوی تخلیق کا ایک فنی معیار بھی متعین کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر وہاب اشرفی نے اپنی تخلیقات میں جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ موصوف کی مذکورہ ادبی تخلیقات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو 2007 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا جو ہندوستانی ادبیات کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ علاوہ ازیں غالب ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا سمان ایوارڈ، صدارتی ایوارڈ (اردو زبان) اور اردو اکادمی ایوارڈ وغیرہ سے موصوف کو نوازا گیا۔

وہاب اشرفی نے نصف صدی کے طویل ادبی سفر میں جدید رجحانات اور افادی نقطۂ نظر کو اپنایا اور ادب کی تخلیق میں اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھا اور اسے ایک وزن اور وقار بخشا اور زندگی کے زمینی حقائق اور علمی موضوعات سے قارئین کو روشناس کرایا۔ ان کی تحریروں میں جہاں ایک طرف ان کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے وہیں دوسری طرف ان کے عہد کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب میں علمی و تاریخی حقائق کا وسیلہ اظہار بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ موصوف جہاں ایک طرف ماہر نقاد اور دانش ور کی حیثیت سے جانے جاتے تھے وہیں دوسری طرف بہترین مدیر اور منفرد تبصرہ نگار بھی تھے جس سے ان کے اسلوب کا حقیقی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید و تبصرہ نگاری کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے ادبی تخلیق کو تخلیق کار کے ذہن کی گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کی۔ ادبیات کو سمجھنے اور سمجھانے کے پورے مرحلے میں ایک مثبت رویے کا انتخاب کیا اور زندگی بھر اسی راہ پر گامزن رہے۔

وہاب اشرفی نے ادب کے ارتقائی و تاریخی شعور و روایت کو مستحسن پہلوؤں سے روشناس کرایا اور پوری مستعدی وخود اعتمادی کے ساتھ تخلیق کو اہمیت دی۔ انھوں نے کسی بھی ادبی تخلیق پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھایا جب تک کہ انھیں اس بات کا یقین نہ ہوجائے کہ تخلیق کار اس کے خیمے سے باہر کا نہیں ہے اور اس تخلیق سے متعلق ایسا بیان دینا کہ واقعی کسی شاہکار تخلیق پر تبصرہ کر رہے ہوں اور یہی ان کی ادبی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ◘

Dr. Mohd. Shafiuz Zaman,
River View Colony, Alam Ganj, Loharwa Ghat
PO. Gulzar Bagh, Patna-7 (Bihar)

فردوس نذیر بٹ

عربی کا نابغہ روزگار ادیب

ابو منصور ثعالبی

حیات و خدمات

ابو منصور ثعالبی کا شمار عربی ادب کی ان نابغہ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جنھیں اپنی ادبی خدمات اور فنی کمالات کی بدولت عربی ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے تنقید نگار، فعال انشا پرداز، علم لسانیات کے ماہر، فصاحت و بلاغت کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔

ثعالبی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی ہے جو کہ تاریخ اسلام میں عصر انحطاط Age of Downfall کہلاتا ہے کیونکہ اس دور میں اسلامی خلافت کا انحطاط وابتلا شروع ہوگیا اور ریاست اسلامیہ متعدد امارات میں تقسیم ہوگئی جن میں حمدانی، غزنوی، فاطمی، زیاری، سامانی ریاستیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ یہ دور سیاسی عدم استقرار، ادارتی و اقتصادی بحران، اجتماعی و معاشرتی تنزل کے باوجود علم وثقافت کا سنہرا دور تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں عربی علوم وفنون خاص کر طب فلسفہ علم تاریخ شعر و نثر اپنے بام وعروج کو پہنچ گئے اور مسلم تہذیب وتمدن کا بڑے پیمانہ پر ترویج وتطور ہوا جس کے اہم اسباب مسلم حکما کی علم دوستی، علما و دانشوران وقت کے ساتھ ان کی مراعات و فیاضی، مدارس و مکاتب کی تاسیس اور علوم و فنون کی تدوین واشاعت ہیں، ابو منصور ثعالبی اسی زرخیز دور کی پیداوار ہے جس نے عربی ادب میں اپنے عمیق اثرات مرتب کیے اور اس میں اپنی علمی نگارشات کے بیش قیمت جواہرات بکھیر دیے، یہاں تک کہ مشہور ادب ابن بسام کے الفاظ میں وہ عربی علوم وفنون کا محافظ اور مؤلفین کا سرخیل قرار پایا، اس کی شہرت ضرب المثل بن گئی اور اس کے ادبی نقوش مشرق و مغرب میں جلوہ گر ہوگئے جس طرح ظلمت شب میں ستارے جلوہ افروز ہوجاتے ہیں۔(1)

حیات

ابو منصور عبدالملک محمد بن اسماعیل ثعالبی کی پیدائش ایران کے شہر نیشاپور میں 350ھ/ 961 عیسوی میں اور وفات 292 ہجری مطابق 1028 عیسوی میں ہوئی، وہ ثعالبی کے نام سے مشہور ہوئے، ثعلب عربی زبان میں لومڑی کو کہتے ہیں، مشہور مورخ ابن خلکان نے اسے ثقالبی کہنے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہ لومڑی کی کھال کی پوستین بنایا کرتا تھا۔

ثعالبی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت ہی کم معلومات دستیاب ہیں، محمد عبداللہ الجادر کے مطابق ثعالبی کی پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو کہ معاشی لحاظ سے فقر و بدحالی کا شکار تھا مگر افراد خانہ نے اپنی ستم ظریفی کے باوجود اس کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ثعالبی کی ابتدائی تعلیم اس کے آبائی وطن نیشاپور میں ہوئی۔ ثعالبی کی علمی زندگی کی تعمیر وتشکیل میں جس شخص کا سب سے اہم رول ہے وہ امیر خراسان عبیداللہ میکالی ہے، وہ اپنے زمانہ کے مشہور ادیب وشاعر شمار کیے جاتے تھے اور علم وفن میں یکتا، حسب ونسب، خلق وادب

میں بے مثل تھے۔

ثعالبی نے جہاں ایک طرف نیشاپور کے طول وعرض میں پہنچ کر علما سے کسب فیض کیا۔ ثعالبی کے ادبی نصوص سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنا پہلا سفر 383 ہجری میں ازبکستان کے مشہور شہر بخاریٰ کا کیا جو اس زمانے میں امیر نوح بن منصور سامانی کے زیر حکومت تھا۔ سیاسی بدامنی اور عدم استقرار سے دل برداشتہ ہوکر ثعالبی نے اپنے مختصر قیام کے بعد بخاریٰ کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے وطن نیشاپور واپس لوٹ آیا، بخاریٰ میں اپنے قیام کے دوران ثعالبی نے وہاں کے ممتاز ارباب شعر وسخن کی صحبت پائی جن میں ابوالحسن محمد بن احمد الافریقی، ابو منصور سعید بن احمد البریری، ابوبکر محمد بن عثمان الخازن اور خاص کر مشہور ادیب و قلمکار المامونی شامل ہیں۔ نیشاپور میں اپنی آمد کے کچھ عرصہ بعد ثعالبی ہمذان کے مشہور ادیب بدیع الزاں ہمذانی سے متعارف ہوا اور ان کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔

ثعالبی کے معاصرین میں معروف ادیب ابوالفتح البستی کا نام قابل ذکر ہے جن سے ثعالبی نے عرصہ دراز تک فیض پایا۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ثعالبی کو ادیب کی حیثیت سے جس چیز نے سب سے زیادہ مقبولیت بخشی وہ اس کی شہرہ آفاق تصنیف یتیمۃ الدہر ہے، یہ کتاب شعرا کے چیدہ اور اچھوتے شعری نصوص پر مشتمل ہے اور فن انشا پردازی کے باب میں ایک تاریخی نمونہ ہے، اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ثعالبی کی شخصیت اطراف عالم مقبول ہوئی اور وقت کے ارباب سخن اور اہل ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا یہاں تک کہ جرجان کے حاکم قابوس بن وشمگیر نے اسے اپنے ہاں جرجان آنے کی دعوت دی جس پر لبیک کہتے ہوئے ثعالبی نے 391 ہجری میں جرجان کا

سفر کیا اور امیر قابوس سے شرف یابی پانے کے ساتھ ساتھ اس کے انعام و اکرامات کا استحقاق حاصل کیا، نیشاپور واپس لوٹ کر ثعالبی نے تصنیف و تالیف کے لیے عرصہ دراز تک اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

عبداللہ الجادر کے مطابق ثعالبی نے اسفرائیں کے سفر سے واپسی کے بعد 401 میں جرجانیہ کا سفر کیا اور وہاں کے امیر ابوالعباس مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار میں حاضری دی۔ مامون اپنے زمانے کا مشہور ادیب اور فنکار تھا، وہ شعر و ادب کا دل دادہ اور اہل ظرف کا قدردان تھا، اس کا قصر شاہی علم و ثقافت کا گہوارہ تھا جہاں وقت کے عظیم ترین فلاسفہ، فلکیات و علم نجوم کے ماہر ابن سینا اور ابوالریحان البیرونی جیسی شخصیات ہر وقت دیکھنے کو ملتی تھی، مامون نے ثعالبی کو اپنے خواص اور مقربین میں جگہ دی اور اسے طرح طرح کی آسائش اور آسودگی سے بہرہ مند کیا، ثعالبی نے امیر کی اس کرم فرمائی کے عوض ہدیہ کے طور پر اسے کئی کتابیں عنایت کی جن میں اس کی مایہ ناز تصانیف 'لطائف والظرائف'، 'نثر النظم وحل العقد'، 'الملوکی' اور 'الکنایۃ والتعریض' شامل ہیں۔ جرجانیہ میں قیام کی ایک مدت گزارنے کے بعد ثعالبی نے 407 ہجری میں افغانستان کے مشہور شہر غزنہ کا سفر کیا اور یہاں کے حاکم محمود بن سبکتگین سے ملاقات کر کے اس کی ظل عنایت حاصل کی۔ محمود نہایت دانشمند، خوش اخلاق، بردبار اور بلند پایہ عالم دین تھا لحاظہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری کا مصداق حقیقی تھا، غزنہ کا یہ سفر ثعالبی کے لیے بہت سعادت مند ثابت ہوا، عمر الطباع کے الفاظ میں اس سفر نے ثعالبی کے لیے خوش بختی کے دروازے کھول دیے اور اسے راحت و طمانیت سے سرشار کر دیا جو کہ آنے والے ایام میں تصانیف و تالیف کے کام کو انجام دینے میں اس کے لیے نہایت کارگر اور معاون ثابت ہوا۔(2)

یتیمۃ الدہر کے تراجم سے اس بات پر دلالت ملتی ہے کہ ثعالبی نے غزنہ میں وقت دراز تک سکونت اختیار کی اس مدت میں غزنہ کے اہل قلم، فقہاء اور قضاۃ سے وابستہ رہے اور ان کے سرچشمہ علم و ادب سے فیضیاب ہوتے رہے، ان میں الشیخ ابوالحسن محمد بن عیسی الکرجی، الشیخ العمید ابومنصور بن مشکان اور نابغہ عصر قاضی ابوالحسن بن الخلیل بن احمد البستی شامل ہیں جن کے بارے میں ثعالبی نے لکھا ہے کہ وہ ادبا اور علما کا زعیم ہے، اور سخا و مروت کا پیکر عالی ہے جس کے فضل و کرم، حسن سیرت، قوت بصیرت پر اس کے علمی آثار و اخبار غمازی کرتے ہیں، غزنہ میں ثعالبی کو جس چیز نے سب سے بڑھ کر

محظوظ کیا وہ سلطان محمود کے برادر امیر ابوالمظفر ناصرالدین کی شخصیت ہے جن سے ثعالبی نے طویل رفاقت پائی اور

> ثعالبی کی پوری زندگی عربی ادب کی خدمت سے عبارت ھے، اس نے ادب کی متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور ان میں اپنی فنکاری کے جواہرات بکھیر دیے، چنانچہ وہ جہاں ایک طرف شاعر، انشاپرداز اور مراسلہ نگار کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا وھیں دوسری جانب ماہر لغت اور تنقید نگار کی حیثیت سے مقبولیت عام حاصل کی یہاں تک کہ اہل علم نے اسے اپنے زمانے کا جاحظ اور امامِ ادب قرار دیا

ان کے گلہائے انعام و اکرامات کا فیضان حاصل کیا۔ امیر سے اپنے گہرے تعلقات کے پیش نظر ثعالبی نے ان کے لیے دو کتابیں تصنیف کی جو کہ 'یواقیت المواقیت' اور 'غرر السیر' کے نام سے مشہور ہیں۔

غزنہ میں طویل اقامت کے بعد ثعالبی نے 420 ہجری میں اپنے وطن نیشاپور کا قصد کیا جہاں اپنی بقیہ عمر اہل خانہ کے ساتھ آسودگی اور طمانیت میں گزاری، اخیر عمر میں 'تتمۃ الیتیمۃ' کے نام سے اپنی شاہکار تصنیف 'یتیمۃ الدہر' کا تکملہ لکھا جس کے ذریعہ اس کتاب کے نقائص کا ازالہ کرنے کی کوشش کی، علاوہ ازیں اس مدت میں کئی نایاب کتب کی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا جس میں 'ثمارالقلوب فی المضاف والمنسوب، فقۃ اللغۃ وسرالعربیۃ، بردالاکباد فی الاعداد، سحرالبلاغۃ وسرالبراعۃ اور مرآۃ المروء ات جیسی نادر کتب شامل ہیں، آخرکار 429ھ بمطابق 1038 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

خدمات

ثعالبی کی پوری زندگی عربی ادب کی خدمت سے عبارت ہے، اس نے ادب کی متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور ان میں اپنی فنکاری کے جواہرات بکھیر دیے، چنانچہ وہ جہاں ایک طرف شاعر، انشاپرداز اور مراسلہ نگار کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا وہیں دوسری جانب ماہر لغت اور تنقید نگار کی حیثیت سے مقبولیت عام حاصل کی یہاں تک کہ اہل علم نے اسے اپنے زمانے کا جاحظ اور امام ادب قرار دیا، ثعالبی نے کثیر تعداد میں کتب و رسائل لکھے جن کی تعداد مشہور مورخ الصفدی کے مطابق ساٹھ سے زائد ہے جن میں اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں: الاعجاز والايجاز، تحفة الوزراء، الاقتباس من القرآن الكريم، اجناس التجنيس، احسن ماسمعت، يتيمة الدهر فى محاسن اهل العصر، تحسين القبيح و تقبيح الحسن، التمثيل والمحاضرة، برد الكباد فى الاعداد، التوفيق للتلفيق، ثمارالقلوب، خاص الخاص، الظرائف واللطائف، غرر أخبار ملوك الفرس، فقه اللغة وسرالعربية، الكناية والتعريض، لطائف المعارف، المبهج، مرآت المروء ات، المنتحل، نثرالنظم وحل العقد، سحرالبلاغة وسرالبراعة، الانيس فى غرر التجنيس، نسيم الاسحر، الآداب، انس الوحيد، تحفة الظرفاء وفاكهة اللطفاء، سجع المنثور، محاسن الأدب، الملوكى، مواسم العمر، مؤنس الوحيد، نتائج المذاكرة وغیرہ۔

ثعالبی بحیثیت شاعر اور نثر نگار:

ثعالبی اپنی شاعری میں اپنے عصری ذوق کا تابع ہے لہٰذا لفظی زیب و زینت کا شیدا اور مبالغہ آرائی کا خوگر ہے۔ اس کی شاعری میں تخیل کی ندرت، الفاظ کی جدت اور معنی کی رنگینی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی لطافت ملتی ہے۔ ثعالبی نے مختلف اصناف سخن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جن میں مدح، وصف، اخوانیات، رثا، شکوی، غزل وغیرہ شامل ہیں۔ مدح میں ثعالبی کے اسلوب نگارش پر عواطف اور تصنع کا رنگ نمایاں ہے، وصف میں وہ خیال آفرینی اور کثرت تشبیہات کا سہارا لیتا ہے، اس

کی غزلیات میں رقت کا پہلو غالب ہے جب کہ مرثیہ اور شکوی میں قوت وجدان اور عمیق احساسات کی بھرمار ملتی ہے۔ ثعالبی کی شاعری کا بڑا حصہ اس کی تالیف 'خاص الخاص' کے آخری باب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

جہاں تک ثعالبی کی نثر نگاری کا تعلق ہے تو وہ اس کی شاعری کے طرز پر ڈھلی ہے، جہاں وہ اپنے استاذ ابوبکر الخوارزمی اور بدیع الزماں الہذانی کے اسلوب کی تقلید کرتا ہے۔ نثر کی اس صنف میں چھوٹے چھوٹے مسجع جملے، تجنیس، تاریخ اور دیگر علوم کے لطائف کی آمیزش، اثنائے عبارت میں شعروں سے استشہاد، نفس مضمون کی سلامتی وعمدگی کے ساتھ تخیل وتشبیہ میں وسعت لازمی قیود ہے۔ اس نثر کا سرخیل چوتھی صدی کا شہرآفاق انشاپرداز ابن العمید ہے جو کہ عبدالحمید کاتب کے بعد اس میدان کا سب سے بلند پایہ نثر نگار تصور کیا جاتا ہے۔ ثعالبی کی نثر پر قرآنی اسلوب کی چھاپ جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ قرآن کے دلکش طرز بیان، موعظہ حسنہ، اصطلاحات وتعبیرات سے استدلال کرکے کلام کی جاذبیت میں اضافہ کردیتا ہے جو کہ فنِ نثر میں اس کی پختگی اور مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ ثعالبی کی نثر کا ایک اہم حصہ اس کے مقدمات ہیں جو کہ اس کی تالیفات کی مابہ امتیاز خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ محمد ابوالفضل ابراہیم کے مطابق ثعالبی کی نثر میں بدیع کی رنگت، شعور کی بے لوثیت اور فکر کی عمدگی غالب ونمایاں ہے۔(3)

ثعالبی بحیثیت تنقید نگار

ثعالبی نے فن تنقید میں اپنے دقیق اور علمی نظریات پیش کرکے تنقید نگار کی حیثیت سے نام کمایا، اس باب میں اس کی تالیف 'یتیمۃ الدہر' کا تذکرہ اہم ہے جو کہ بلاشبہ ثعالبی کی فنی اور تنقیدی کاوشوں کی عکاس ہے، یہ کتاب چار مجلدات میں تقسیم ہے جو کہ فی الواقع منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ پہلی جلد میں اہل شام میں سے آل حمدان، مصر، موصل اور مغرب کے شعرا کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا ذکر ہے۔ جلد دوم میں اہل عراق کے شعرا اور دیلمیہ حکومت کی انشاپردازی کا تذکرہ ہے۔ تیسرا جز اہل جبل، فارس، جرجان، طبرستان اور اصفہان کے شاعروں، کاتبوں کے اشعار پر مشتمل ہے جب کہ جلد چہارم میں اہل خراسان، سامانی اور غزنی حکومت خاص کر نیشاپور اور وہاں کے شعرا و اہل ادب کے حالات کا ذکر ہے۔ ثعالبی کی یہ تقسیم اور درجہ بندی مختلف تنقیدی اصولوں پر مبنی ہے، جن میں فصاحتِ لغت، جدت اور عصری معنویت اہم ترین ہیں۔

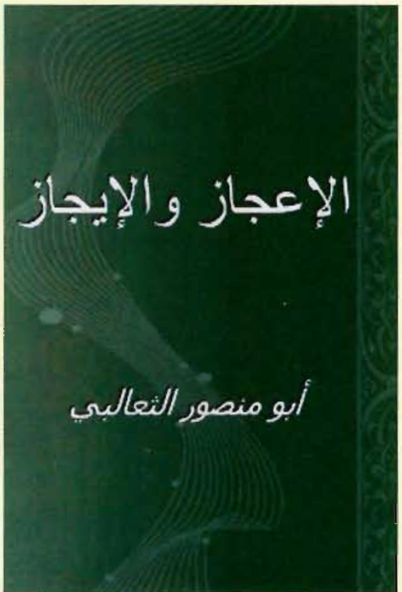

ثعالبی کی تنقید نگاری کا ایک اہم پہلو ابوالطیب المتنبی کی شاعری پر مشتمل ہے جو اس نے 'یتیمۃ الدہر' کے پانچویں باب کے لیے مخصوص کیا ہے اور اس باب کو پوری کتاب کا طرہ امتیاز قرار دیا ہے۔ متنبی کا عرب دنیا کے مقبول ترین شعرا کی صف میں شمار ہوتا ہے جسے عربی ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو شیکسپیئر Shakespeare کو انگریزی ادب میں اور لیوٹالسٹائی Leo Tolstoy کو روسی ادب میں حاصل ہے۔ متنبی کا تعلق چوتھی صدی سے ہے جس میں شعر وادب اپنے منتہائے عروج کو پہنچ گئے اور تنقید نگاری کے میدان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی۔ متنبی کی شاعری اس دور میں ناقدین اور ادبا کی مرکز توجہ بن گئی یہاں تک کہ انھوں نے اس پر مفصل مضامین، تشریحات اور تعلیقات لکھ کر اس کی فنی حیثیت کو واضح کردیا جن میں صاحب بن عباد، ابوعلی الحاتمی، ابن لوکیع، العمیدی، ابن جنی، عبدالعزیز الجرجانی اور خاص کر ابومنصور ثعالبی کی تحقیقات قابل ذکر ہیں۔

ثعالبی بحیثیت ماہر لغت:

ثعالبی کا عربی زبان کے ان ماہر لسانیات میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے عربی کے دیرینہ سرچشمہ لغت کی حفاظت و صیانت کا بیڑا اٹھایا اور اسے خارجی اثرات سے پاک کرکے گوہر نایاب بنا دیا، یہاں تک کہ مشہور مورخ ابن کثیر نے اسے اپنے زمانہ کا امام لغت قرار دیا، لغت کے میدان میں ثعالبی کی مقبولیت اس کی مابہ امتیاز تالیف 'فقہ اللغۃ و سرالعربیۃ' کی مرہون ہے جو کہ اس موضوع پر اپنی نوعیت کی منفرد تالیف ہے اور مصادر لغات میں شمار ہوتی ہے۔

ثعالبی اہل دانش کی نظر میں

☆ مشہور مورخ الحصری القیروانی لکھتے ہیں: ''ابومنصور ثعالبی نادرالوجود اور یکتائے روزگار ادیب ہے جس نے اصناف علم وادب میں طبع آزمائی کرکے اپنے بیش قیمت آثار چھوڑے جو اس کے بلند مقام ومرتبت پر دلیل ہیں۔''(4)

☆ ابوالحسن الباخرزی جو کہ ثعالبی کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں رقم طراز ہیں: ''وہ نیشاپور کا جاحظ ہے، اور عصر غابر کا لب لباب ہے، کسی آنکھ نے اس کی نظیر نہ پائی، نہ کوئی اہل خرد اس کے گنجینہ فضل علم وادب سے برگشت رہا، وہ ابر باراں ہے کہ ہر زبان اس کی مدح سرائی کرتی ہے، اور خورشید ضیا ہے جو کسی مقام سے پنہاں نہیں رہ پاتا۔''(5)

☆ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''وہ امام لغت واخبارِ ادب ہے جس نے شعر ونثر بلاغت وفصاحت میں کثرت سے اپنی فنی کمالات پیش کیے۔''(6)

☆ کمال الدین الدمیری لکھتے ہیں: ''وہ مولفین کا قائد اور مصنفین کا امام اور عمدہ گلہائے مضامین پر مشتمل کتابوں کا مصنف ہے، جن میں یتیمۃ الدہر اور ثمارالقلوب قابل دید ہیں۔''(7)

حواشی

(1) الذخيرة فى محاسن أهل الجزيرة: ابن بسام، دارالثقافة للطباعة والنشر، بيروت، ط1، ج4، ص560

(2) فقه اللغة، تأليف أبومنصور الثعالبى: تحقيق عمرالطباع، دارالأرقم بيروت، ص 7

(3) ثمارالقلوب فى المضاف والمنسوب، تأليف أبومنصور الثعالبى، تحقيق: محمد أبوالفضل ابراهيم، بيروت، ط1،1994م، ص2

(4) زهرالآداب: الحصرى القيروانى، المكتبة العصرية، صيدا، بيروت، ط1،2001م، ج1، ص63

(5) دمية القصر وعصرة أهل العصر، تأليف: الباخرزى، مطبعة العلمية، بحلب، ط1،1930م، ص183

(6) البداية والنهاية، تأليف: عمادالدين ابن كثير، تحقيق: الدكتور عبدالله بن عبدالمحسن، هجر للطباعة والنشر، ط1،1998م، ج5، ص672

(7) حياة الحيوان الكبرى: تاليف: كمال الدين الدميرى، تحقيق ابراهيم صالح، دارالبشائر للطباعة والنشر، دمشق، ط1،2005، ج1، ص178

Firdaus Nazeer Butt, New SRK Hostel, Room No 218, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

ادارہ

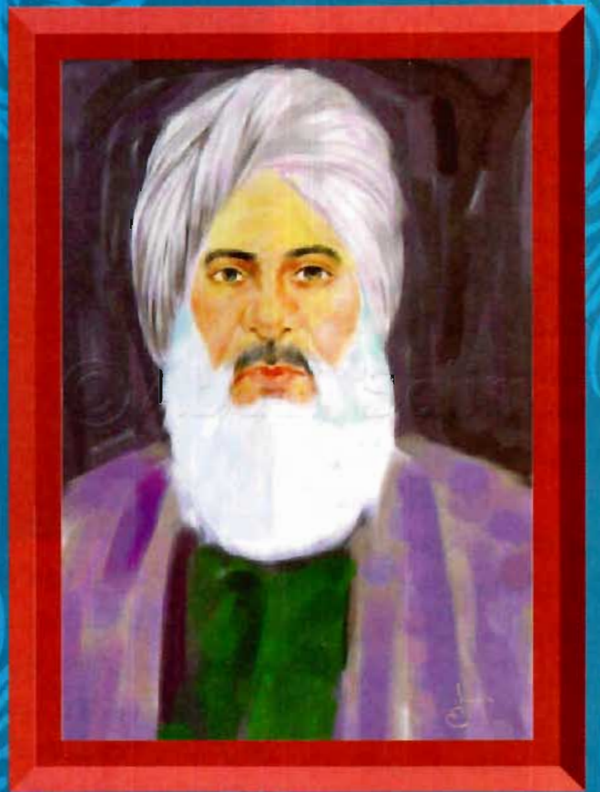

امیر احمد امیر مینائی

اردو ادب کے افق پر امیر مینائی کی پہچان ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے نعت وغزل گوئی میں ایک منفرد مقام بنایا ہے بلکہ نعت گوئی کو ایک نئی جہت اور خاص لہجہ دیا ہے۔ غالب اور داغ دہلوی کے زمانے میں بھی ان کی اہمیت کا اعتراف ناقدوں نے کیا ہے۔ امیر مینائی کا اصل نام امیر احمد اور تخلص امیر ہے۔ والد کا نام مولوی کرم محمد۔ ان کا شجرہ مخدوم مینا سے ملتا ہے۔ امیر کے خاندان نویں صدی ہجری میں لکھنؤ آئے اور اسی کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ امیر مینائی کی پیدائش 16 شعبان 1244ھ بمطابق 23 فروری 1826 میں لکھنؤ میں ہوئی اور 18 جمادی الثانی 1318ھ بمطابق 1900 بمقام حیدرآباد میں رحلت فرماگئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق اپنے گھر اور قریب کے مکاتب میں ہوئی۔ بعد میں لکھنؤ کے فرنگی محل میں مفتی سعداللہ اور ان کے ہم عصر علما سے فیضیاب ہوئے۔ شاعری میں مظفرعلی خاں اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ 1852 میں نواب واجدعلی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی اور حسب ہدایت دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کیں۔ 1857 میں اودھ کے روائل کورٹ سے وابستہ ہوگئے اور بعد میں روائل کورٹ آف رام پور ہوگئے۔ امیر مینائی کی شخصیت میں بڑی تہہ داری تھی انھیں کئی فنون پر مہارت حاصل تھی۔ 50 سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ 'عبرت بہارستان' 1857 کے ہنگامے میں شائع ہوئی۔ موجودہ تصنیف میں 'مراۃ الغیب' اور 'صنم خانہ عشق' بہت مشہور ہیں اور ایک نعتیہ دیوان 'محامد خاتم النبیین' ان کی چند مثنویاں 'نور تجلی'، 'لیلۃ القدر'، 'شام اودھ' اور 'ابر کرم' قابل ذکر ہیں۔ ان کی مثنویوں کا رنگ بے حد مذہبی ہے۔ مضامین 'دل آشوب' اور 'مجموعہ واسوخت' مشہور زمانہ ہے۔ نثری تصانیف میں 'انتخاب یادگار شعرائے رام پور' کا تذکرہ ہے، جو نواب کلب علی خاں کے ایما پر 1890 میں لکھا گیا۔ لغات میں بہار ہند ایک مختصر لغت ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ 'امیر اللغات' ہے۔ جو آٹھ جلدوں میں پورا ہونا تھا لیکن اس کی دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک ہی شائع ہوکر منظر عام پر آسکیں۔

یوں تو امیر مینائی کی اردو اور فارسی میں اب تک 19 کتابیں دستیاب ہیں جس میں اردو کے گیارہ اور فارسی کے آٹھ ہیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر آچکا ہے۔ بقیہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

نغمہ قدسی، سرمۂ بصیرت یا معیار الاغلاط، بہار ہند، رموز غیبیہ، رمز الغیب، رسالہ بحث اعداد حروف تہجی۔

زادالامیر، مکاتیب امیر مینائی، خیابان آفرینش، نثر در تعریف قیصر باغ، نماز کے اسرار، وظیفہ خلیلہ، جان تاریخ، گنجینہ قوافی۔

امیر مینائی کا تعلق دبستان لکھنؤ سے ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں لکھنوی شاعری کے اوصاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔ امیر مینائی کی غزل میں لکھنوی فصاحت اور سلاست کا ایک منفرد انداز ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اکہرا پن کی بجائے تہہ داری ہوتی ہے جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ تشبیہ و استعارے کے استعمال میں امیر مینائی ہنرمندی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نسوانی حسن و جمال کی کیفیت ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں:

ہائے وہ دیکھ کے ابھرا ہوا جوبن ان کا
دونوں ہاتھوں سے مرا شب کو دبانا دل کا
باقی نہ کوئی دل میں ایسی ہوس رہے
چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے

گویا رنگینی اور مرصع سازی میں بھی اپنے کمال فن کو آخری حدود تک لے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بسا اوقات شوخ تصویریں پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ ساتھ ہی الفاظ کی شوخی بھی جگہ جگہ ملتی ہے۔ تاہم سطحیت چھوتک نہیں جاتی۔ یہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

عجب عالم ہے اس کا وضع سادی شکل بھولی ہے
کبھی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے
کرے گا یاد اے غم ہم کو بعد مرگ تو برسوں
کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں
امیر ایسی ادائیں حور وغلماں میں کہاں ہوں گی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا
بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

ہے سبزہ رنگ خط بھی بنا اب تو بوسہ دے
بیگانہ تھا جو سبزہ چمن سے نکل گیا

مدنظر رہی ہمیں ایسی رضائے دوست
کاٹی زباں جو شکوہ دہن سے نکل گیا

میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیر
بلبل چہک کے صحنِ چمن سے نکل گیا

فراق یار نے بے چین مجھ کو رات بھر رکھا
کبھی تکیہ ادھر رکھا کبھی تکیہ اُدھر رکھا

برابر آئینے کے بھی نہ سمجھے قدر وہ دل کی
اسے زیرِ قدم رکھا اسے پیشِ نظر رکھا

تمہارے سنگِ در کا ایک ٹکڑا بھی جو ہاتھ آیا
عزیز ایسا کیا مر کر اسے چھاتی پہ دھر رکھا

نہ کی کس نے سفارش میری وقتِ قتل قاتل سے
کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا

بڑا احساں ہے میرے سر پہ اس کی لغزشِ پا کا
کہ اس نے بے تحاشا ہاتھ میرے دوش پر رکھا

ترے ہر نقش پا کو رہگزر میں سجدہ گہ سمجھے
جہاں تو نے قدم رکھا وہاں میں نے بھی سر رکھا

امیر اچھا شگونِ مے لیا ساقی کی فرقت میں
جو برسا ابرِ رحمت، جائے مے شیشوں میں بھر رکھا

وصل کی شب بھی خفا وہ بتِ مغرور رہا
حوصلہ دل کا جو تھا دل میں بدستور رہا

جمع کس دن نہ ہوئے موسمِ گل میں میکش
روز ہنگامہ بہ سایۂ انگور رہا

گردش بخت کہاں سے ہمیں لائی کہاں؟
منزلو وادیِ غربت سے وطن دور رہا

فصلِ گل آئی گئے صحنِ چمن میں سو بار
اپنے سر میں تھا جو سودا وہ بدستور رہا

جلوۂ برقِ تجلی نظر آیا نہ کبھی
مدتوں جا کے میں شجرِ طور رہا؟

ہم بھی موجود تھے کل محفل جاناں میں امیر
رات کو دیر تلک آپ کا مذکور رہا

ہٹاؤ آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں
تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں

تڑپ کے روح یہ کہتی ہے ہجرِ جاناں میں
کہ تیرے ساتھ دل بے قرار ہم بھی ہیں

رہے دماغ اگر آسماں پہ دور نہیں
کہ تیرے کوچہ میں مشتِ غبار ہم بھی ہیں

ہمارے آگے ذرا ہو سمجھ کے زمزمہ سنج
کہ ایک نغمہ سرا اے ہزار ہم بھی ہیں

کہاں تک آئینے میں دیکھ بھال، ادھر دیکھو
کہ اک نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں

ہمارا نام بھی لکھ لو جو ہے قلم جاری
قدیم آپ کے خدمت گزار ہم بھی ہیں

جو لڑکھڑا کے گرے تو قدم پہ ساقی کے
امیر مست نہیں ہوشیار ہم بھی ہیں

مے پئیں کیا کہ کچھ فضا ہی نہیں
ساقیا باغ میں گھٹا ہی نہیں

خضر کیا جانے مرگ کی لذت
اس مزے سے وہ آشنا ہی نہیں

شعر وصفِ دہن میں سن کے کہا
ایسا مضموں کبھی سنا ہی نہیں

کیا سنیں گے وہ خلق کی فریاد
کہتے ہیں جو کوئی خدا ہی نہیں

لذتِ عیشِ وصل کیا جانیں
اس میں حصہ ہمیں ملا ہی نہیں

کل تلک تھا وہ ربط و اخلاص
آج وہ شوخ آشنا ہی نہیں

مرنے والوں سے کہتے ہیں وہ امیر
کیا تمھاری کبھی قضا ہی نہیں

منہ پھر نہ کر وطن کی طرف یوں وطن کو چھوڑ
چھوٹے جو بوئے گل کی طرح سے چمن کو چھوڑ

اے روح، کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے، اب اس پیرہن کو چھوڑ

ہے روح کو ہوس کہ نہ چھوڑے بدن کا ساتھ
غربت پکارتی ہے کہ غافل، وطن کو چھوڑ

کہتی ہے بوئے گل سے صبا آ کے صبح دم
اب کچھ اِدھر اُدھر کی ہوا کھا، چمن کو چھوڑ

تلوار چل رہی ہے کہ یہ تیری چال ہے
اے بُت خدا کے واسطے اِس بانکپن کو چھوڑ

شاعر کو فکر شعر میں راحت کہاں امیر
آرام چاہتا ہے تو مشقِ سخن کو چھوڑ

اچھے عیسی ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بیتابی کو
ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

آگیا اس کا تصور تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی یہ خیال اچھا ہے

برق اگر گرمیِ رفتار میں اچھی ہے امیر
گرمیِ حسن میں وہ برقِ جمال اچھا ہے

جب سے بلبل تونے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سِن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہے ایک کم سِن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر
بھیجتے تحفہ موذِن کے لیے

تیر پر تیر لگاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے میری جان جگر کس کا ہے

خوفِ میزانِ قیامت نہیں مجھ کو اے دوست
تو اگر ہے مرے پلّے میں تو ڈر کس کا ہے

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل
آنکھ کھولے ہوئے شاہینِ نظر کس کا ہے

نامِ شاعر نہ سہی شعر کا مضمون ہو خوب
پھل سے مطلب ہمیں کیا کام شجر کس کا ہے

صید کرنے سے جو ہے طائرِ دل کے منکر
اے کماندار تیرے تیر میں پر کس کا ہے

میری حیرت کا شبِ وصل یہ باعث ہے امیر
سر بہ زانو ہوں کہ زانو پہ یہ سر کس کا ہے

وصل ہو جائے یہیں، حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

محتسب پوچھ نہ تو شیشے میں کیا رکھا ہے
پارسائی کا لہو اس میں بھرا رکھا ہے

کہتے ہیں آئے جوانی تو یہ چوری نکلے
میرے جوبن کو لڑکپن نے چرا رکھا ہے

اس تغافل میں بھی سرگرمِ ستم وہ آنکھیں
آپ تو سوتے ہیں، فتنوں کو جگا رکھا ہے

آدمی زاد ہیں دنیا کے حسیں لیکن امیر
یار لوگوں نے پری زاد بنا رکھا ہے

ایک دل ہمدم، مرے پہلو سے، کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

سب کرشمے تھے جوانی کے، جوانی کیا گئی
وہ اُمنگیں مِٹ گئیں، وہ ولوَلا جاتا رہا

درد باقی، غم سلامت ہے، مگر اب دل کہاں
ہائے وہ غم دوست، وہ درد آشنا جاتا رہا

آنے والا، جانے والا، بیکسی میں کون تھا
ہاں مگر اک دم، غریب آتا رہا جاتا رہا

آنکھ کیا ہے، موہنی ہے، سحر ہے، اعجاز ہے
اک نگاہِ لطف میں سارا گِلا جاتا رہا

جب تلک تم تھے کشیدہ، دل تھا شکووں سے بھرا
تم گلے سے مِل گئے، سارا گلا جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا، رہتا تو کیا ہوتا، امیر
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

میرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

پس مرگ کاش یوں ہی مجھے وصل یار ہوتا
وہ سر مزار ہوتا، میں تہِ مزار ہوتا

ترا میکدہ سلامت، ترے خم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اُترتا، مجھے کیوں خمار ہوتا

مرے اتقا کا باعث تو ہے مری ناتوانی
جو میں توبہ توڑ سکتا تو شراب خوار ہوتا

میں ہوں نامراد ایسا کہ بلک کے یاس روتی
کہیں پا کے آسرا کچھ جو امیدوار ہوتا

نہیں پوچھتا ہے مجھ کو کوئی پھول اس چمن میں
دلِ داغدار ہوتا ہو گلے کا ہار ہوتا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

دمِ نزع بھی جو وہ بت مجھے آ کے منہ دکھاتا
تو خدا کے منہ سے اتنا نہ میں شرمسار ہوتا

نہ مَلَک سوال کرتے، نہ لحد فِشار دیتی
سرِ راہِ کوئے قاتل جو مرا مزار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہوں لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈ نے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

وصل میں چھیڑ نہ اتنا اسے اے شوق وصال
کہ وہ روئے تو کسی طرح منا بھی نہ سکوں

ڈال کر خاک مرے خون پہ، قاتل نے کہا
کچھ یہ مہندی نہیں میری کہ چھپا بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دے میں بھلا بھی نہ سکوں

ہائے کیا سحر ہے یہ حسن کی مانگیں جو حسیں
دل بچا بھی نہ سکوں جان چھڑا بھی نہ سکوں

ایک نالے میں جہاں کو تہہ و بال کر دوں
کچھ تیرا دل یہ نہیں ہے کہ ہلا بھی نہ سکوں

دل جو سینے میں زار سا ہے کچھ
غم سے بے اختیار سا ہے کچھ

رخت ہستی بدن پہ ٹھیک نہیں
جام مستعار سا ہے کچھ

چشم نرگس کہاں وہ چشم کہاں
نشہ کیسا خمار سا ہے کچھ

نخلِ اُمید میں نہ پھول نہ پھل
شجرِ بے بہار سا ہے کچھ

ساقیا ہجر میں یہ ابر نہیں
آسمان پر غبار سا ہے کچھ

کل تو آفت تھی دل کی بیتابی
آج بھی بے قرار سا ہے کچھ

مردہ ہے دل تو گور ہے سینہ
داغ شمع مزار سا ہے کچھ

اِس کو دنیا کی اُس کو خلد کی حرص
رند ہے کچھ نہ پارسا ہے کچھ

پہلے اس سے تھا ہوشیار امیر
اب بے اختیار سا ہے کچھ

سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا آ رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

جواں ہونے لگے جب وہ تو ہم سے کر لیا پردہ
حیا یک لخت آئی اور شباب آہستہ آہستہ

شبِ فرقت کا جاگا ہوں فرشتو اب تو سونے دو
کہیں فرصت میں کر لینا حساب آہستہ آہستہ

سوالِ وصل پر ان کو خدا کا خوف ہے اتنا
دبے ہونٹوں سے دیتے ہیں جواب آہستہ آہستہ

ہمارے اور تمھارے پیار میں بس فرق ہے اتنا
اِدھر تو جلدی جلدی ہے اُدھر آہستہ آہستہ

وہ بے دردی سے سرکاٹے امیر اور میں کہوں ان سے
حضور آہستہ آہستہ جناب آہستہ آہستہ

اے ضبط دیکھ عشق کی ان کو خبر نہ ہو
دل میں ہزار درد اٹھے آنکھ تر نہ ہو

مدت میں شامِ وصل ہوئی ہے مجھے نصیب
دو چار برس تک تو الٰہی سحر نہ ہو

اک پھول ہے گلاب کا آج ان کے ہاتھ میں
دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کسی کا جگر نہ ہو

ڈھونڈے سے بھی نہ معنیِ باریک جب ملا
دھوکا ہوا یہ مجھ کو کہ اس کی کمر نہ ہو

الفت کی کیا امید وہ ایسا ہے بے وفا
صحبت ہزار سال رہے کچھ اثر نہ ہو

طولِ شبِ وصال ہو مثلِ شبِ فراق
نکلے نہ آفتاب الٰہی سحر نہ ہو

میں رو کے آہ کروں گا جہاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

رہے وہ جانِ جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے
مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

ابھی مزار پر احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد
پھر اختیار میں غافل زباں رہے نہ رہے

خزاں تو خیر سے گزری چمن میں بلبل کی
بہار آئی ہے اب آشیاں رہے نہ رہے

چلا تو ہوں پئے اظہارِ دردِ دل، دیکھوں
حضورِ یار مجالِ بیاں رہے نہ رہے

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

▪ ادارہ

سید مسعود حسن رضوی ادیب

سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام محمد مسعود تھا۔ ان کے والد حکیم سید مرتضیٰ حسین ایک طبیب تھے۔ مسعود حسن رضوی کا وطن نیوتنی اناؤ ہے لیکن بعد میں لکھنؤ میں قیام پزیر ہوئے۔ مسعود حسن کی پیدائش 29 جولائی 1893 کو بہرائچ میں ہوئی جہاں ان کے والد ملازمت کی وجہ سے رہائش پزیر تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد اپنی نانی کے یہاں اناؤ میں رہنے لگے کیونکہ 11 برس کی عمر میں ہی والد مرتضیٰ حسین اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اناؤ کے ورنا کیولر اسکول سے ہی 1908 میں درجہ ہشتم کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد حسین آباد ہائی اسکول سے 1913 میں میٹرک پاس کیا، اس دوران ان کے سر میں درد کی شکایت شروع ہوگئی جو طویل وقت تک رہی۔ اِس مرض کے باوجود مسعود حسن کے حوصلے میں کمی نہیں آئی اور انھوں نے 1915 میں کیننگ کالج (لکھنؤ یونیورسٹی) سے انٹرمیڈیٹ اور 1917 میں گریجویشن مکمل کیا۔ بی اے کرنے کے بعد ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن مکمل نہیں کرسکے کیونکہ اپریل 1918 میں محکمہ تعلیم کے کیٹلاگ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔

1922 میں گورنمنٹ ٹریننگ کالج الہ آباد سے ایل ٹی کی ڈگری لی اور گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں مدرس مقرر کیے گئے۔ ابھی اس ملازمت کو ایک ماہ گزرا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کے طور پر تقرر ہوگیا۔ عمر کے آخری دور تک لکھنؤ یونیورسٹی میں ہی ملازمت کرتے رہے۔ ملازمت کے دوران ہی 1924 میں ایم اے فارسی کے امتحان میں اول درجے سے کامیابی حاصل کی۔ اگست 1927 میں شعبہ اردو و فارسی کے سینئر لکچرر بنائے گئے۔ اگست 1930 میں فارسی کے ریڈر بنے اور انھیں شعبے کا صدر بھی بنایا گیا۔ مئی 1953 میں انھیں فارسی و اردو کا پروفیسر بنا دیا گیا۔

15 جون 1954 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یکم اگست 1963 سے 3 جولائی 1966 تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذریعے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں تین برس کے لیے ریسرچ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ 29 نومبر 1975 کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں غازی الدین حیدر کربلا کے قریب دفن کیے گئے۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے اسکول کے دور میں ہی تصنیف وتالیف کا کام شروع کردیا تھا۔ ادب اور شاعری سے دلچسپی نے انھیں ایک بیاض تیار کرنے پر مجبور کیا اور محض تیرہ سال کی عمر میں 'اشعار برائے بیت بازی' تالیف کی جس میں الف سے ی تک اشعار درج کیے گئے تھے۔ انھیں سیکڑوں کی تعداد میں اشعار یاد تھے۔ لکھنؤ میں جوش ملیح آبادی، علی عباس حسینی، مرزا حامد حسین، مرزا ہادی رسوا، مولانا بے خود موہانی، یاس یگانہ چنگیزی اور دیگر صاحب ذوق شخصیات کی رفاقت نے ان کے ادبی ذوق وشوق کو پروان چڑھایا۔ وہ دور لکھنؤ کی زوال پزیر تہذیب کا دور تھا، انھیں اس شہر کی ادبی روایات اور برسوں کی تہذیبی شناخت کے ختم ہونے کا اندازہ تھا اس لیے انھوں نے لکھنؤ اور واجد علی شاہ کو اپنی تصنیفات میں خصوصی موضوع بنایا اور اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کیں۔

ان کی اہم تصنیفات میں ہماری شاعری، اردو زبان اور اس کا رسم خط، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، آئینہ سخن فہمی، نگارشات ادیب، انیسیات، دیوان تاباں، سلطان عالم، واجد علی شاہ وغیرہ ہیں۔ انھوں نے کئی اہم کتابوں کی ترتیب وتالیف بھی انجام دی۔

مسعود حسن رضوی ادیب آغاز سے ہی شاعری کی جانب متوجہ رہے۔ لیکن شعر کم کہے اور شعر فہمی میں ملکہ حاصل کیا۔ ان کی کتاب ہماری شاعری کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے۔ ان کی تحقیق وتنقید سے دیگر محققین نے اختلافات بھی کیے لیکن انھوں نے کبھی دل چھوٹا نہیں کیا بلکہ ان اختلافات کو کھلے دل سے تسلیم کیا اور پھر اپنے مضامین میں مدلل جوابات دیے۔ 1948 میں شائع ہوئی اردو زبان اور اس کا رسم خط میں انھوں نے اردو کے تحفظ کی آواز اٹھائی اور ملک کی تقسیم کے بعد اردو پر لگائے جارہے الزامات کا جواب دیا۔

آج یہ عظیم محقق اور ناقد ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی عظیم نگارشات آج بھی ان کی عظمت کا ثبوت پیش کررہی ہیں۔ ان کے فرزند نے اپنے والد کی ادبی میراث کو مزید وسعت دی اور نیر مسعود کے نام سے بطور ناقد اور فکشن نگار ساری اردو دنیا میں مقبول ومعروف ہیں۔

(بحوالہ بیسویں صدی (نصف اوّل) کے اردو مصنفین، سنجیدہ خاتون، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2004)

▪

اردو شاعری کے معشوق پر ایک نظر

مسعود حسن رضوی ادیب

تمہید

ہمارے تعلیمی نظام کی خوبی دیکھیے کہ جولوگ عمریں تحصیل علم کی نذر کردیتے ہیں اور یونیورسٹیوں کی سندیں جان کے مول خریدتے ہیں، وہ بھی اپنی زبان سے ناواقف اور اپنے اَدب سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اردو ہی میں ہماری زبان کھلی ہے، اردو ہی ہم نے آغوش مادر کے مکتب میں سیکھی ہے، لیکن جب کسی معمولی سے معمولی مبحث پر گفتگو کرنے بیٹھتے ہیں تو بغیر انگریزی کا سہارا لیے ہماری زبان چل نہیں سکتی۔

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نے سچ کہا ہے:

سیکھا انگریزی کا تو علم ادب
پر ہیں اپنی زباں سے جاہل سب
ذوق تقریر سے نہیں آگاہ
طرز تحریر سے نہیں آگاہ
کچھ بلاغت سے رابطہ ہی نہیں
کچھ فصاحت سے واسطہ ہی نہیں
جانتے ہی نہیں زبان کا لطف
مانتے ہی نہیں بیان کا لطف
اس کا نشہ دماغ ہی میں نہیں
یہ شراب اس ایاغ ہی میں نہیں

جب حال یہ ہو تو مآل کیا ہوگا؟ یہی کہ کبھی اپنی زبان تنگ نظر آئے، کبھی اپنی شاعری ناقص معلوم ہو۔

اردو شاعری کا جو حصہ اعتراض کی آنکھوں میں بہت کھٹکتا ہے، وہ ہے جو عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے، جذبات عشق میں ایشیا اور یورپ میں مشرق و مغرب کا فرق ہے، جن لوگوں نے صرف انگریزی صناعوں کی بنائی ہوئی محبت کی تصویریں دیکھی ہیں وہ ہمارے مصوروں کے کمال کی داد کیا دے سکتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کا تعلق جہاں تک ہے انگریزی اور اردو شاعری میں جسم و جان کا فرق ہے، انگریزی شاعروں نے اگر پیکر محبت کے مجسمے بنائے ہیں تو ہمارے شاعروں نے روح محبت کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔

اردو کے شعروں نے بہتوں کو مغالطہ دیا ہے۔ لوگوں نے فعلوں کی تذکیر سے معشوق کی تذکیر کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر حقیقت حال ان کے خیال کی تصدیق نہیں کرتی۔ شعر میں معشوق کے لیے مذکر فعل لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا، اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ غزل کے جن شعروں میں معشوق کا طبقۂ نسواں سے ہونا مسلم ہے ان میں بھی معشوق کے لیے مذکر ہی فعل یا صفت وغیرہ لائے ہیں، جیسے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
(داغ)

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے
(صفی)

میں ایسے صاحب عصمت پری پیکر پہ عاشق ہوں
کہ حوریں آکے پڑھتی ہیں نمازیں جس کے دامن پر
(آتش)

اِس مقام پر میں دفع دخل کے لیے یہ بھی بیان کیے دیتا ہوں کہ جب معشوق جنس اناث سے ہوتا ہے تو وہ مردانہ لباس میں کیوں پیش کیا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب عورتوں کا ذکر کرنا اور نام لینا تک شرم وحیا کے خلاف سمجھتی ہے، ان کے حسن و جمال کا کھلم کھلا بیان کرنا اور ان سے علانیہ عشق و محبت کا اظہار کرنا تو اتنا بڑا گناہ ہے کہ رشتے ناتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ باپ سے بیٹے اور بھائی سے بھائی چھوٹ جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ جب لوگ اپنے کسی رازدار دوست سے کسی عورت کا ذکر کرتے ہیں، خاص کر ایسی عورت کا جس سے دل کو کچھ لگاؤ ہو، تو کچھ اخفائے راز کے خیال سے اور زیادہ تر سوسائٹی کی ملامت کے ڈر سے اس کے لیے مذکر فعل لاتے ہیں۔ مثلاً ''وہ آئے تھے''۔ ''وہ یہ کہتے تھے'' غیر عورت کا کیا ذکر، خود اپنی بیوی کا ذکر غیروں کے سامنے نہیں کرتے اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو اس کو ''گھر کے لوگ'' کہتے ہیں اور اس کے لیے مذکر فعل استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ''ہمارے گھر کے لوگ آج مہمان گئے ہوئے ہیں۔'' ایسی حالت میں عقل سلیم ہمارے بلند اخلاق شاعروں سے یہ اُمید نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے معشوق کو جلسۂ عام میں بے نقاب لے آئیں، اگر وہ

شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کے اس کی جرأت کرتے بھی تو ان کا زمانہ ان کے کلام کو نہ عزت کی آنکھوں سے دیکھتا وقعت کے کانوں سے سنتا۔ ہمارے جن ہم وطنوں پر یورپی تہذیب کا رنگ چڑھا ہوا اُن کا مذاق اب تک ان شعروں کو رکیک اور مبتذل سمجھتا ہے۔ جن میں عورتوں سے علانیہ اظہار عشق کیا گیا ہے یا نسوانی خصوصیتوں کا ذکر صاف صاف لفظوں میں کر دیا گیا ہے۔

مثلاً ذوق کہتے ہیں:

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزن دیوار سے
وائے قسمت ہو اُسی روزن میں گھر زنبور کا

یا امانت لکھنوی کہتے ہیں:

شاعروں میں وہ پری زلف کو وا کیا کرتا
موشگافوں کو گرفتارِ بلا کیا کرتا

دیکھیے، پری، مؤنث حقیقی ہے لیکن اس کے لیے بھی فعل مذکر ہی آیا ہے۔

یہ ہماری تہذیب کا مقتضا تھا کہ ہمارے شاعروں نے نسوانی پیکروں پر الفاظ کا پردہ ڈال دیا، مگر کبھی یہ پردہ اتنا باریک ہو جاتا ہے کہ حقیقت پھوٹ نکلتی ہے۔ مثلاً:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
(نظام رام پوری)

اور کبھی رفتار و گفتار سے وہ نسوانیت ٹپکتی ہے کہ یہ پردہ اسے چھپا نہیں سکتا، مثلاً:

ہرادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
(داغ)

معشوق کے لیے مذکر فعل لانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ 'معشوق' اور اس کے مترادف لفظ محبوب، دوست، یار، بت، صنم، کافر، وغیرہ سب مذکر ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ان لفظوں کی تذکیر کا سبب وہی حیا پرستی اور غیرت شعاری ہو جسے ہندوستانی اخلاق کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غزل میں شاعر کسی خاص شخص کا عشق مخصوص شخص کے ساتھ نہیں دکھاتا۔ وہ مجرد جذبۂ عشق کی تصویریں کھینچتا ہے، عشق کی دنیا کے واقعات بیان کرتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی شخصیت یا جنسیت سے اُسے بحث نہیں ہوتی بلکہ ان کے باہمی تعلقات سے، عاشق و معشوق کا ذکر تو محض اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ بغیر ان کے ذکر کے عشق کا بیان ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص یہ بتانا چاہتا ہو کہ 'سیاہی' کسے کہتے ہیں تو لامحالہ اُسے کسی سیاہ چیز کی طرف اشارہ کرنا ہوگا۔ اب یہ چیز حبشی کا چہرہ ہو یا سر کے بال، کوے کا پر ہو یا چراغ کا کاجل۔ حقیقت میں اسے ان چیزوں سے کچھ بحث نہیں، صرف ان کے رنگ سے کام ہے۔ اسی طرح ہمارے شاعر غزل میں صرف عشق کی کیفیتیں اور وارداتیں بیان کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے ان کو ضرورت ہوتی ہے ایک ایسے شخص کی جس کو محبت ہو اور ایک ایسی ذات کی جس سے محبت ہو۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ محبت کرنے والا مرد ہے یا عورت، اور جس سے اس کو محبت ہے وہ مرد ہے یا عورت، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں عاشق یا معشوق کی جنس کی تشخیص ضروری نہیں ہے اور غزل میں معشوق کے لیے مذکر اور مونث فعلوں کا استعمال حقیقت میں یکساں ہے مگر جو کچھ ہم پہلی وجہ کے سلسلے میں بیان کر چکے ہیں اس کی بنا پر مذکر فعلوں کو ترجیح دی گئی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں ہزاروں نہیں لاکھوں شعر ہیں کہ تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پیر و مرید اور عبد و معبود کے تعلقات عاشقانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان شعروں میں کبھی پیر طریقت کے ساتھ اور اکثر خدا کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً:

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا (میر)
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے (درد)
ملتے ہیں تیرے چاہنے والے میں تیرے ڈھنگ
جو تجھ پہ مٹ گیا مجھے اس نے مٹا دیا (داغ)

ان شعروں میں معشوق کے لیے مذکر ہی فعل لانا چاہیے۔ گوکہ خدا کی ذات تذکیر و تانیث کے دائروں سے باہر ہے مگر ہماری زبان اس کا ذکر ہمیشہ مذکر فعلوں میں کرتی ہے۔

ان دلیلوں سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ غزل میں فعلوں کی تذکیر معشوق کی تذکیر کی دلیل نہیں ہو سکتی مگر اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ اردو میں جن عورتوں نے شاعری کی ہے انھوں نے غزل میں ہمیشہ ضمیر متکلم کے ساتھ مذکر فعل استعمال کیے ہیں۔

حضرت واجد علی شاہ کی بیگم نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کا مطلع ہے:

ہوکر خفا جو مجھ سے وہ رشک قمر گیا
میں جیتے جی وفورِ غم دل سے مرگیا

نواب شاہجہاں بیگم شیریں والیہ ریاست بھوپال فرماتی ہیں:

کیوں نہ اس حسرت سے میرا شیشۂ دل چور ہو
باغ تھا، ساقی تھا، سبزہ تھا، ہوا تھی، میں نہ تھا
تڑپا کیا میں درد غم انتظار میں
صورت نہ بے وفا نے دکھائی تمام شب

اسی طرح شمس النسا بیگم شرم لکھنوی کہتی ہیں:

اُس گل تر کی صفت میں جو غزل خواں ہوتا
گلِ مضموں سے گلستاں مرا دیواں ہوتا
اس پریزاد کو میں تابع فرماں کرتا
یعنی افسونِ محبت کا جو عامل ہوتا

یہ طریقہ کیوں رائج ہے؟ معترض تو خوش ہوئے ہوں گے کہ اردو کی عشقیہ شاعری کے خلاف فطرت ہونے کا ایک ثبوت اور ہاتھ لگا مگر برا ہو تحقیق کا کہ وہ ان کے ہر خیال کو باطل اور ہر دلیل کو قطع کر کے رہتی ہے۔ اچھا اب اس کا سبب سنیے۔ اردو کے عاشقانہ شعروں میں جب شاعر ضمیر متکلم لاتا ہے تو اس کی مراد اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ عاشق، اور عاشق سے بھی کوئی خاص شخص مراد نہیں ہوتا، بلکہ کوئی ذات جو عشق کی صفت سے متصف ہو، عام اس سے کہ وہ مرد ہے یا عورت اور حالت اطلاق میں مذکر فعلوں کے استعمال کی وجہ آپ ابھی خواجہ حالی کی زبان سے سن چکے ہیں۔

اگر بالفرض کوئی شاعرہ اپنے شعروں میں اپنے ہی عشق کی کہانی سنانا چاہتی ہو تو بھی اسے اپنے لیے مذکر ہی فعل لانا چاہیے۔ ہماری سوسائٹی مردوں کا اپنے عشق کو ظاہر کرنا بدترین گناہ سمجھتی ہے۔ عورتوں کی طرف سے عشق کا اظہار تو ایسا جرم ہے کہ ہمارے تمدن کی عدالت میں اس کی کم سے کم سزا قتل ہے۔ ایسی صورت میں کیونکر ممکن تھا کہ ہماری عورتیں اپنے عاشقانہ شعروں میں ضمیر متکلم کے ساتھ مونث فعل کا استعمال کرتیں۔ یہ حیا پرستی اور پردہ داری یہاں تک بڑھی کہ غزل میں مؤنث فعلوں، صفتوں وغیرہ کا استعمال خلاف عادت اور خلاف رسم ہو کر بالکل متروک ہوگیا اور جن شعروں میں کوئی بات شرم و حیا کے خلاف نہیں ہے ان میں بھی عورتوں نے اپنے لیے مذکر ہی فعل استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر میں اپنے استاد کی موت پر افسوس کرنے میں بھی شرم کو شرم آئی ہے۔ کہتی ہیں:

شعر جب کہتا ہوں میں تو ٹکڑے ہوتا ہے جگر
یاد آتا ہے مجھے لطف و کرم استاد کا

غرض کہ عورتوں کے کلام میں ضمیر متکلم کے ساتھ

بالعموم مذکر فعلوں کا استعمال ہونا ایک مضبوط ثبوت ہے اس بات کا کہ غزل میں فعل کی تذکیر فاعل کی تذکیر کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اب یہ فاعل خواہ عاشق ہو خواہ معشوق اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جس طرح معشوق کے لیے مذکر فعل اور صفتیں وغیرہ لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہے اسی طرح عاشق کے لیے مذکر فعلوں اور صفتوں وغیرہ کا آنا عاشق کے مرد ہونے کا ثبوت بھی نہیں ہے۔

اب غزل کے ان شعروں پر نظر کیجیے جو بہ ظاہر معشوق میں مردانہ اوصاف بیان کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد تو ایسے شعروں کی نکلے گی جن میں کسی کے حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

چہرہ ترا ساکب ہے سلطان خاوری کا
چیرا ہزار باندھے سر پر جو وہ زری کا
خط کی خوبی ترے عارض پہ کہتی ہے کہ مور
رونقِ ملک سلیماں نہ ہوا تھا سو ہوا (سودا)
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا (میر)

حسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو، انسان کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے، شاعر کے دل کو تو حسن سے وہ لگاؤ ہوتا ہے جو لوہے کو مقناطیس سے یا تنکے کو کہربا سے ہوتا ہے۔ پھر عام آدمیوں کے پاس صرف دل ہے زبان نہیں۔ شاعر کے پاس دل بھی ہے اور زبان بھی۔ یا یوں کہیے کہ عام آدمیوں کے پاس ایک بے زبان دل ہے اور شاعر کے پاس بولتا ہوا دل ہے۔ حسن کا جو اثر شاعر کے دل پر پڑتا ہے وہ اسے بیان بھی کرسکتا ہے۔ بلکہ حسن اور تاثراتِ حسن بیان کرنا ہی شاعر کا سب سے بڑا فریضہ ہے اور یہی قدرت بیان اسے عام عاشق سے ممتاز کر کے شاعر کا خطاب دلواتی ہے۔ جب حسن کی سچی تصویریں کھینچنا ہی شاعر کا کام ہے تو لڑکوں یا جوان مردوں کے حسن کا بیان کرنا کون سا گناہ ہے۔ اس حقیقت کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مردانہ حسن میں بھی دلکشی ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے شعر بداخلاقی پھیلاتے ہیں اور امرد پرستی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اس سخت اور بے بنیاد الزام پر ہماری شاعری چین بر جبیں ہو کر زبانِ حال سے کہہ اٹھتی ہے کہ میری خطا نہیں آپ کی تعلیم و تربیت اور عادات و اطوار کا قصور ہے۔ جب لڑکوں کے حسن کو محض ناقص اور نامکمل لفظی تصویریں آپ کو امرد پرستی کی طرف مائل کر دیتی ہیں تو حسن کی وہ ہنستی بولتی چلتی پھرتی مورتیں جو صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ آپ کو نہ معلوم کن بداخلاقیوں کی طرف کھینچتی ہوں گی۔ جن شاعروں نے لڑکوں کے حسن کا ذکر کیا ہے ان سے پہلے خالق حسن پر اعتراض کرنا چاہیے کہ اس نے لڑکوں اور مردوں کو حسن کیوں عطا کیا۔ شاعر کی زبان سے لڑکوں کے حسن کا بیان سن کر صرف وہی دل امرد پرستی کی طرف کھنچ سکتے ہیں جو حسین لڑکوں کو دیکھ کر اس شیطانی خواہش کی طرف جھک سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے اخلاق بلند ہیں ان کے لیے حسن کا بیان دلی مسرتوں کا سامان ہے اور حسن کا دیدار روحانی لذتوں سے سرشار۔ وہ مصنوع کے حسن میں صانع کا حسن دیکھتے ہیں اور اس کے کمال صنعت کے احساس سے متاثر ہوتے ہیں:

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو (انیس)
سراپا میں اُس کے نظر کر کے تم
جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے (میر)

یہ شعر جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، صرف مردانہ حسن کی تصویریں ہیں مگر غلط فہمی کا بھلا ہو کہ وہ حسن کے ذکر و عشق کا بیان سمجھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے شعروں کا شمار عشقیہ شاعری میں ہونا ہی نہ چاہیے۔

اب رہے وہ شعر جن میں معشوق کا جنس ذکور ہونا مسلم ہے۔ اول تو بقول خواجہ حالی ''مرد کا مطلوب مرد کو قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے۔ یہ محض ایک غلط فہمی اور قومی حمیت کے خیال پر مبنی ہے نہ حقائق و واقعات پر'' دوسرے ان شعروں کی تعداد اردو کی کل شاعری کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے بے تھاہ سمندر میں چند مچھلیاں۔ انصاف سے سوال ہے کہ صرف ان شعروں پر نظر کر کے اردو کی عشقیہ شاعری پر مجموعی حیثیت سے کوئی حکم لگا دینا کہاں تک جائز ہے پھر لطف یہ ہے کہ شعر بھی اس اعتراض کے دائرے میں نہیں آتے کہ یہ فطرت کے مخالف یا امرد پرستی کے موئید ہیں جن لوگوں کے نزدیک دو مردوں میں عشق ہونا ممکن نہیں ان کے لیے یہ سمجھ لینا کیا مشکل تھا کہ جن شعروں میں معشوق مرد ہے ان میں عاشق کوئی عورت ہوگی۔ عورت کا مرد پر عاشق ہونا تو فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ یہ فطرت شناسی کے مدعی اگر دنیا کی شاہ راہ پر آنکھیں کھول کر چلتے تو واقعات عالم خود بتا دیتے کہ مرد کا مرد سے عشق تو کوئی عجیب بات نہیں۔ جانور، درخت، مکان، غرض کہ کسی شے سے عشق ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ محمود اور ایاز کا عشق ضرب المثل ہے۔ جان عالم اور طوطے کی محبت ایک فرضی افسانہ سہی۔ لیکن سلطان بہادر والی گجرات کا اپنے طوطے سے محبت کرنا تو تاریخی واقعہ ہے۔

جو لوگ اس خیال میں الجھے ہوئے ہیں کہ معرکۂ عشق گرم ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ فریقین میں ایک مرد ہو اور ایک عورت، ان کا یہ خیال ہی بتاتا ہے کہ ان کی نظروں میں وہ وسعت نہیں کہ عشق کے مفہوم کا احاطہ کر سکیں۔ ان کے ذہنوں میں وہ رسائی نہیں کہ عشق کے مرتبے تک پہنچ سکیں۔ غلط فہمیوں نے انھیں یہ سمجھا دیا ہے کہ عشق صرف اس محبت کا نام ہے جو مرد اور عورت ہی میں ہوسکتی ہے اور جس میں نفسانی خواہشوں کا شائبہ بھی ضرور ہوتا ہے مگر ہمارے شاعروں کی اصطلاح میں یہ عشق نہیں ہوس ہے۔ عشق پاک اور بے غرض محبت کا نام ہے۔ نفسانیت کو اس سے کیا علاقہ۔ محبت جب خود غرضی، اور نفس پرستی کی سرحد سے گزر جاتی ہے تو عشق کا درجہ پاتی ہے۔ خواجہ میر درد لکھتے ہیں:

''بوالہوسی عشق مجازی نہیں ہے اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے پیر کی محبت وہ عشق مجازی ہے جو مطلوب حقیقی تک پہنچا دیتی ہے:

درد سر افزود از عشقِ بتاں
درد! من می خواستم دردِ دلے

ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

''میں کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوا، لیکن دل عاشقانہ صادقانہ پایا ہے۔ محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا، البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گزارا ہے۔''

ذیل کے شعر بھی بتائیں گے کہ اردو کے شاعر عشق اور ہوس میں امتیاز کرتے ہیں:

ایک دن تو ہم پہ تیغ کو تو بے دریغ کھینچ
تا عشق میں ہوس میں تنک امتیاز ہو (میر)
کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر (میر)
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی (غالب)

ہے ہے تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں
چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر (مومن)

بوالہوس کو بھی ہوا نقد محبت پہ غرور
یا الٰہی! کوئی لٹتا ہے خزانہ تیرا (داغ)

میں اوپر کہیں لکھ آیا ہوں کہ عشق کا جو معیار ہماری شاعری نے پیش نظر رکھا ہے وہ مجنوں ولیلیٰ، فرہاد وشیریں کا عشق ہے ان کے عشق کی کہانیاں ہر زبان پر ہیں مگر کیا اُن کے کسی جزو پر بھی نفس پرستی کی چھاؤں پڑتی ہے؟ اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ ہماری شاعری میں عشق سے خالص پاک اور بے غرض محبت مراد ہے اور اس طرح کی محبت کا دائرہ نہایت وسیع بلکہ نامحدود ہے۔ ایسی محبت جنس، سن، حسن، رنگ، وغیرہ کی تمام قیدوں سے آزاد ہے لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:

جمال شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداری ست
لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد
کہ نام آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری ست

قائم چاند پوری کہتے ہیں:

نے ناز نہ عشوہ ہے نہ تقطیع نہ چھب ہے
دل کو جو لبھائے ہے وہ کچھ اور سبب ہے

خالص محبت مرد سے ہوسکتی ہے، عورت سے ہوسکتی ہے، اپنے سے ہوسکتی ہے، غیر سے ہوسکتی ہے، بچے سے ہوسکتی ہے، بوڑھے سے ہوسکتی ہے، کالے سے ہوسکتی ہے، گورے سے ہوسکتی ہے، خوبصورت سے ہوسکتی ہے، بدصورت سے ہوسکتی ہے۔ ذیل کے شعر میرے بیان کی تائید کرتے ہیں:

نہ عارض نہ زلفِ دوتا دیکھتے ہیں
خدا جانے ہم تجھ میں کیا دیکھتے ہیں

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
(رند)

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تونے اسے کس آن میں دیکھا
(سودا)

اک رنگ کے جلوے نے کھینچا ہے مرے دل کو
صورت تو نہ میں سمجھا گوری ہے کہ کالی ہے
(سودا)

آں سیہ چردہ کہ رنگینی عالم با اوست
چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست
(حافظ)

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بہ یک نگاہے

جس طرح عشق و محبت کا مفہوم نہایت وسیع ہے، اسی طرح عاشق، معشوق، دوست، حبیب، محبوب، یار اور اس معنی کے اور تمام لفظوں کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے۔

خواجہ حافظ کہتے ہیں:

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت

مولانا حالی مرزا غالب کے مرثیے میں لکھتے ہیں:

دل مضطر کو کون دے تسکیں
ماتم یار غمگسار ہے آج

'یار' سے پہلے شعر میں کم سن بیٹا اور دوسرے شعر میں بوڑھا استاد مراد ہے۔

جو لوگ ان لفظوں کے مفہوم کی وسعت سے بے خبر ہیں اور عشقیہ شعروں کے معنی اپنے معین کیے ہوئے پست معیارِ عشق کے مطابق لیتے ہیں، انھیں اردو کی عشقیہ شاعری محدود معلوم ہوتی ہے، اردو شاعروں کا معیارِ عشق پست نظر آتا ہے اور وہ عشق کی نامحدود دنیا کی بے شمار نیرنگیوں سے کچھ بھی لطف نہیں اٹھا سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سبز عینک لگا لے اور یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کی ہر چیز سبز ہے۔

مندرجہ بالا دلیلیں ثابت کرچکیں کہ اردو کی عشقیہ شاعری کو امرد پرستی سے کوئی لگاؤ نہیں، مگر مزید اطمینان کے لیے ذرا اردو کے بڑے بڑے شاعروں کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے اور دیکھیے کہ ان کی معاشرت اور ان کے اخلاق آپ کو کس نتیجے پر پہنچاتے ہیں۔

خدائے سخن میر تقی میر کے کلام میں لڑکوں کے حسن کا ذکر اکثر آیا ہے۔ انھوں نے غالبًا ہر طبقے اور ہر پیشے کے لڑکوں کے حسن کی تعریف کی ہے، مگر ذرا میر کی زندگی پر نظر کرو۔ وہ ان کا تقدس! وہ توکل! وہ فقر! وہ استغنا! ایسے بزرگ کے نام کے ساتھ امرد پرستی کا ذکر کرتے ہوئے قلم کی زبان لڑکھڑاتی ہے خود فرماتے ہیں:

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

اس مقام پر نفسیات نے تحقیق کی نگاہ کو ایک نکتہ سجھایا ہے، ہمارے شاعروں نے جس بے تکلفی سے مردوں کے حسن اور لڑکوں کی محبت کا بیان کیا ہے وہ خود ان کے دلوں کی صفائی اور نیتوں کی درستی کی خبر دیتی ہے۔ اگر وہ امرد پرستی کے عذاب میں گرفتار ہوتے تو لڑکوں کے حسن و جمال کا ذکر کرکے اپنا راز کیوں فاش کرتے۔ ذیل کا واقعہ میرے اس خیال کی پرزور تائید کرتا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور طبیب سید فضل علی صاحب عرف حکیم میرن صاحب ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ میں جناب مفتی میر عباس صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر تھا، شعر و شاعری کا ذکر ہورہا تھا، اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا قبلہ وکعبہ آپ کا یہ شعر:

دل بہ طفل خورد سالے دادہ ام
وصل اورا احتمالے دادہ ام

آپ کی شان سے بہت پست ہے۔ فرمایا کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ طفل خورد سال کو دل دینے کا مضمون نہایت مبتذل ہے۔ میرے اس اعتراض پر حیرت سے فرمایا کہ بچوں سے محبت کس کو نہیں ہوتی ہے۔ اس میں ابتذال کی کیا بات ہے اور میں نے تو یہ شعر اپنے مرحوم بچے کی یاد میں کہا ہے۔ میں نے کچھ سکوت کے بعد عرض کیا کہ پھر دوسرے مصرعے میں اس کے وصل کے احتمال کا ذکر کیسا۔ فرمایا معصوم بچہ تو جنت میں پہنچ گیا۔ اگر میرے اعمال مجھے بھی جنت میں لے گئے تو وہاں اس سے ملاقات ہوگی اور چونکہ میرا جنت میں جانا یقینی نہیں ہے اس لیے اُس سے ملنے کا بھی یقین نہیں صرف احتمال ہے۔ یہ سن کر مجھے اپنی جسارت پر بڑی ندامت ہوئی۔ معترض اس واقعے کو ذرا کان کھول کے سنیں اور اپنی پست خیالیوں پر شرمائیں۔ اسی واقعے سے وہ غلط فہمیاں بھی دور ہوسکتی ہیں جو 'وصل' اور 'وصال' کے مفروضہ پست مفہوم سے پیدا ہوتی ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ کسی ایسے زمانے کا پتہ نہیں دیتی جب امرد پرستی دوزخ کا دروازہ نہ سمجھی گئی ہو۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی برے سے برا آدمی جو اس شیطانی عادت میں گرفتار بھی ہو، وہ سوسائٹی کی نفریں کے خوف سے اس پر پردہ ڈالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں ہمارے سنجیدہ مزاج شاعر جن کو ان کے زمانے نے عزت کی مسند پر بٹھایا تھا اگر بفرض محال اس بلا میں مبتلا بھی ہوتے تو بھی اس کا یوں علانیہ ذکر کرکے اپنی بداخلاقیوں کو طشت ازبام نہ کرتے۔ ان بلند خیالوں کو کبھی وہم بھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی امرد پرستی کو ان کی طرف منسوب کرسکے گا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ہماری اخلاقی پستی ہمیں وہ دن بھی دکھائے گی جب انسانی حسن یا اس کے بیان میں صرف یہ اثر رہ جائے گا کہ لوگوں کے حیوانی جذبات مشتعل ہوں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

□

ماخذ: ہماری شاعری: مسعود حسین رضوی،

محمد یعقوب عامر

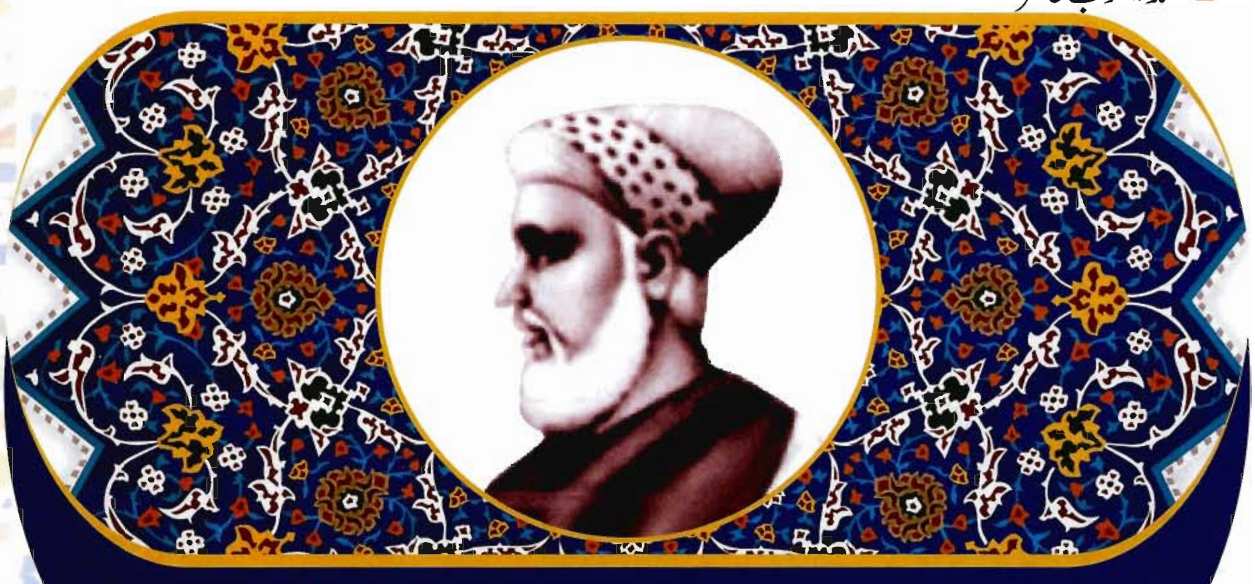

سودا کے دو ادبی معرکے

میر غلام حسین ضاحک

سودا کے ساتھ جن لوگوں کے معرکے رہے ان میں میر غلام حسین ضاحک کا نام سب سے مشہور رہے۔ اس کی وجہ ان کی وہ ہجویات ہیں جن کی شروعات ہی ہزل گوئی کی نچلی سطح سے ہوئی تھی۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا معرکہ ہے جس میں کسی بھی اخلاقی تکلف کا خیال کیے بغیر طرفین نے نہایت سوقیانہ پن کا ثبوت دیا۔ ظرافت اور بذلہ سنجی حد اعتدال سے بڑھ کر کیا گل کھلا سکتی ہے، یہ عبرت ناک اس داستان کو عام دلچسپی کا رنگ دے گئی۔

پرانے تذکروں میں خوش معرکۂ زیبا ہی ایسا تذکرہ ہے جس نے اس معرکے کو پوری تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔ صاحب تذکرہ لکھتا ہے کہ جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد میں آیا ہے، شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا۔ سبحان اللہ کیا وضع داری تھی، نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی:

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باآں کو کب تک

حاصل یہی اس سے نا کہ تا دنیا ہو
بالفرض ہوا یوں بھی تو تو کب تک

حضور پرنور اس رباعی سے خیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین بہ تخلص ضاحک کہ نمک خوار اور ہم مجلس و ہم صحبت تھے، واسطے رفع ملال کے بول اٹھے۔ اگر وہ حضور کے شقہ سے نہیں آیا۔ غلام بے طلب کھینچ بلاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا تمام اُسے مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چنانچہ یہ شعر:

پاؤں کھڈّی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
بال م ق ع د کے چنو ناک پہ دھر کے عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنے بہ حکم آنکہ دیوانہ راہوے۔ بس است روانہ لکھنؤ کا ہوا۔ میر سابق الذکر کی دلیری اور شیخ چشمی اُس پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجاں ہوا۔ اس فروتنی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاحب ہوا۔ واسطے عطر و پان حسب قاعدہ ہندستان کے اندر تشریف لے گئے اس عرصے میں کہ برآمد ہوں اس ٹھٹھول نے قلمداں کھولا اور یہ مطلع ایک پرچہ پر لکھا دیکھا:

رستم سے تو کہہ پیارے سر تیغ تلے دھر دے
یہ ہم ہی سے ہوتا ہے ہرکارے و ہر مردے

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا:

سودا نے اٹھا چوتڑ جب پاد دیا بھڑ دے
یہ اس سے ہی ہوتا ہے ہرکارے و ہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ مرزا نے قلمدان کھولا اور وہ مطلع لکھا دیکھا۔ یقین کلی ہوا کہ یہ سید نا سید اور نا معتمد ہے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا:

ریم سوزاک پدر ہے وہ شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

اوّل ترجیع بند شعر کہا اس کے بعد یہ قصیدہ:

ضاحکا کیوں نہ وہ پرواز کرے زیر فلک
پہنچی پشتین سے ہو نطفہ کی حلت جس تک

بعد خرابی بسیار باستدعاے میر حسن پسر غلام حسین ضاحک یہ، ہجو مولوی ساجد شاہ آبادی کے نام پر ہوئی، باقی ترجیع بند اور مخمس و مثنوی ہنوز بدستور۔''

(خوش معرکۂ زیبا (تلخیص) ص 36-34)

ناصر نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا اور ضاحک لکھنؤ کی اس ملاقات سے پیشتر ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ خاص کر یہ جملہ ''میر سابق الذکر کی دلیری اور شوخ چشمی اس پر ختم تھی کہ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ ہوا، اس بات کی طرف ذہن منتقل کرتا ہے کہ ابھی تک ضاحک سودا سے غائبانہ طور پر واقف تھے۔ ذاتی ملاقات نہیں تھی لیکن دہلی میں سودا جیسے مشہور و مقبول شاعر سے وہاں کے شاعروں کا ملاقاتی نہ ہونا نہ صرف یہ کہ عجیب سا لگتا ہے بلکہ بعید از قیاس ہے۔ ندرت کاشمیری کا وہ معرکہ جس کے ہر طرف چرچے تھے اور جس کے نتیجے میں انھیں دلی کو ہی خیر باد کہنا پڑا، ضاحک کی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ وہ ان سے نہ ملے ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس معرکے کی پہل کا ذمے دار سودا کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے خیال میں سودا کا وہ ترجیع بند جس کی ٹیپ 'ریم سوزاک پدر ہے تو شریر' باقاعدہ معرکہ آرائی سے پہلے کا کہا ہوا ہے جس کا مقصد ضاحک کو تنبیہ کرنا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

''ضاحک ہر شخص کی ہجو کہتے تھے۔ ان میں بعض لوگ سودا کے ملنے والے بھی تھے۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور انھوں نے ضاحک کی ہجو کہہ دی۔ اس معرکہ کی ابتدا غالباً اس ترجیع بند سے ہوئی:

کچھ مری ہجو تو اے بھڑوے نٹ
تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ

آخر شعر بتا رہا ہے کہ ضاحک نے ابھی تک سودا کی ہجو نہیں کی تھی اور ضاحک نے میر نواب ان کے بھائی مرزا بہلو، مرزا علی اور معالج خاں، وغیرہ کی ہجویں کہی تھیں وہ سودا کو ناگوار گزریں اور یہی ناگواری ہجو گوئی کی ابتدا کا سبب بنی۔'' (خلیق انجم: مرزا محمد رفیع سودا، علی گڑھ 1966ء، ص 316-317)

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس ترجیع بند کو اس معرکہ کی بنیاد بتایا ہے اور اس کے نفس مضمون سے ثابت کیا ہے کہ اب تک ضاحک نے ان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ چونکہ یہ ترجیع بند اس سلسلے میں کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے اس کے کچھ بندوں کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام
کیوں کیا کرتا ہے ہجو خاص و عالم
آپ کو کہتا تو سید ہوں میں
جد مرا پوچھو تو ہے خیرالانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں
ہو اگر ختمِ رسالت کا کلام
ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

سن تو اے نصف انساں نصف خر
ہم نے کیا سید نہیں دیکھے مگر
ہتک حرمت پر خدا کی خلق کے
کب کسی سید نے باندھی ہے کمر
ریزہ چیں جس جس کے ہے تو خوان کا
ہجو کر اس اس کی ہر شام و سحر
رات دن پڑھتا پھرے ہے اے لعیں
اس کی اس کے گھر میں اس کی اس کے گھر
بیش کم تجھ میں نہ دیکھا عقل و حمق
نطفے کی ترکیب کا ہے یہ اثر
سید اے میر مثلث آپ کو
کہنا اتنا ہو کے بے خوف و خطر
ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

تجھ سے نے دعویٰ مصاحب خاں کو ہے
ہے نہ ہسّو خاں کو ذرہ ہم سری
بس بتا باعث انھوں کی ہجو کا
بد عبث کہتا تو ہے بد گو ہری
ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

کہہ معالج خاں نے تیرا کیا لیا
تو جو اُن کا منھ میں اپنے گہ بھرے
میر نواب اور اُن کے بھائی کی
ہجو تو کرتا ہے وہ ہیں منگرے
میں یہ سمجھوں ہوں کہ تو اس وضع سے
آج اگر جیتا بچے تو کل مرے
میرزا بہلو سے تا مرزا علی
نظم میں آئے ترے سب سے پرے
اور نام اُن کا تو لے سکتا نہیں
جن سے ہیں یہ شخص رہتے میں ورے
تجھ سوا کس میر کی ایسی ہے شکل
جس کی صورت دیکھ کر شیطاں ڈرے
ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

کچھ میری ہجو تو اے بھڑوے نٹ
تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ
جو ترے دل میں ہو کہہ تو شوق سے
دیکھ تو ٹک یار بھی ہیں کیا اکٹ
ہجو کی ہے تو نے ان کی آج تک
جوں بھی جن سے مر نہیں سکتی ہے چٹ
عیب دنیا کیا ہے جو مجھ میں نہیں
جو تو چاہے کہ نہیں اس میں کپٹ
بات کیا ہے وہ کہ اب میرے تئیں
جس کے ظاہر ہونے سے لاگے ہے چٹ
مولوی صاحب کو جو پھر کچھ کہا
دیکھیو کیسا کروں گا چپت ڈپٹ
آوے جو خاطر میں تیرے مجھ کو کہہ
اے دنی شاں اس میں کیا جاوے گی گھٹ
پھر نہ کہیو میر ہرگز آپ کو
یوں زبان خلق کو لاگے گی رٹ

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہے میر

آخری اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضاحک نے ایک مولوی صاحب کی ہجو لکھی تھی۔ یہ تنبیہ اسی سلسلے میں ہے۔

محمد حسین آزاد نے سودا اور میر ضاحک کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جو مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے متعلق ہے۔

’’سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا۔ یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر۔ تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام۔ میر مہدی حسن فراغ... کو خدا مغفرت کرے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا وشعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے ... اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے ... سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست وگریبان ہوگئے۔ سکندر بے چارے حیران۔ کہ نہ واسطہ نہ سبب۔ یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس مخمس کا پہلا بند ہے:

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک . . . کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہوا گر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے گہہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر‘‘

(محمد حسین آزاد، آب حیات، شیخ مبارک علی تاجر، لاہور ص183)

اس مخمس کے جواب میں لکھا ہوا ایک ہجویہ مخمس دیوان میر حسن میں موجود ہے۔ جو میر ضاحک کی تصنیف ہے اور غلطی سے میر حسن کے دیوان میں شامل ہوگیا ہے۔

اس کا پہلا بند یہ ہے:

ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے یہ مچھندر
بکرے کا ہے وہ . . . اور زادۂ قلندر
باندھے ہے جب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر
لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثالِ بندر
. . . ڈرے ہے تیرا . . . . یہ ہے سکندر

واقعات مذکورہ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس معرکے میں سودا کی طرف سے پہل ہوئی ہوگی۔

اس معرکے کی درمیانی کڑیاں گم ہوجانے کی وجہ سے تدریجی ارتقا معلوم نہ ہوسکا۔

البتہ ان حریفوں نے جو کچھ کہا، اور جس رنگ میں کہا، اس کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

میر ضاحک:

اتنا آگے کبھو سودا نہ ہوا تھا سو ہوا
بنگلے میں بیٹھ کر رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا
گو کہ در ماہہ ہوا بیش ولے عزت کم
شاعروں بیچ چو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا

ایک ہجو میں سودا کے کتوں پر طنز کیا ہے:

اس کا سارے سگوں سے ناتا ہے
ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے
کلوا اور جھبرا لینڈی اور تازی
سب شریک طعام و ہم بازی
کلوا کلہ چبائے جاتا ہے
اور جھبری جھبرا ساتھ کھاتا ہے

سودا:

کلیات سودا میں درج ذیل ہجویات ضاحک کی شان میں موجود ہیں۔

(1) مثنوی در ہجو میر ضاحک:

یہ سو اشعار کی مثنوی ہے۔

یہ عجیب و غریب زیرسا — ایک یہاں صورت آشنا اپنا
کہیے اس کے تئیں قسم کھاکر — امت دانیال پیغمبر

آخری شعر:

ایسے بھوکے پہ طعن کیجے مدام — شام سے صبح صبح سے تا شام

(2) ترجیع بند، در ہجو ضاحک، جو اوپر گزر چکا ہے۔

(3) مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک:

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدّو اس پر امساک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

مصحفی نے ضاحک کے حال میں سودا کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی پر تبصرہ کیا ہے۔ ’’مزاجش بہ طرف ہزل گوئی بیشتر راغب و با مرزا رفیع اور امکابرہ ہم درپیش آمدہ۔ چیزے او و چیزے او درحق یک دیگر از قسم ہجویات جاوید ند۔‘‘ (تذکرہ ریاض الفصحا، ص 180)

اس بیان کے مطابق دونوں لوگوں کی ہجوؤں کا کافی چرچا رہا ہوگا۔ لیکن خوش معرکۂ زیبا کا مصنف اس کی تائید نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے:

’’جب میر حسن شاگرد مرزا رفیع سودا کے ہوئے جو مزخرفات ان کے والد (کے متعلق) تھا دھوڈالا۔ اس سے وہ مشہور نہ ہوا۔‘‘ (خوش معرکۂ زیبا تلخیص عطا کاکوی، ص814)

محمد حسین آزاد نے اس روایت کو ایک دلچسپ قصے کی شکل میں پیش کیا ہے:

’’میر حسن مرحوم ان کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزاپرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کرڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔‘‘

(آب حیات، ص183-182)

لیکن اس لحاظ سے کہ میر ضاحک کا انتقال سودا کے بعد ہوا تھا اور خود دیوان ضاحک میں جواب دستیاب ہوگیا ہے۔ سودا کی ہجویں دیکھ کر یہ حکایت غلط ثابت ہوتی ہے۔

قائم

سید احمد یکتا نے قائم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے قائم کو اس قدر سراہا ہے کہ بعض اعتبار سے انھیں سودا پر ترجیح دی ہے۔ انھوں نے دستور الفصاحت میں لکھا ہے ’’تالیف کلمات و بندش الفاظ او، اگر نگاہ کنند، قدم بقدم مرزا است، واز برشتگی و شگفتگی آں، اگر گفتہ آید، بے شبہ با میر ہم ادا است۔ حق اینست کہ پایۂ کلام لطافت انجام ایں سخن طراز ہیچ وجہ از کسی فرد تر نیست۔ عجب طرز لطیف و وضع نظیف اختیار کردہ، کہ لطف و کیفیت ہر دو اوستاد را شامل، بلکہ بہ بعض مقام ترجیح طلب است۔ وفرق ہمیں قدر است کہ آں بزرگ

شاگرد مرزا ست و بس۔ قائم کے کمال فن کا دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ لیکن قائم کو اپنی ان تمام صلاحیتوں کے باوصف اپنے استاد یعنی مرزا سودا سے ایک گونہ عقیدت بھی تھی۔ انھوں نے سودا کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور کئی جنگی غزلوں میں بھی معارضے کے دوران ان سے اپنی عقیدت اور ارادت کا ذکر کیا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ اس تمام عقیدت و ارادت کے باوجود ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ استاد شاگرد میں ٹھن گئی۔ اصل میں قائم کی تلون مزاجی اور ان کا غرورِ فن انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کے دو معرکوں کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہاں ان معرکوں سے قائم کے مزاج کی گرہ کشائی میں مدد ملتی ہے اس لیے یہاں ان کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

قائم کا پہلا معرکہ اپنے استاد اوّل ہدایت اللہ خاں ہدایت کے ساتھ ہوا۔ وہ کچھ عرصے تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔ لیکن شاگردی کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چلا اور انھوں نے خواجہ میر درد کا تلمذ اختیار کرلیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ناچاقی کی بنا پر ہی ہدایت سے رشتۂ شاگردی منقطع ہوا ہوگا۔ کیونکہ خواجہ درد کی خدمت میں آتے ہی انھوں نے ہدایت کو تختۂ مشق بنانا شروع کردیا تھا۔ قاسم نے لکھا ہے:

''بعد چندے بجناب... خواجہ میر درد روح اللہ روحہ توسل جست واز مربی قدیم سجدے انحراف ورزید کہ قطعہ در ہتک شان آں تجر دنشان انشاد کرد کہ یکسر بوے بے سعادتی میدہد'' (مجموعہ نغز،ص82)

پھر انھوں نے قائم کا یہ قطعہ درج کیا ہے۔ جو صریحاً ہدایت کی شاعری پر حملہ ہے:

شاعری کا اُسے آیا ہے بہت سا غُزا
جو یہ کہتا ہے وہ اوستادِ زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یوں کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت
تیر ہوتی ہے کہیں شاخ کماں سنتے ہو

قاسم نے اس حرکت پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے اس قطعہ پر بھی وار کردیا اور کہا کہ اس کا آخری شعر محمد طاہر غنی کے شعر کا سرقہ ہے:

کج را بہ تکلف نتواں راست نمودن
کے تیر تواں ساختن از شاخ کماں ہا

ہدایت اگرچہ درویش صفت انسان تھے لیکن بہ تقاضائے بشریت شاگرد کی شرارت پر چراغ پا ہوگئے۔ انھوں نے اس قطعہ کا بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا اور قائم کے پندار شاعری پر وار کیا۔ انھوں نے قائم کو چیلنج کیا کہ اگر وہ شاعری میں مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو آئے۔ اس غزل پر غزل کہے۔ اشعار یہ ہیں:

چشمِ انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم
چاہیے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمھارے ہو گھمنڈ
کہہ چکے ہم تو غزل بارے تم ارشاد کرو

یہ معرکہ آگے بڑھا کہ نہیں۔ اس بارے میں تمام تذکرے خاموش ہیں۔

قائم کا دوسرا معرکہ قاضی عبدالفتاح متخلص قاضی کے ساتھ ہوا۔ قاسم نے انھیں سنبھل کا باشندہ کہا ہے۔ میر حسن کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تذکرے کی تالیف کے دوران قائم سنبھل مراد آباد میں مقیم تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ آخر میں امروہہ کے قاضی بھی مقرر ہوگئے تھے۔ بہرحال قاسم قاضی تخلص شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''بیشتر شعر فارسی از ہر گونہ میگوید۔ گاہ گاہ ریختہ ہم موزوں می کند'' (مجموعہ نغز،ص89)

اس کے بعد انھوں نے اس چشمک کی صراحت یوں کی ہے کہ یہ دونوں صاحبان ایک ہی ضلع میں بود و باش رکھتے تھے۔ اس لیے غالباً قائم نے انھیں قاضی کی ہجو میں اپنی رباعی کہی تھی۔ وہ رباعی یہ ہے:

قاضی شیخی ہے یہاں تو گاڑھی تیری
تدبیر پر اور ہم نے کاڑھی تیری
گو حشر کو دامن کو نہ پہنچے گا ہاتھ
واللہ کی ہم ہیں اور داڑھی تیری

قاسم نے یہ نہیں لکھا کہ قاضی نے اس کا کیا جواب دیا اور قائم کے ساتھ ان کے کیسے روابط تھے حالاں کہ انھوں نے قاضی کے ساتھ ذاتی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں سودا جیسے ظریف طبع استاد کے ساتھ ان بن ہوجانا حیرت کی بات نہ تھی۔ سودا کی ہنسی ٹھٹھول اور شوخی بزرگوں، دوستوں اور چھوٹوں سبھی کے ساتھ تھی۔ ہوسکتا ہے قائم کو مذاق کا کوئی فقرہ ناگوار گزرا ہو۔ ادھر قائم چونکہ خود تنک مزاج تھے۔ جلد ہی خفا ہوگئے ہوں گے۔ بہرحال دونوں استاد شاگرد میں بگاڑ پیدا ہوگیا۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ سودا کی مثنوی جو فوقی سے منسوب ہے اصل میں قائم کی ہجو ہے۔ جب دونوں حضرات میں صلح ہوگئی تو بعد میں سودا نے یہ فرضی نام عنوان کے طور پر قائم کردیا تھا۔ اس مثنوی کی تمہید کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجو قائم کے جواب میں لکھی گئی ہے:

ٹک میاں فوقی کے گھر تک اے صبا
کہہ سلام شوق تو جاکر مرا
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور
شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور
اوروں کو بکری کہو شیر آپ کو
بکری بھی گر کچھ کہے پھیر آپ کو
بات بکری کی لگے تم کو بری
دوڑو تم اس پر قلم کی لے چھری
پاس اس عاجز کے بھی ہر آن ہے
دیکھ لو یہ گو ہے یہ میدان ہے
کیا قصیدہ کیا غزل کیا قطعہ بند
جو ردیف و قافیہ کیجیے پسند
آپ کہہ کر مجھ کو بھی فرمایئے
جس کو جی چاہے اسے دکھلایئے
گھر میں شیخی کرنی کچھ رکھتی ہے مول
کلھیا میں گڑ پھوڑنے سے کیا حصول

آخر میں قائم کی ایک غزل کے کچھ اشعار پر تنقید کی ہے:

غزل کے مطلع پر اعتراضِ سودا

مطلع اوّل جو وہ جنگی غزل
رکھتی ہے سو اُس میں تو ایسا خلل
'ے' نے جس پر یہ کیا شور و فساد
جس سے آیا تھا چھٹی کا دودھ یاد

ایک اور شعر پر اعتراضِ سودا

شعر یہ چوتھا سنو اے مہرباں
جس کے معنی نظم کر لکھے بیاں
ہوئے پہلے ہی قدم مسکن صنم
گر چلوں تجھ کو سے جوں نقشِ قدم
نقش پا کو چلنے سے تشبیہ کیا
وہ تو بے حس محض رہتا ہے سدا
گو اُسے پڑھیے بہ آوازِ حزیں
لیکن اس کا سقم سب کے دل نشیں

اس سوا معنی گر اس بندش میں ہیں
عقل کل بھی وہ نہ سمجھے گا نہ میں

مقطع قائم پر اعتراض سودا

وہ جو مقطع ہے سوا ایسا ہے لچر
نکتہ رس کہتے ہیں جس کو دیکھ کر
وہ جو نکتہ سر پر رکھتی ہے خری
نیچے دے کے ہوگئی شیر جری

علاوہ ازیں سودا اس غزل کے مطلع ثانی کو میر کے شعر کا سرقہ قرار دیتے ہیں۔ اس تنقید وتعریض کے بعد خلاصۂ بحث اس شعر میں ادا کرتے ہیں:

ہو گیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور
مبتذل بند اور اک عالم کے چور

قائم کی یہ غزل اس طرح ہے۔ جس کی بعد میں اصلاح کی گئی ہوگی:

جوں شمع، دم صبح میں یاں سے سفری ہوں
ٹک منتظر جنبشِ بادِ سحری ہوں

نے گریہ شب ہوں میں نہ آہ سحری ہوں
جوں بانگ جرس ہم نفسِ بے اثری ہوں

جاتا ہوں میں جیدھر کو وہ منھ پھیرے ہے مجھ سے
گو یہ کہ میں گرد قدم رہ گزری ہوں

دیکھا نہ میں جز سایۂ بازوئے شکستہ
حرماں زدہ جوں حیرت بے بال وپری ہوں

میں پیرہن اپنے میں سماتا نہیں جوں گل
جس وقت سے آمادہ پے جامہ دری ہوں

سو خضر سے کم حوصلہ وہاں جی سے گئے ہیں
جس دشتِ خطرناک کا میں رہ گزری ہوں

جوں سرو رکھا سنگ خفا سے مجھے آزاد
مرہون ترا جی سے میں اے بے ثمری ہوں

کیا کم ہوں سکندر سے اگر دیکھے مجھ کو
آئینہ صفت مالک خشکی و تری ہوں

کس بزم میں دیکھی ہے وہ جھجکی کہ میں قائم
جوں شمع سدا محو پریشاں نظری ہوں

غالباً اس تنبیہ کا کوئی فوری اثر قبول نہیں کیا گیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ قائم استاد کو اشارے کنائے میں منانے کی طرف راغب ہوئے:

قائم ترے سخن کو شوخی میں مانتا ہے
ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے ہزار سودا

شاید سودا ان سے کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے تھے۔ جو ان کی صفائی سننے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ بہرحال قائم اپنی عذرخواہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان سے اس بات کے ملتجی بھی ہوئے کہ گزشتہ باتوں کو بھلا کر پھر سے خوشگوارانہ تعلقات بحال ہونے چاہئیں۔

قائم نے معذرت کے طور پر جو قطعہ لکھا ہے وہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ غلطی انھیں کی تھی۔ سودا کا قصور نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاگرد کے بہت کچھ منانے پر مانے ہیں:

لطف صحبت کا وہ ہے قبلۂ کونین یہاں
دم بہ دم لطف کی امید ہو نہ بیم گزند

یعنی اس خرد سے گو سہو ہوا تھا بالفرض
غرض اس بات سے ہوتی تو وہ تھا موقع پسند

اس سے بھی قطع نظر میں نے کہا کیا تازہ
ناز کرتا ہی ہے والد پہ جہاں ہے فرزند

لیک منظور نہ تھی آپ کو مجھ پر اشفاق
بلکہ خواہش تھی کسی طرح کٹے جی سے یہ گند

سو میسر ہوئی وہ بات پس از مدت عمر
آپ اب خوش رہیں کرتا ہے یہ بندہ بھی انند

کچھ تاسف کی جگہ مجھ کو نہیں ترک کے بعد
کیونکہ کیا خوب تھا باہم ہوں سخن پست و بلند

پر وہی باتیں جو پھر بھاتی ہیں حضرت کے تئیں
پھر وہی بے مزہ کی آتی ہے خاطر کو پسند

ما بہ آں مقصد عالی نہ تو انیم رسید
ہم مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

(یہ قطعہ عمدۂ منتخبہ ص510 سے لیا گیا)

قائم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے کچھ تدارک تو ضرور کیا۔ مگر اس قطعہ کے آخری حصے کا جو تیکھا انداز ہے اس کے پیش نظر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ سودا کا دل ان کی طرف سے صاف ہوگیا ہوگا۔ اس موقعے پر فانی کا وہ شعر یاد آرہا ہے:

کہتے کہتے مرا افسانہ گلہ ہوتا ہے
دیکھتے دیکھتے تقدیر بدل جاتی ہے

خیر۔ رفتہ رفتہ دلوں کی کدورتیں ختم ہونے لگی ہوں گی۔ قائم کی ایک غزل سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے:

قبول عذر تو واں ہے جہاں ملال بھی ہو
بہ جان پاک صفا، یاں جو کچھ خیال بھی ہو

وہ چاہے صدر نشینی، جو ہو ترا ہم چشم
مجھے یہ کم ہے کہ جا گہ، صف نعال بھی ہو

مثال آئینہ دل کو مرے صفا دے اگر
غبار کا تری جانب سے احتمال بھی ہو

کمال جگ میں سزاوار ناز ہے یہ سچ
پہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو

قصورِ خدمت احباب اس قدر قائم
کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

غرضیکہ یہ تجدید تعلقات دیر پا ثابت ہوئی اور یہ معرکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔

■

ماخذ: اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)، مصنف: محمد یعقوب عامر، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مہتاب جہاں

دلی کی پتنگ بازی
تاریخ کے آئینے میں

دلی جو کہ ہندوستان کا دل کہلاتی ہے دنیا میں اپنی گونا گوں صفات کی بنا پر مشہور و ہر دل عزیز ہے دلی اپنے کھان پان، رہن سہن، میلے ٹھیلے، کھیل کود کے باعث اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہے اگر ہم 'دلی' سے متعلق کوئی پرانی کتاب کا مطالعہ کریں تو لگتا ہے کہ دلی میں زیادہ کچھ نہیں بدلا بس انگریز چلے گئے اور 'قلعہ والے' نہیں رہے۔

دلی کی شان دلی کی ہر بات میں جلوہ گر ہے بھلے ہی دلی کے باہر والے دلی کے بارے میں جو چاہیں کہیں دلی کبھی برا نہیں مانتی اور نہ ہی دلی والے، بلکہ دلی کے باہر والوں کو ''مسکرا کر گلے ہی لگاتے ہیں دلی کی ہر بات انوکھی اور نرالی ہے۔

''دلی کے کسی بھی پہلو پر بات کی جائے تو وہ لذت وشوق سے خالی نہیں ہوتی'' چاہے وہ بات ''دلی کے غالب کے بارے میں ہو'' دلی کے تنگ گلی کوچوں کے بارے میں، دلی کے مکان و مکین کے بارے میں یا دلی کے لال قلعہ یا جامع مسجد کے بارے میں، دلی کے خوانچوں والوں کے بارے میں یا دلی کے ہوٹلوں شوٹلوں کے بارے میں یا دلی کے کھیل تماشوں کے بارے میں۔

اس بھاگتی دوڑتی دنیا میں کھیل کود کی اب وہ اہمیت باقی نہیں رہی جو کہ ''فرصت کے زمانوں میں'' ہوا کرتی تھی۔ مغلوں کے زمانے کے 'دلی والے' اب دلی میں نہ کے برابر ہیں یا تو دلی چھوڑ کر چلے گئے 'سکون کی تلاش میں' یا مرکھپ گئے، مگر مغلوں کے زمانے کے کچھ کھیل کود اور شوق، تو ابانہ شوق آج بھی اسی طرح تو نہیں مگر پھر بھی دلی میں جابجا اپنے الگ رنگ میں نظر آتے ہیں جیسے شطرنج، چوسر، کبوتر بازی، پتنگ بازی وغیرہ۔

> انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پتنگ کو ایک شخص arcytas نے چار صدی قبل tarenturm میں ایجا د کیا تھا لیکن ایشیا کے باشندوں اور دوسری قدیم قوموں اور قبیلوں مثلاً نیوزی لینڈ کے قبیلہ موریس میں اس کا رواج نامعلوم مدت سے چلا آتا ہے، مشرقی ایشیا میں پتنگ بازی ہمیشہ ایک دلچسپ قومی مشغلہ اور تفریح رہی ہے لیکن یورپ میں اس کا شوق بہت کم ہے۔

پتنگ بازی یہ ایسا شوق ہے جو اگر لگ جائے تو بندہ کسی کام کا نہیں رہتا بس اس شوق کی نظر چڑھ جاتا ہے۔ مگر اس شوق کی بھی اپنی ایک الگ کہانی ہے ایک الگ تاریخ ہے جو بہت اہمیت کی حامل ہے ہمیں اس کھیل سے متعلق اہم معلومات فراہم کرتی ہے اور اس دلچسپ اور رنگین شوق کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کھیل کی ابتدا کیوں کر ہوئی؟ کب ہوئی؟ یہ سوالات ہنوز اندھیرے میں ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پتنگ کو ایک شخص arcytas نے چار صدی قبل tarenturm میں ایجاد کیا تھا لیکن ایشیا کے باشندوں اور دوسری قدیم قوموں اور قبیلوں مثلاً نیوزی لینڈ کے قبیلہ موریس میں اس کا رواج نامعلوم مدت سے چلا آتا ہے، مشرقی ایشیا میں پتنگ بازی ہمیشہ ایک دلچسپ قومی مشغلہ اور تفریح رہی ہے لیکن یورپ میں اس کا شوق بہت کم ہے۔

پتنگ بازی کو عام طور پر مذہب سے نسبت دی جاتی ہے۔ چنانچہ قبیلہ موریس میں اسے مذہبی حیثیت حاصل ہے، پتنگ کے چڑھاوں کے ساتھ ساتھ پتنگ گیت اور بھجن بھی لگائے جاتے ہیں۔ اہل کوریا اس کی وجۂ ارتقا اپنے ایک جنرل سے منسوب کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ صدیوں قبل اس نے ہی اپنی فوج کا دل بڑھانے کے لیے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے پتنگ کے ساتھ ساتھ ایک قندیل بھی اڑائی تھی۔ اس قندیل کو اس کی فوج نے سمجھا کہ شاید قدرت کی طرف سے یہ کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے اور ان کے لیے فتح و نصرت کی بشارت لے کر آیا ہے کوریا ہی کے ایک دوسرے جنرل کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے

پتنگ کو میکا نیکل (Mechanical) یعنی جرثقیل کی ضروریات کے لیے استعمال کیا اور اس کے ذریعہ ایک ندی کے پاٹ کو ناپ کر ایک پل تیار کرایا لہٰذا کوریا، جاپان، چین بلکہ تمام ایشیا میں پتنگ بازی سے بہت زیادہ شوق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عام کارو باری لوگ اپنی دکانداری کے وقت بھی پتنگ بازی میں مشغول نظر آتے تھے اور ان کی ساری خرید وفروخت تھوڑی دیر کے لیے دھری رہ جاتی تھی۔

چینی اور جاپانی پتنگیں مختلف وضع قطع کی ہوتی ہیں، کسی کی شکل پرندے کی ہے تو کسی کی اژدہے کی، کوئی بالکل چوپایہ نظر آتی ہے تو کوئی مچھلی معلوم ہوتی ہے اسی طرح ان کے سائزوں میں بھی فرق ہوتا ہے چھوٹے سے چھوٹے سائز سے لے کر سات فٹ تک طویل وعریض ہوتی ہیں ان کے کانپ اور ٹھڈے معمولی بانس کے ہوتے ہیں اور چاول کے مہین کاغذ یا بہت باریک ریشم سے منڈھی جاتی ہیں۔

چین میں نویں مہینہ کا نواں دن ' یوم پتنگ' کہلاتا ہے۔ اس روز چھوٹے بڑے تمام طبقوں کے ہزار ہا آدمی اورلڑکے چھتوں، ٹیلوں اور میدانوں میں جا کر پتنگیں اڑاتے ہیں، اہل ملایا نے بھی کئی طرح کی پتنگیں ایجاد کررکھی ہیں جن میں کثرت ایسے پتنگوں کی ہے جو بغیر دُم چھلّے کے ہوتی ہیں۔ شکاگو میں سلطان جھور نے ایک دفعہ 1893 میں کولمبین (Colambian) کی نمائش کے موقعہ پر پندرہ مختلف اقسام کی پتنگیں بھیجی تھیں۔ ایشیا میں ایسی نغمہ ریز پتنگیں بھی نئ بنتی ہیں جن کے دلکش نغمے کافی دورتک سنائی دیتے ہیں، یہ سریلی تانیں ہوا میں اڑتے وقت سوراخوں سے نکلتی ہیں۔

پہلے زمانے میں بعض توہم پرست یہ یقین رکھتے تھے کہ پتنگ خبیث روحوں کوڈراتی ہے اور ان کو دور کرتی ہے اس لیے وہ ساری ساری رات اپنی پتنگوں کو ہوا میں اڑایا کرتے تھے۔ اٹھارھویں صدی میں پتنگ طبعی ضروریات کے لیے بھی استعمال کی جانے لگی اسی طرح پتنگ کا ایک اور مفید طریقۂ استعمال سائنس کی ضرورت کے لیے 19 ویں صدی میں ہوا۔ حوادث سماوی کے لیے بھی پتنگ بازی کا خوب استعمال ہوا۔ فوجی استعمال کے لیے بھی پتنگ خوب کام آئی، مثلاً دور دراز فاصلہ پر پڑی فوجوں کو کوئی اشارہ دینا، اس کے ذریعہ جھنڈا اڑانا، یا مقررہ خاص نشانیوں کے مطابق ہدایات واحکام بھیجنا وغیرہ پتنگ کے ذریعہ فوٹو بھی آسانی سے لیا جاسکتا ہے۔ انگلستان اور امریکا میں اس طریقۂ کار سے بہت سے کامیاب فوٹو لیے گئے ہیں۔ طبّی نقطۂ نظر سے بھی پتنگ بازی آنکھوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس کی وجہ سے بینائی میں اضافہ ہوتا ہے اور نظر تیز ہوتی ہے، یہ تمام معلومات دنیا کی پتنگ بازی سے متعلق تھیں اب ذرا 'دلی کی پتنگ بازی' کی طرف رجوع کریں۔

دلی کی پتنگ بازی کا خیال آتے ہی مرزا چپاتی یاد آجاتے ہیں۔ ان کا ذکر راقم الحروف نے اپنے گزشتہ مقالہ 'دلی کی کبوتر بازی تاریخ کے آئینے میں' میں کیا ہے جو کہ مفصل اطلاعات دیتا ہے۔ سید بخاری مؤلف 'یہ دلی ہے' نے مرزا چپاتی کو بچشم خود دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ جس وقت میں نے انھیں دیکھا تھا ان کی عمر سو کے لگ بھگ ہوگئی تھی بڑھاپے کے باعث بال سفید بگلا، اور کمر بالکل دوہری ہوچکی تھی توتلے ہونے کے ساتھ بہرے بھی

غضب کے تھے جب تک گلا پھاڑ کر نہ بولو انھیں کچھ سنائی نہ دیتا سر پر پٹھے تھے۔ چوڑا چکلا چہرہ، گورا گورا رنگ لمبا قد، ستواں ناک، بڑی بڑی سرخ مخمور آنکھیں، چوڑی چوڑی کلائیاں، موٹی موٹی لمبی انگلیاں، ابھری ہوئی رگیں، اَن پڑھ لیکن اعلیٰ درجے کے فی البدیہہ شاعر، فن سپہ گری کے ماہر شاطر ایسے کہ دعویٰ کے ساتھ چوتھی چال میں مات، شطرنج کے علاوہ چوسر، گنجفہ پچیسی کے بہترین کھلاڑی، کبوتر اڑانے اور مرغ لڑانے میں لاثانی، نہایت عمدہ تیراک، بلا کے ظریف اور حاضر جواب۔ پتنگ بنانے میں مرزا چپاتی کے اچھے اچھے استاد قائل تھے۔ کانپ ٹھڈے غضب کے چھیلتے اور بناتے تھے اس کے علاوہ سادی ڈور پر مانجھا بھی چڑھاتے اور ایسی صفائی سے اس کو سوتتے کہ رہے نام سائیں کا مانجھا عام طور پر دار چینی، پسا ہوا شیشہ، گیرو اور چاول ملا کر تیار کیا جاتا ہے مگر مرزا چپاتی ایسا عمدہ مانجھا تیار کرتے کہ ایک دو ہاتھ سوتنے پر ڈور میں بلا کی تیزی اور برانی آجاتی۔ ہمیشہ اڈّھا اڑاتے اور جو گڈّی ہاتھ میں لیتے اسے نوشیرواں اتارتے نوشیروان پتنگ بازوں کی اصطلاح میں اس گڈّی کو کہتے ہیں جونو پتنگ کاٹ کر صحیح سلامت اتر آئے۔ آخر عمر میں جب نظر کمزور ہوگئی تو شاگردوں سے اڑواتے اور خود داؤں پیچ بتاتے جاتے دلی اور لکھنؤ میں آپ کا بہت شہرہ تھا۔

قلعہ والوں کی پتنگ بازی سلیم گڑھ پر ہوا کرتی تھی۔ جہاں عصر کا وقت ہوا، بڑے بڑے نامی گرامی استاد اور ماہر پتنگ باز طرح طرح کی پتنگ، ڈور کے بڑے بڑے پنڈے خوشنما گولے، غلاف دار چرخیاں، ٹھاڑیاں اور ہچکے جن پر کنکووں اور تکلوں کے زور کے مطابق دو بلّی، تبلی، چوبلی، مانجھے دار ڈور چڑھی ہوئی ہوتی، لے کر سلیم گڑھ جا پہنچتے، بادشاہ سلامت (بہادر شاہ ظفر) تختِ رواں میں تشریف لاتے، ایک طرف بادشاہی پتنگ باز ہوتے اور دوسری طرف معین الملک نظارت خان بادشاہی ناظر اور ان کے کھلاڑی دونوں میں مقابلہ ہوتا سامنے دریا میں دور دور تک سوار آنگڑے دار لکڑیاں لے کر کھڑے ہوجاتے۔ دونوں طرف سے انگارہ، الفن، تکل۔ دوباز، دوپلکا، دوپٹا، کلدمہ، کل سرا، کانٹرا، بگلا، کلیجہ جلی، کل چڑھی، سرکھلی، کندے کھلی، اودھ رنگ پری، مانگ دار، زلفوں دار، جینودار، پریوں دار اور طرح طرح کی نہایت شوخ اور خوش رنگ پتنگیں دریا کی طرف ہوا میں بڑھتیں اور فضا میں ہر طرف تیرنے لگتیں۔ سارا آسمان پتنگوں سے رنگین ہوجاتا پیچ لڑایا جاتا اور آخر کار کسی ایک کا پیچ کٹ جاتا اور دریا کے پار جاگرتا سوار وہاں سے اس کو اٹھا لاتے یا جس کے ہاتھ لگتا وہ اسے لے جاتا۔

بادشاہ سلامت برابر دیکھتے رہتے اگر جی چاہتا تو تختِ رواں سے اتر کر اشارہ مرحمت ہوتا فوراً ایک پتنگ باز آگے بڑھتا اور مچھلی کے چھلکوں کے دستانے ہاتھوں میں پہناتا، بادشاہ سلامت قدآدم تکل ہاتھ میں لیتے، اکثر چوبلّی ڈور پر اور بعض اوقات لوہے کے تار پر اڑاتے شاہی پتنگ ذرا سی دیر میں مثل شاہباز تن تن کر ہوا سے باتیں کرنے لگتا اور آسمان کا ستارہ معلوم ہوتا، نظر بازوں کا پیک نظر بھی مشکل سے وہاں تک پہنچتا، بادشاہی حریفوں میں مرزا یاور بخت شہزادے بادشاہ سلامت سے پیچ لڑاتے دلی میں مرزا یاور سے بڑھ کر کوئی دوسرا پتنگ

بازنہیں لڑا سکتا تھا۔ شاذ و نادر ہی ان کا پتنگ کٹتا تھا۔ مرزا چپاتی کی طرح مرزا یاور بھی اپنا مانجھا خود تیار کرتے تھے۔ غدر کے بعد بھی یہ شوق جوں کا توں جاری رہا۔

قلعہ والوں کی پتنگ بازی کے علاوہ شہر کے مشہور اور نامور پتنگ باز جمعہ کے جمعہ ظہر کی نماز کے بعد مسجد گھٹا کے باہر جمنا کے ریتیلے میدان میں جمع ہوتے خاص طور پر شبِ برات عید، بقراعید کے لیے پہلے سے تیاریاں شروع ہوجاتیں درجنوں انگریزی موٹے ریل کی ڈور پر زرد، سرخ، سبز، کاہی، مانجھا سوت کر بڑی بڑی چرخیوں میں چڑھایا جاتا۔ گڈیوں میں بہت ساری قسمیں تھیں جو آج بھی قائم ہیں جیسے الفی، تکل، پونا، ادّھا بھیڑیا، چڑا، چپ، پری، شکر پارہ، چاندتارا پٹیل، نعل دار، گنڈیری دار طرح طرح کی رنگ برنگی گڈیاں تیار کی جاتیں، آپس میں پتنگ بازی کے ہاتھ لگتے، دن اور وقت مقرر کیا جاتا، ڈیرے تنبو اور شامیانے تنتے، پانی کا انتظام ہوتا زور شور سے پتنگ بازی ہوتی شہر کی عوام بھی یہ تماشا دیکھنے آتی۔

شہر کی عام پتنگ بازی کا مظاہرہ سال کے سال یا تو مہرولی میں پھول والوں کی سیر کے موقع پر ہوتا یا پھر ہر چھٹے مہینے کی سترھویں شریف کے موقع پر نظام الدین کی باولی اور ہمایوں کے مقبرے میں یہی سماں نظر آتا۔ شب برات اور عید بقراعید کے تہواروں پر کوئی محلّہ اور گلی کوچہ ایسا نہ ہوتا جہاں لڑکے بالے، شرارت کے پُتلے آفت کے پرکالے چھوٹے چھوٹے کنکولے اور گڈیاں اپنی اور پرائی چھتوں پر نہ اڑاتے ہوں اور گڈیاں اڑانے اور لوٹنے کے درمیان وہ اونچی اور نیچی محفوظ اور غیر محفوظ چھتوں پر دوڑتے دھمال کرتے چیختے چلاّتے اور ایک دوسرے پر آواز کستے ہوں۔ یہ شور شرابہ صرف گھروں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اوکھلا، روشن آرا اور محل دار خان باغ جہاں عید کے دوسرے دن 'ٹرکا میلا' ہوتا وہاں بھی یہی ہنگامہ برپا ہوتا۔

ان دنوں غرض جاڑا ہو یا گرمی، تیج تہوار ہوں یا میلے ٹھیلے، دلی والوں کی پتنگ بازی کسی دن ناغہ نہیں ہوتی تھی صرف پتنگ بازی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات ڈور کو رشتۂ الفت بنا کر عشق و محبت کے ڈورے بھی ڈالے جاتے تھے کیونکہ اس وقت موبائل فون، کمپوٹر اور انٹرنیٹ کا زمانہ تو تھا نہیں بس پتنگ سے ہی کام چلایا جاتا تھا جو کہ اس وقت کا بڑا کارآمد طریقہ تھا محبت کے نامہ و پیام اسی پتنگ کے ذریعہ آتے جاتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی:

خود بخود دل کو پہنچتی ہے خبر محبوب کی
تار برقی پر بھی یہ الفت کا رشتہ ڈور ہے

بقول ناسخ:

دے اسی کا کوٹ کر مانجھا تو اپنی ڈور کو
شیشۂ دل میرے پہلو میں جو چکنا چور ہے

میر غالب کا پتنگ بازی کے ضمن میں ایک ترکیب بند ملتا ہے جو کہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ میرزا غالب بھی پتنگ بازی کے دلدادہ تھے۔ مثلاً:

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزدگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیا نے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں نے کہا اے دل ہوائے دلبراں

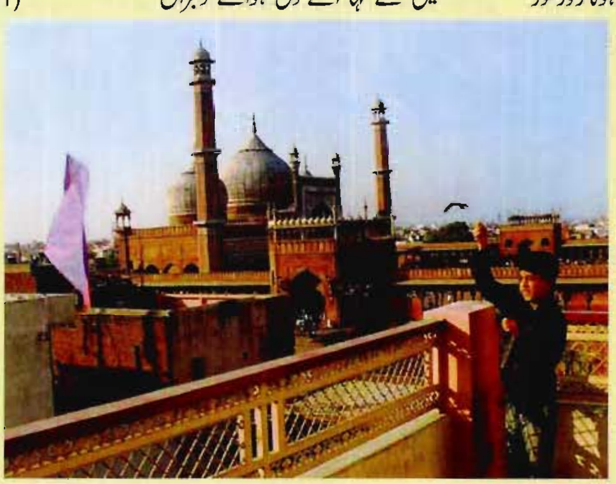

بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر اِن کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے
قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب
غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب
رشتہ درگردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

پتنگ بازی سے متعلق دستور و قواعد 1915 میں مقرر ہوئے تھے اور باقاعدہ مطبوعہ شکل میں شائع ہوئے تھے جن پر آج بھی عمل ہوتا ہے۔

1915 میں پتنگ بازوں کی مختلف انجمنیں موجود تھیں:

(1) اپریل کائٹ کلب دہلی (2) وزیر کائٹ کلب (3) رنگین کائٹ کلب دہلی (4) مسکین کائٹ کلب دہلی وغیرہ۔

1942 میں بھی ہمیں مختلف انجمنوں کی جانکاری ملتی ہے جو کہ آزادی سے پہلے دلی میں موجود تھے، جیسے بلی ماران، دہلی

(1) مہذب کائٹ کلب (2) ریاضیہ کائٹ کلب سوئیوالان دہلی (3) گولڈن کائٹ کلب پہاڑ گنج دہلی (4) خوشنما کائٹ کلب بلیماران دہلی (5) اسٹار کائٹ کلب، فراشخانہ دہلی (6) حمیدیہ کائٹ کلب صدر بازار دہلی (7) ینگ مین کائٹ کلب کوچہ پنڈت دہلی۔

ماضی میں دلّی کی پتنگ بازی کی بات ہی انوکھی و نرالی تھی اور یہ نرالا پن بہادر شاہ ظفر اور ان کے باکمالوں کے ساتھ ہوا۔ نہ بہادر شاہ ظفر رہے نہ ان کے باکمال، نہ وقت رہا نہ وہ سماں، نہ وہ رنگ برنگی پتنگیں رہیں نہ وہ سادھی اور مانجھے، مگر آج بھی دلی میں پتنگ بازی کا وجود قائم و دائم ہے ہر چند کہ مصروفیات نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے مگر وقت ملنے پر آج بھی چھتوں پر پتنگیں آڑتی نظر آتی ہیں خاص طور پر یومِ آزادی 15 اگست کے موقع پر دلی کی مختلف جگہوں پر خوب پتنگ بازی ہوتی ہے۔ لال کنویں سے لے کر سیتا رام بازار، بلبلی خانہ، چتلی قبر، سوئیوالان، تہہ راما بیرم خان، دریا گنج ہر جگہ گڈیوں، پتنگوں، ڈور، سادی مانجھے کی دکانیں کھلی ملتی ہیں مغلوں کے زمانے کا دلچسپ و رنگین مشغلہ آج بھی دلی میں زندہ ہے مگر اپنی اس شان کے ساتھ نہیں جو ماضی میں جلوہ افروز تھا کیونکہ یہ ایک نوابانہ و شاہانہ شوق تھا اور اب نواب اور شاہ نہیں رہے۔

■

Dr. Mehtab Jahan, Dept of Persian, Delhi University, Delhi - 110007

ندیم غوری

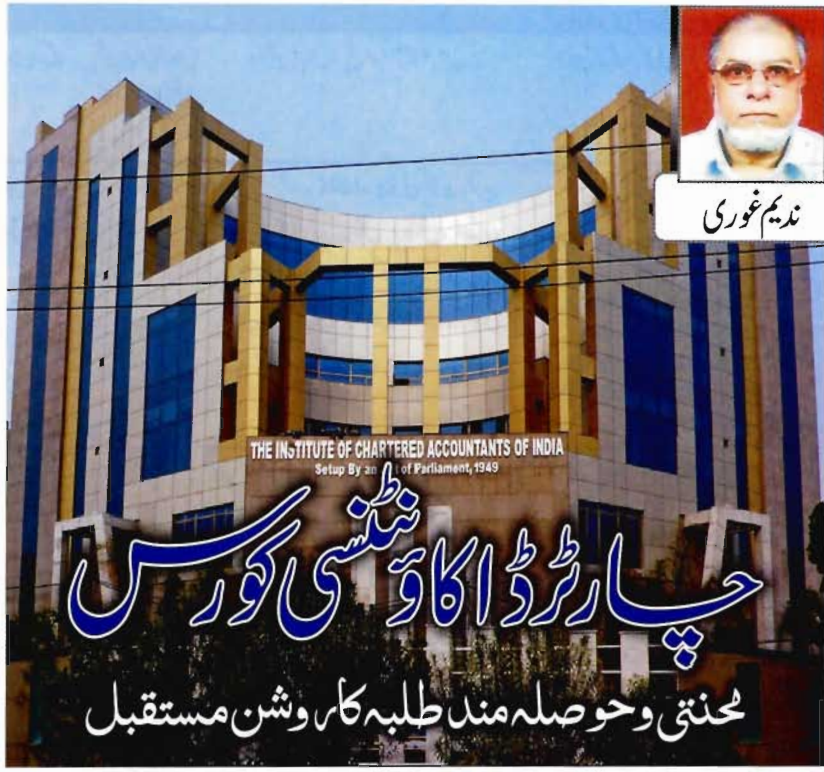

چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کورس

محنتی و حوصلہ مند طلبہ کا روشن مستقبل

قومی اردو کونسل کی ایک اہم ترین اسکیم کمپیوٹر ایپلی کیشن، بزنس اکاؤنٹنگ اینڈ ملٹی ڈی ٹی پی (CABA-MDTP) ہے جس کی کامیاب تکمیل پر طلبہ کو ایک سالہ ڈپلومہ کورس کا سرٹیفکیٹ عطا کیا جاتا ہے۔ اِس میں بزنس اکاؤنٹنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس میں کمپیوٹر ٹیلی (Tally) کی مدد سے تکنیکی مہارت اور ہنرمندی پیدا کی جاتی ہے۔ اس طرح اکاؤنٹنس اسسٹنٹ یا آفس اسسٹنٹ جیسی ملازمتیں حاصل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن جو طلبہ مزید کچھ کر دکھانے کا حوصلہ رکھتے ہوں وہ اس روش پہ چلتے ہوئے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں جو پروقار معیار زندگی کا ضامن ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم اُس ادارے کا مختصر سا تعارف پیش کریں جو اِس اہم کورس کا نظم کرتا ہے۔

دی انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنس آف انڈیا (The Institute of Chartered Accountants of Indian)

اِس ادارہ کو مختصراً ICAI کہا جاتا ہے جو حکومتِ ہند کا ایک مقتدر ادارہ ہے جسے چارٹرڈ اکاؤنٹس ایکٹ 1949 کے تحت قائم کیا گیا ہے اس کا صدر دفتر دہلی میں قائم ہے جس کا پتہ درج ذیل ہے:

The Institute of Chartered
Accountant of India
ICAI Bhawan
Indra Prastha Margh
New Delhi - 110104
P.B.No. 7112
http://www.icai.org

اس ادارہ کا ایک شعبہ بورڈ آف اسٹڈیز ہے جو طلبہ کی تعلیم سے متعلق پالیسیوں اور پروگراموں کو وضع اور نافذ کرتا ہے۔

چارٹرڈ اکاؤنٹنس CA (Chartered Accountant) کورس میں داخلے کا طریقہ ذیل کی طرح ہے۔

(1) کامن پروفی سینسی ٹسٹ (Common Proficiency Test)

اس کا موقف CPT ہے اِسے CA کورس کا باب الداخلہ کہہ سکتے ہیں جو کہ نہایت آسان اور سہل ترین ہوتا ہے۔ اِس امتحان میں تمام تر سوالات معروضی (Objective Type) ہوتے ہیں۔ یہ سال میں دومرتبہ منعقد کیا جاتا ہے۔ ایک تو جون میں اور دوسرے دسمبر میں۔ اس میں چار مضامین کی جانچ کی جاتی ہے جن کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔ اِس امتحان کا مقصد ان مضامین میں طلبہ کی ابتدائی اور بنیادی معلومات کی جانچ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ کسی دیے ہوئے سوال کے غلط جواب پر 25% نمبر منہا کیے جاتے ہیں یعنی اِس میں Negative Marking کا طریقہ رائج ہے۔ مثال کے طور پر 10 زمروں کے سوال کا غلط جواب دینے پر حاصل شدہ نمبروں میں سے 2.5 نمبر کم ہو جائیں گے۔ ذیل میں اِس امتحان کا خاکہ دیا گیا ہے۔

پہلا سیشن: Session-1، دو حصے — دو گھنٹے، 100 نمبر)

- سیکشن (حصہ) A: کھاتے داری کے مبادیات (Fundamentals of Accounting)، 60 نمبر
- سیکشن (حصہ) B: مرکنٹائل قوانین (Mercantile Laws)، 40 نمبر

دوسرا سیشن Session - II (دو حصے — دو گھنٹے، 100 نمبر)

- سیکشن (حصہ) C: عمومی معاشیات (General Economics)، 50 نمبر
- سیکشن (حصہ) D: مقداری استعداد (ریاضی و شماریات) (Quentitative Aptitude)، 50 نمبر

اس طرح چار مضامین کا یہ امتحان 200 نمبروں پر مشتمل ہوتا ہے اور دو سیشن کے دو حصوں میں منعقد ہوتا ہے جن میں سے ہر جلسہ دو گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ CA کے تمام تر امتحانات از اوّل تا آخر محض انگریزی زبان میں ہوتے ہیں:

CPT میں کامیابی کے لیے مندرجہ بالا مضامین کم از کم نمبر بالترتیب 18، 12، 15، 15 حاصل کرنے ہوں گے مگر حاصل شدہ نمبروں کا کل میزان 100 نمبر بھی ہونا ضروری ہے۔ یعنی ہر مضمون میں دیے ہوئے کم سے کم نمبروں کے علاوہ اتنے زائد نمبر ہوں کہ ان کا کل میزان کم از کم 100 ہو جائے یعنی کامیابی کے لیے 50% نمبر حاصل کرنا ضروری ہے۔

تعلیمی لیاقت: سی پی ٹی کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت دسویں یعنی میٹرک پاس ہونا ضروری ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ انٹرمیڈیٹ یعنی بارہویں پاس ہونا بھی ضروری ہے تاکہ (10+2) کی شرط پوری ہو جائے ورنہ اگلے کورس میں شرکت نہیں ملے گی۔ ویسے تو کامرس آرٹس سائنس کی فیکلٹی کی کوئی قید نہیں ہے لیکن کامرس کے طلبہ کو اس میں تھوڑی سہولت رہتی ہے۔

رجسٹریشن: ICAI کے کوئی 126 مراکز کا جال (Net Work) پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ ان مراکز کو شمالی زون، مغربی زون، جنوبی زون، وسطی زون اور مشرقی زون پر مشتمل پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل ذیل کے جدول I میں دی گئی ہے۔

جدول I صوبائی مراکز کی فہرست جہاں سے درکار معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ قریبی ذیلی مرکز سے

جدول 1

نشان سلسلہ	زون	صوبہ جات ومقامات جو اس زون کے تحت آتے ہیں	شہر جہاں زون کا مرکزی دفتر واقع ہے	وہ شہر جہاں ذیلی مراکز قائم ہیں	زون کے مرکزی دفتر کا مکمل پتہ
1	شمالی	دہلی، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں وکشمیر، پنجاب اور مرکز کے زیرنگیں علاقہ چنڈی گڑھ	دہلی	انبالہ، امرتسر، بھٹنڈا، چنڈی گڑھ، فرید آباد، گڑگاؤں، ہماچل پردیش، حصار، جالندھر، جموں وکشمیر، کرنال، لدھیانہ، پانی پت، پٹیالہ، روہتک، سنگرور، سونی پت، جمنا نگر (کل 28)	Northern Indian Regional Council of the Institute of Chartered Accountants of India. ICAI Bhawani'52-54 Institutional Area, Wishwas Nagar, Shahadara, Delhi - 110032, Ph. 011-39893990, 30210601, Fax: 011-30210680, Email.:nro@ical.org
2	مغربی	گجرات، مہاراشٹرا، گوا، مرکز کے زیرنگیں علاقے دمن دیو، دادرا اور نگر حویلی	ممبئی	احمد آباد، احمد نگر، اکولہ، آنند، امراوتی، اورنگ آباد، بڑودہ، بھڑوچ، بھاؤنگر، گاندھی دھام، گوا، جل گاؤں، جام نگر، کولہاپور، لاتور، ناگپور، ناسک، نئی ممبی، پمپری، چنچ واڑ، پونے، راجکوٹ، سانگلی، شولاپور، سورت، تھانے، واپی، وسئی (کل 27)	Western India Regional Council of the Institute of Chartered Accountants of India, ICAI Bhawan, 27, Cuffe Parade, Colaba, Mumbai - 400005. Ph.: 022-39893989, Fax: 022-39802953, Email.: wro@ical.org
3	جنوبی	آندھراپردیش، کیرالہ، کرناٹک، تامل ناڈو، اور مرکز کے زیرنگیں علاقے پانڈیچیری اور جزائر لکسادیپ	چنئی	الّی پی، بنگلور، بلگام، بلاری، کالی کٹ، کوئمبتور، ارناکلم، اروڈ، کنٹور، ہبلی، حیدرآباد، کاکیناڑا، کوٹیم، کمباکونم، مدورائی، بنگلور، میسور، نلور، پال گھاٹ، پانڈیچیری، قومی لون، راجا مہندراوارم، سیلم، تریچناپلی، ترونلولی، تروپتی، تریپورا، تری چور، تریوندرم، ٹوٹی کورن، اُڑپی، ویلور، وجے واڑہ، وساکاپٹنم (کل 34)	Southern India Regional Council of the Institute of Chartered Accountants of India, ICAI Bhwan, 122, MG, Road, 3314, Nungumbakkam, Chennai- 600034, Ph.: 04439893989, Fax: 04430210355, Email: sro@ical.org
4	وسطی	اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، اترانچل، چھتیس گڑھ اور جھارکھنڈ	کانپور	آگرہ، اجمیر، الہ آباد، الور، علی گڑھ، بریلی، بیور، بھلائی، بھیل واڑہ، بھوپال، بیکانیر، بلاسپور، دہرہ دون، دھنباد، غازی آباد، گورکھپور، گوالیار، اندور، جے پور، جمشید پور، جبلپور، جودھپور، کوٹہ، لکھنؤ، متھرا، میرٹھ، مراد آباد، مظفرنگر، نوئیڈا، پالی، مارواڑ، پٹنہ، رائے پور، رانچی، رتلام، سہارنپور، سری گنگا نگر، اودے پور، اجین، بنارس (کل 39)	Central India Regional Council of the Institute of the Chartered Accountants of India ICAI Bhawan, 16/778, Civil Lines, Behind Reserve Bank of India Kanpur 8001, Post Box No 314, Ph.: 0512-3989398, Fax: 0512-3011173, Email: cro@icai.org
5	مشرقی	آسام، میگھالیہ، ناگالینڈ، اوڑیسہ، مغربی بنگال، منی پور، تریپورہ، سکم، اروناچل پردیش، میزورم، جزائر، انڈمان نکوبار	کولکاتا	آسنسول، بھونیشور، کٹک، درگاپور، گوہاٹی، رورکیلا، سنبھلپور، سلی گوڑی، (کل 8) (جملہ ذیلی مراکز: 126)	Eastern India Regional Council, of the Institute of Chartered Accountants of India, ICAI Bhawan, 7, Anandilal Poddar Sarani, (Russel Street) Koklata - 700071, Ph.: 033-39893989, Fax.: 033-30211145, Email.: ero@icai.org

حاصل شدہ رجسٹریشن فارم پر کر کے متعلقہ زونل مرکز میں داخل یا روانہ کیا جاسکتا ہے۔

نوٹ: (1) مندرجہ بالا مراکز سے اپنے قریبی ذیلی مرکز کا پتہ معلوم کرلیں۔

(2) ذیلی مرکز سے 100 روپے میں رجسٹریشن فارم مع پراسپکٹس (Prospectus) دستیاب ہوگا۔

(3) رجسٹریشن فیس 6000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ مزید 200 روپے شامل کرلیں۔ اس رقم کے عوض آپ کو ادارے کا ماہنامہ پابندی سے ایک سال تک جاری رہے گا۔ اس کی پرزور سفارش کی جاتی ہے کہ طلبہ یہ ماہنامہ ضرور منگوائیں۔ اس سے اسٹڈی میں مدد ملے گی۔ اس طرح کل 6200 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ کسی نیشنل بنک سے ادارے کے متعلقہ اعلیٰ عہدیدار کو واجب الادا بنائیں۔

(4) اب دسویں اور بارہویں کے سرٹیفکیٹ اور مارکس شیٹ کی مصدقہ نقول، ڈیمانڈ ڈرافٹ ساتھ رکھ کر یکسوئی سے فارم کو بخوبی پر کریں۔

(5) اس طرح ہر لحاظ سے مکمل فارم کو منسلکات کے ساتھ فارم میں دی گئی ہدایت کے مطابق متعلقہ افسر کو روانہ کردیں۔ جس کی رسید آپ کو کچھ عرصے بعد حاصل ہوجائے گی۔

(6) رجسٹریشن تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد 300 روپے ادا کرکے اس کی مزید تجدید کی جاسکتی ہے۔

سی پی ٹی کے امتحان کا اعلامیہ: سی پی ٹی کے لیے رجسٹریشن ہوجانے کے بعد طلبہ کو چاہیے کہ وہ شعبۂ امتحان کے اعلامیہ سے متعلق باخبر رہیں۔ اعلان کے ساتھ ہی امتحان میں شرکت کا فارم Online داخل کردیں۔ شرکت فارم اور امتحان میں شرکت کی یہ تمام کارروائی ویب سائٹ www.ical.org پر کی جاسکتی ہے۔ امتحانی فیس 500 روپے ہوتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ CPT کے امتحان میں مزید کسی بہتری (Improvement) کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک بار پاس ہوجائیں تو مزید نمبروں کے لیے دوبارہ امتحان نہیں دیا جاسکتا۔

امتیازی کامیابی: جو طلبہ کم از کم 70% نمبر حاصل کریں گے انھیں ان کے نتیجہ کارڈ پر ہی 'امتیازی درجے میں کامیاب' قرار دیا جائے گا۔ علیحدہ کوئی سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا جائے گا۔

درجاتی سرٹیفکیٹ (Rank Certificate): جو طلبہ کم از کم 60% مارکس حاصل کریں گے تو انھیں نتیجے کے اعلان کی تاریخ سے چار ہفتے اندر 'رینک سرٹیفکیٹ' جاری کیا جائے گا۔ لیکن اس سرٹیفکیٹ سے اولین دس طلبہ کو ہی سرفراز کیا جاسکے گا۔ بشرطیکہ امتحان کے اس مخصوص دن کم از کم 2500 طلبہ نے شرکت کی ہو۔

سی پی ٹی نصاب پر ایک اجمالی نظر: سی پی ٹی کے طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ متعلقہ مضامین کا کم از کم بنیادی علم ضرور رکھیں اس لیے طلبہ کو چاہیے کہ وہ درج ذیل مضامین کا اتنا مطالعہ تو ضرور کریں کہ وہ ان کے مبادیات سے واقف ہوجائیں اور یوں امتحان میں کامیابی حاصل کرلیں۔

(1) **کھاتہ داری کی مبادیات** (Fundamentals of Accountancy): اس مضمون کا مقصد طلبہ میں نظام مالیاتی کھاتہ داری (Financial Accounting System) کی تصوراتی تفہیم کو پروان چڑھانا ہے جس میں اس کے مطلب و وسعت (Meaning and Scope) کے علاوہ دیگر بنیادی تصورات سے بحث کی جاتی ہے۔

(2) **تجارتی قوانین** (Mercantile Laws) : اس مضمون کے تحت تجارتی قوانین کے مبادیات کی عمومی تفہیم کی جانچ کرنا ہوتی ہے۔

(3) **عمومی معاشیات** (General Economics): اس میں معاشی نظام اور افراد و تنظیموں کے معاشی کردار کی بنیادی تفہیم کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔

(4) **مقداری استعداد** (Quantitative Aptitude): اس مضمون کا مقصد اس بات کی جانچ کرنا ہوتا ہے کہ طلبہ کو ریاضی (Mathematics) اور شماریات (Statistics) کے ابتدائی تصورات پر کتنی گرفت ہے اور کہ وہ ان مضامین کے مقداری لازمات (Quantitative Tools) جیسے سوالنامے، اعداد و شمار، فہرستیں وغیرہ کا اطلاق کس حد تک اور کس خوبی سے کرپاتے ہیں۔ طلبہ کی سہولت کی خاطر اسٹڈی میٹریل اور سوالات کے نمونے ادارہ کی جانب سے مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔

امتیازات وظائف اور رعایتیں

سی پی ٹی میں پاس ہونے والے تین اوّلین طلبہ کو اس کے بعد کورس یعنی (Integrated) آئی پی سی سی (Professional Competence Course) کی رجسٹریشن فیس اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی 100 گھنٹوں کی تربیت کے لیے درکار رجسٹریشن فیس بھی معاف کردی جائے گی۔ یہ سہولت آئی پی سی سی کے دونوں امتحانوں میں پہلی ہی نشست (First attempt) میں پاس ہونے تک جاری رہے گی اور فائنل فیس بھی معاف ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ اس ادارے کے بورڈ آف اسٹڈیز نے اسکالرشپ کی ایک اور اسکیم ترتیب دی ہے۔ جس کے تحت 60 ایسے مستحق طلبہ کو اسکالرشپ دی جاسکتی ہے جنھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی ہو۔ نیز مزید 100 نادار و مستحق طلبہ کی اسکالرشپ پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح نومبر 2010 سے ایک اور اسکیم کا نفاذ عمل میں آیا ہے جس کے تحت آئی پی سی ای (Integrated Professional Competence Examination) اور فائنل امتحان میں اولین دس رینک ہولڈرس کو پیشہ ورانہ ہنرمندیوں کی تکمیل کے اقامتی پروگرام (Professional Skills Development Programme) میں شرکت کی فیس سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

CPT اور بارہویں یا اس کے مماثل کوئی امتحان پاس کرنے کے بعد طلبہ CA کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں جو حسبِ ذیل دو سطحوں پر تکمیل پاتا ہے۔

1. پیشہ ورانہ مربوط اہلیتی کورس/تکنیکی کھاتہ داری کورس (Integrated Professional (IPCC/ATC) Competence Course/ Accounting Technician Course)

2. فائنل کورس (Final Course)

ان میں PICC کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ یعنی گروپ I اور گروپ II ATC دراصل IPCC کے پہلے گروپ کی ہی سطح ہے۔

IPCC کورس کے پہلے گروپ کی میعاد نو مہینے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ طالب علم کو 35 گھنٹوں کا اورینٹیشن پروگرام (Orientation Prog) اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی 100 گھنٹوں کی ٹریننگ (جدول II) کی کامیاب تکمیل لازمی ہے۔ انھیں پاس کرنے کے بعد ہی وہ آرٹیکل شپ (Articleship) شروع کرسکتا ہے۔

اورینٹیشن پروگرام (Orientation Programme): اس کورس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آئی پی سی ای (Integrated Professional Compitence Examinator) کے کم از کم گروپ I کامیاب کرنے کے بعد طلبہ اپنی آرٹیکلڈ ٹریننگ (Articled Training) کی شروعات کے قابل ہوجائیں۔ البتہ اے ٹی سی (ATC) کے طلبہ کو یہ کورس اس لیے پورا کرنا ہے کہ وہ پہلی بار اکاؤنٹنگ ٹیکنیشین امتحان (Accounting Technitian Exam) میں شرکت کرسکیں۔

اورینٹیشن پروگرام ایک ہفتے کی مدت کے لیے تجویز کیا جاتا ہے جس کے دوران ہر روز چار سیشن

(Sessions) ہوا کریں گے اور یوں 35 گھنٹے پورا کریں گے۔ اِس پروگرام میں ذیل کے موضوعات یعنی شخصیت کی تکمیل (Personality Devolopet)، ترسیلی صلاحیتوں کا فروغ (Communication Skills)، دفتری طریق کار و ضابطہ (Office Procedure)، تجارتی ماحول کی تربیت (Business Environment)، عمومی کاروباری جانکاری (General Commercial Knowledge) وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے۔

اورینٹیشن پروگرام کا نظم علاقائی کونسلوں اور ICAI کے صوبائی مراکز کو تفویض کیا گیا ہے جو اس تربیت کے لیے 3000 روپے فیس مقرر کرتے ہیں۔ یہ رقم دیگر فیس کے علاوہ ہوتی ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی ٹریننگ (Information Technology Training): تعلیم و تربیت کی اس اسکیم کے تحت پیشہ ورانہ پریکٹس سے متعلق کمپیوٹر ٹریننگ کا جدید ترین پروگرام وضع کیا گیا ہے۔ جس کی چند جھلکیاں ذیل میں دی گئی ہیں:

- 100 گھنٹوں کی اس تربیت کو 20/25 دن میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے دوران یومیہ چار پانچ گھنٹے کل وقتی تربیت دی جاتی ہے۔
- اس تربیت کے دوران کھاتہ داری اور تنقیح پر زیادہ توجہ مرکوز کی جاتی ہے نیز الکٹرانک اسپریڈشیٹ (Electronic Spread Sheet)، ڈاٹا بیس مینجمنٹ سسٹم (Data Management System)، ویب ٹکنالوجی (Web- Technology) اور سسٹم سیکوریٹی اینڈ مینجمنٹ (System Security and Managment) کی تربیت کو بھی تقویت دی جاتی ہے۔
- اس کی منصوبہ بندی اِس طور سے کی گئی ہے کہ نظری معلومات عملی تربیت سے مربوط ہوجائے۔
- آئی پی سی سی میں رجسٹریشن کے بعد ہی اِس کا آغاز ہوسکتا ہے اور اورینٹیشن پروگرام کی طرح اِس تربیت کا انتظام بھی علاقائی کونسلوں اور ICAI کے صوبائی مراکز کے سپرد کیا گیا ہے۔ جس کے لیے ہر طالب علم کو 4000 روپے اضافی فیس ادا کرنی ہوگی۔
- اورینٹیشن پروگرام کے دوران طلبہ کو نہ صرف نظم و ضبط و شائستگی برقرار رکھنی ہوگی بلکہ لباس سے متعلق ہدایات کی بھی پابندی کرنی ہوگی۔

جدول II میں آئی ٹی ٹی سے متعلق نصاب اور ساعتوں میں مختلف موضوعات کی تفہیم کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

جدول II، 100 گھنٹوں پر مشتمل نصاب برائے انفارمیشن ٹکنالوجی ٹریننگ پروگرام

100 ساعتی آئی ٹی ٹی کا وسیع تر خاکہ

سلسلہ نمبر	موضوع	Topic	تربیت کے لیے درکار وقت گھنٹوں میں
(1)	کمپیوٹر کے مبادیات	Computer Fundamentals	01
(2)	آپریٹنگ سسٹمس	Operating Systems	06
(3)	ایم ایس ورڈ	MS-Word	06
(4)	ایم ایس ایکسل	MS Excel	15
(5)	ایم ایس پاور پائنٹ	Ms Power Point	05
(6)	ڈاٹا بیس	Data Bases	15
(7)	ایم ایس دفتری افادات	MS Office Utilities	03
(8)	اکاؤنٹنگ پیکیج	Accounting Package	20
(9)	کمپیوٹر استفادی تنقیح تکنیکیں	Computer Aided Audit	12
(10)	ویب ٹکنالوجی سسٹم سیکوریٹی اینڈ مینٹیننس	Web Technology & System Security and Maintenance	
(11)	ای۔ فائلنگ	E-Filing	05
(12)	عددی دستخطیں اور برقیاتی مندرجات کی توثیق	Digital Signatures and Verification of electronic records	02
	جملہ		100

IPCC کے دونوں امتحانوں یعنی گروپ I اور II پاس کرنے کے بعد فائنل کورس میں داخلہ لیا جاسکتا ہے۔ IPCE کے گروپ I کا امتحان چار پرچوں پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ گروپ II کے تحت تین پرچے دینے ہوتے ہیں۔ دونوں امتحانات پاس کرنے کے بعد کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل ہوتا ہے۔ جس کے بعد ہی ملازمت کے اچھے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

آئی پی سی ای پاس کرنے کے بعد بطورِ آرٹیکلڈ اسسٹنٹ (Articled Assistant) رجسٹریشن کرالیجیے جس کی میعاد تین سال ہوتی ہے جسے آرٹیکلڈ تربیت (Articled Training) کہتے ہیں۔ ان تین سالوں کے آخری چھ ماہ کے دوران CA کے فائنل امتحان میں شرکت کی جاسکتی ہے جو دو گروپس یعنی I اور II پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِسے پاس کرنے کے بعد 15 دن کا جنرل مینجمنٹ اور کمیونیکیشن اسکلس (General Management and Communication Skills) کا کورس کامیابی سے مکمل کیجیے اور ICAI میں بطور ممبر اپنے نام کا اندراج کرالیجیے۔ اب آپ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن گئے۔

اس ضمن میں مزید تفصیلات ادارہ ICAI کی دی ہوئی ویب سائٹ یا کسی قریبی شاخ سے پراسپکٹس حاصل کرکے کی جاسکتی ہیں۔

ماخذ:

(1) اردو دنیا، اپریل 2013 جلد 5، شمارہ 4، صفحات 20,21

(2) پراسپکٹس Prospectus Common Proficiency Test May 2011 Board of Studies the Chartered Accountants of India http://www.icai.org/ bosnoida@ical.org

(3) ماہنامہ اسٹوڈنٹس جنرل اپریل 2013 The Chartered Accountant Student April 2013 Vol S J 4 Issue4

■

Mustafa Nadeem Khan Gauri
H No 3-10/7405/54/4 'Zarina Manzil' Vrindavan Colony Old Jalna
Distt Jalna - 431213 (MP)

اصغر وجاہت

زخم

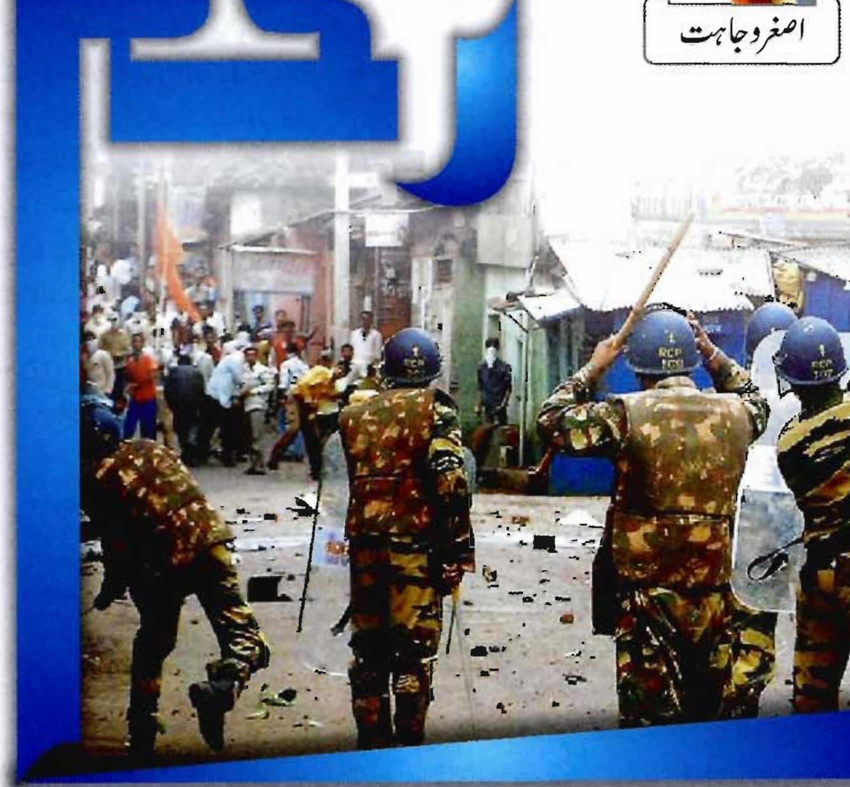

بدلتے ہوئے موسم کی طرح دارالحکومت میں فرقہ وارانہ فسادات کا بھی موسم آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ موسم کے آنے جانے کے بارے میں جیسے واضح اندازہ لگائے جا سکتے ہیں ویسے اندازہ سامپرادائک فسادات کے معاملے میں نہیں لگتے۔ پھر بھی شہر یہ ماننے لگا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد بھی موسم کی طرح یقینی طور پر آتا ہے۔ بات اتنی آسان بنا دی گئی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں لوگ اسی طرح سناتے ہیں جیسے 'گرمی بہت بڑھ گئی ہے' یا 'اب کے پانی بہت برسا' جیسی خبریں سنی جاتی ہیں۔ فسادات کی خبر سن کر بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ شہر کا ایک حصہ 'کرفیو گرست' ہو جاتا ہے۔ لوگ راستے بدل لیتے ہیں۔ اس تھوڑی سی تکلیف پر طبیعت جھنجھلانے لگتی ہے۔ اسی طرح جیسے تیز گرمی پر یا مسلسل پانی برسنے پر کوفت ہوتی ہے۔ شہر کے سارے کام یعنی صنعت، تجارت، تعلیم، سرکاری کام کاج سب عام طریقے سے چلتے رہتے ہیں۔

کابینہ کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ پارلیمنٹ کے اجلاس ہوتے ہیں۔ مخالف جماعتوں کے دھرنے ہوتے ہیں۔ پردھان منتری غیر ملک کے سفر پر جاتے ہیں، وزیر افتتاح کرتے ہیں، عاشق محبت کرتے ہیں، چور چوری کرتے ہیں۔ اخبار والے بھی فسادات کی خبروں میں کوئی نیا یا چٹپٹا پن نہیں پاتے اور اکثر حاشیے پر ہی چھاپ دیتے ہیں۔ ہاں، مرنے والوں کی تعداد اگر بڑھ جاتی ہے تو موٹے ٹائپ میں خبر چھپتی ہیں، نہیں تو عام۔

یہ بھی ایک صحت مند روایت سی بن گئی ہے کہ فرقہ وارانہ فساد ہو جانے پر شہر میں 'فرقہ پرستی مخالف کانفرنس' ہوتی ہے۔ کانفرنس کے منتظمین اور حامیوں کے درمیان اکثر اس بات پر بحث ہو جاتی ہے کہ فساد کے فوراً بعد نہ کر کے کانفرنس اتنی دیر میں کیوں کی گئی۔ اس الزام کا جواب منتظمین کے پاس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمہوری طریقے سے کام کرنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ جبکہ غیر جمہوری طریقے سے کیے جانے والے کام جھٹ سے ہو جاتے ہیں جیسے فساد۔ لیکن فسادات کے خلاف کانفرنس کرنے میں وقت لگتا ہے۔ کیونکہ کسی بائیں بازو کی پارٹی کی صوبائی کمیٹی کانفرنس کرنے کا مشورہ قومی کمیٹی کو دیتی ہے۔ قومی کمیٹی ذیلی کمیٹی بنا دیتی ہے تا کہ کانفرنس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جا سکے۔ مرکزی کمیٹی اپنے مشورہ دینے میں کچھ وقت لگاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی سفارشات قومی کمیٹی میں جاتی ہیں۔ قومی کمیٹی میں ان پر بحث ہوتی ہے اور ایک نئی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس کا اجلاس کی صورت میں کام کرنا ہوتا ہے۔

اگر رائے یہ بنتی ہے کہ فرقہ پرستی جیسے سنگین مسئلے پر ہونے والے اجلاس میں تمام بائیں بازو کی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لایا جائے، تو دوسری جماعتوں سے بات چیت ہوتی ہے۔ دوسری جماعت بھی جمہوری طریقے سے اپنے ملوث ہونے کے بارے میں فیصلے کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ کوشش کی جاتی ہے کہ 'فرقہ پرستی مخالف کانفرنس' میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی بنانے کے لیے نامی ہندو، مسلمان، سکھ شہریوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے نام تمام جماعتیں جمہوری طریقے سے طے کرتی ہیں۔ اچھی بات ہے کہ شہر میں ایسے نامی ہندو مسلم، سکھ شہری ہیں جو اس کام کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان شہریوں کی ایک فہرست ہے، مثال کے طور پر بھارتی فضائیہ سے سبکدوش ایک لیفٹیننٹ جنرل ہیں، جو سکھ ہیں، دارالحکومت کی ایک اقلیتی یونیورسٹی کے نائب وائس چانسلر ہیں اور خارجہ سروس سے ریٹائرڈ ایک سفیر ہندو ہیں، اسی طرح کے کچھ اور نام بھی ہیں۔ یہ سب بھلے لوگ ہیں، سماج اور پریس میں ان کا بڑا احترام ہے۔ پڑھے لکھے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز یا سبکدوش۔ ان کے سیکولر ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ہمیشہ اس طرح کی فرقہ پرستی مخالف کانفرنس میں آنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

ایک دن سو کر اٹھا اور حسب دستور آنکھیں ملتا ہوا اخبار اٹھانے بالکنی پر آیا تو ہیڈنگ تھی 'پرانی دلی میں فساد ہو گیا۔ تین مارے گئے۔ بیس زخمی۔ دس کی حالت نازک۔ پچاس لاکھ کی املاک تباہ ہو گئی۔' پوری خبر پڑھی تو پتہ چلا کہ فساد قصاب پورے میں بھی ہوا ہے۔ قصاب پورے کا خیال آتے ہی مختار کا خیال آ گیا۔ وہ وہیں رہتا تھا۔ اپنے شہر کا تھا۔ سلائی کا کام کرتا تھا کناٹ پلیس کی دکان میں۔ اب سوال یہ تھا کہ مختار سے کیسے 'کانٹیکٹ' ہو۔ کوئی راستہ نہیں تھا؛ نہ فون، نہ کرفیو پاس اور نہ کچھ اور۔

مختار اور میں، جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، ایک ہی شہر کے ہیں۔ مختار درجہ آٹھ تک اسلامیہ اسکول میں پڑھا اور پھر اپنے سلائی کے دھندے میں لگ گیا تھا۔ میں اس سے بعد میں ملا تھا، اس وقت جب میں ہندی میں ایم اے کرنے کے بعد بے کاری اور نوکری کی تلاش سے تنگ آ کر اپنے شہر میں رہنے لگا تھا۔ وہاں میرے ایک رشتہ

دار، جنھیں ہم سب ہتھیار کہا کرتے تھے، آوارگی کرتے تھے۔ آوارگی کا مطلب کوئی غلط نہ لیجیے گا، مطلب کہ یہ بے کار تھے۔ انٹر میں کئی بار فیل ہو چکے تھے اوران کے شہر میں اچھے تعلقات تھے۔ تو انھوں نے میری ملاقات مختار سے کرائی تھی۔ پہلی، دوسری اور تیسری ملاقات میں وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ شہر کی اہم سڑک پر سلائی کی ایک دکان میں وہ کام کرتا تھا اور شام کو ہم لوگ اس کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ دکان کا ایک مالک وفاتی بھائی مال دار اور بال بچے دار آدمی تھا۔ وہ شام کے سات بجتے ہی دکان کی چابی مختار کو سونپ کر اور بھینسے کا گوشت لے کر گھر چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دکان مختار کی ہوتی تھی۔ ایک دن اچانک حیدر ہتھیار نے یہ راز کھول دیا کہ مختار بھی 'برادر' ہے۔ 'برادر' کا مطلب بھائی ہوتا ہے، لیکن ہماری زبان میں 'برادر' کا مطلب تھا جو آدمی شراب پیتا ہو۔

شروع شروع میں مختار کا مجھ سے جو ڈر تھا وہ دو چار بار ساتھ پینے سے ختم ہو گیا تھا اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ وہ اپنے سماج اور اس کے مسائل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ اردو کا اخبار پڑھتا تھا۔ خبریں ہی نہیں، خبروں کا تجزیہ بھی کرتا تھا اور اس کا خاص موضوع ہندو مسلم فرقہ پرستی تھی۔ جب میں اس سے ملا تو، اگر بہت سیدھی زبان سے کہیں تو وہ پکا مسلمان فرقہ پرست تھا۔ شراب پی کر جب وہ کھلتا تھا تو شیر کی طرح دہاڑنے لگتا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو جاتا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اتنی کڑی باتیں کرتا تھا کہ میرا جیسا متحمل مزاج نہ ہوتا تو کب کی لڑائی ہو گئی ہوتی۔ لیکن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رہنے اور وہاں 'سٹوڈنٹ فیڈریشن' کی سیاست کرنے کی وجہ سے پکا ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جذباتی اور غصے کا جواب صرف محبت اور دلیل سے دیا جا سکتا ہے۔ وہ محمد علی جناح کا مرید تھا۔ عقیدت سے ان کا نام نہیں لیتا تھا۔ بلکہ انھیں 'قائد اعظم' کہتا تھا۔ اسے مسلم لیگ سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ دو قومی نظریے کو بالکل صحیح مانتا تھا۔ پاکستان کے اسلامی ملک ہونے پر فخر کرتا تھا اور پاکستان کو بہترین مانتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن اس کی دکان میں میں، حیدر ہتھیار اور اوما شنکر بیٹھے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ دکان کے مالک وفاتی بھائی جا چکے تھے۔ کڑکڑاتے جاڑوں کے دن تھے۔ بجلی چلی گئی تھی۔ دکان میں ایک لیمپ جل رہا تھا، اس کی روشنی میں مختار مشین کی تیزی سے ایک پینٹ سی رہا تھا۔ ارجنٹ کام تھا۔ لیمپ کی روشنی کی وجہ سے سامنے والی دیوار پر اس کے سر کی پرچھائیں ایک بڑے سائز میں ہل رہی تھی۔ مشین چلنے کی آواز سے پوری دکان تھرا رہی تھی۔ ہم تینوں مختار کے کام ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ اس کے بعد 'چسکی' لگائی جائے گی۔ آدھے گھنٹے بعد کام ختم ہو گیا اور 'چائے کی پیالیاں' لے کر ہم بیٹھے گئے۔ بات گھوم پھر کر پاکستان پر آ گئی۔ جو حسب دستور مختار پاکستان کی تعریف کرنے لگا۔ 'قائد اعظم' کی عقلمندی کے گیت گانے لگا۔ اوما شنکر سے اس کا کوئی پردہ نہ تھا، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کچھ دیر بعد موقع دیکھ کر میں نے کہا،'' یہ بتاؤ مختار، جناح نے پاکستان کیوں بنایا؟'

''اس لیے کہ مسلمان وہاں رہیں گے''، وہ بولا۔

''مسلمان تو یہاں بھی رہتے ہیں۔''

''لیکن وہ اسلامی ملک ہے۔''

''تم پاکستان تو گئے ہو؟''

''ہاں گیا ہوں۔''

''وہاں اور یہاں کیا فرق ہے؟''

''بہت بڑا فرق ہے۔''

''کیا فرق ہے؟''

''وہ اسلامی ملک ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ وہاں غریبوں اور امیروں میں ویسا ہی فرق نہیں ہے جیسا یہاں ہے؛ کیا وہاں رشوت نہیں چلتی؛ کیا وہاں بھائی پروری نہیں ہے؛ کیا وہاں پنجابی سندھی اور مہاجر 'فیلنگ' نہیں ہے! کیا پولیس لوگوں کو پھنسا پیسہ نہیں وصولتی؟ ''مختار چپ ہو گیا۔ اوماشنکر بولے،''ہاں، بتاؤ۔۔اب چپ کاہے ہو گئے؟''

مختار نے کہا،''ہاں، یہ سب تو وہاں بھی ہے لیکن ہے تو اسلامی ملک۔''

''یار، وہاں ڈکٹیٹرشپ ہے، اسلام تو بادشاہت تک کے خلاف ہے، تو وہ کیسا اسلامی ملک ہے؟''

''اماں چھوڑو... کیا عورتیں وہاں پردہ کرتی ہیں؟ بینک تو وہاں بھی سود لیتے دیتے ہوں گے ... پھر کاہے کا اسلامی ملک۔'' اوماشنکر نے کہا۔

''بھیا، اسلام 'مساوات' سکھاتا ہے ... مطلب برابری، تم نے پاکستان میں برابری دیکھی؟'' مختار تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر اچانک پھٹ پڑا،'' اور یہاں کیا ہے مسلمانوں کے لیے؟ الہ آباد، علی گڑھ، میرٹھ، مراد آباد، دہلی بھیونڈی کتنے نام گناؤ... مسلمانوں کی جان اس طرح لی جاتی ہے جیسے کیڑے مکوڑے ہوں۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''میں کہتا ہوں یہ فساد کیوں ہوتے ہیں؟''

''بھائی میرے، فساد ہوتے نہیں، کرائے جاتے ہیں۔''

''کرائے جاتے ہیں؟''

''ہاں بھائی، اب تو بات جگ ظاہر ہے۔''

''کون کرتے ہیں؟''

''جنھیں اس سے فائدہ ہوتا ہے۔''

''کن لوگوں کو اس سے فائدہ ہوتا ہے؟''

''وہ لوگ جو مذہب کے نام پر ووٹ مانگتے ہیں۔ وہ لوگ جو مذہب کے نام پر نیتاگری کرتے ہیں۔''

''کیسے؟''

''دیکھو، ذرا صرف تصور کرو کہ ہندوستان میں ہندوؤں، مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ کوئی بابری مسجد نہیں ہے۔ کوئی رام جنم بھومی نہیں ہے۔ سب پیار سے رہتے ہیں، تو بھائی، ایسی حالت میں مسلم لیگ یا آر ایس ایس کے لیڈروں کے پاس کون جائے گا؟ ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اس طرح سمجھو کہ شہر میں کوئی ڈاکٹر ہے جو صرف کان کا علاج کرتا ہے اور پورے شہر میں سب لوگوں کے کان ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کان میں کوئی تکلیف نہیں ہے، تو ڈاکٹر کو اپنا پیشہ ترک کرنا پڑے گا یا شہر چھوڑنا پڑے گا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اپنا جواب سوچ رہا تھا۔ میں نے پھر کہا،'' اور فرقہ پرستی سے ان لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے جو اس ملک کی حکومت چلا رہے ہیں۔''

''کیسے؟''

''اگر تمھارے دو پڑوسی آپس میں لڑ رہے ہیں، ایک دوسرے کے پکے دشمن ہیں، تو تمھیں ان دونوں سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا ... اسی طرح ہندو اور مسلمان آپس میں ہی لڑتے رہیں تو حکومت سے کیا لڑیں گے؟ کیا کہیں گے کہ ہمارا یہ حق ہے، ہمارا وہ حق ہے اور تیسرا فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جن کا کاروبار اس کی وجہ سے ترقی کرتا ہے۔

یہ تو شروعات تھی۔ دھیرے دھیرے ایسا ہونے لگا کہ ہم لوگ جب بھی ملتے تھے، بات چیت انہی باتوں پر ہوتی۔ چائے ہوٹل ہو یا شہر کے باہر سڑک کے کنارے کوئی ویران سی پلیا پر بحث شروع ہو جایا کرتی تھی۔ بحث بھی عجب چیز ہے۔

■

ماخذ: بحوالہ کیک اور دوسرے افسانے: اصغر وجاہت، ترجمہ: اعجاز عبید، کتابیں ڈاٹ اردو لائبریری ڈاٹ آر جی

حکیم سعید احسن

قرابادین

قرابادین علم الادویہ کا اہم ترین حصہ ہے، جو دراصل یونانی کا لفظ ہے۔ مگر اسے عربی میں منتقل کیا گیا، جس کا ترجمہ 'ترکیب' ہے اور جو مفرد دواؤں کی ترکیب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

دواؤں کا تعین، شدت وخفت مرض، مرض کا مزاج اور مقامی مریض کو نظر میں رکھتے ہوئے ایسی دواؤں کا انتخاب ناگزیر ہوگیا جو مختلف المزاج اور مختلف الافعال ہوتے ہوئے بھی انتہائی نفع بخش ہوں چنانچہ جس تیز رفتاری سے تحقیق وجستجو کا جذبہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے طبیب کو دواؤں کی شکلیں، معیارِ ادویہ پر کار بند رہنے اور مختلف تبدیلیاں لانے پر مجبور ہونا پڑا نتیجتاً دواؤں کی ترکیب دے کر ایسے مرکبات تیار کرنا جو ہر حالت میں مریض کے موافق ہوں۔ اس ترکیب سے یہ قاعدہ کلیہ سامنے آیا کہ جب دو یا دو سے زیادہ دوائیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک نیا مزاج پیدا ہوتا ہے۔

اسی قاعدے کے تحت قرابادین کا آغاز ہوتا ہے۔ رہ گئی قرابادین کی تدوین واشاعت تو اسے تاریخی حقائق اور اس کی روشنی میں اس کی افادیت کو معلوم کرنے کے لیے تاریخ کے اوراق میں جھانکنا ضروری ہے اس لیے اس مضمون میں تاریخی پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔

تعریف: ایسی مستند کتاب جو دوائے مرکب پر مشتمل ہو جن میں اُن کے اجزاءِ ترکیبی، طریقۂ تیاری، استعمال و مضمرات کی نشاندہی اور مقدارِ خوراک کا تذکرہ ہو۔

سرکاری قرابادین؛ اسے کہا جاتا ہے جو کسی مستند اور تجربہ کار طبیب نے مرتب کی ہو اور جسے سرکاری درجہ بھی حاصل ہو جسے جدید اصطلاح میں 'فارماکوپیا' کہا جاتا ہے۔ ہر ملک کی فارماکوپیا الگ الگ ہوتی ہے۔ چنانچہ دورِ جدید میں آپ دیکھیں تو USP, IP, BP کا اضافہ ملتا ہے جو کہ برٹش فارماکوپیا انڈین فارماکوپیا اور یونائیٹڈ اسٹیٹس فارماکوپیا جسے سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ حکومتیں اس کے لیے کمیٹی بھی تشکیل دیتی ہیں۔ یہ کمپنی اپنی سفارشات حکومت کو پیش کرتی ہے پھر حکومت اسے منظوری دیتی ہے۔

قرابادین کی اہمیت اور افادیت

اطبائے عرب نے جہاں دواسازی کے فن کو عروج بخشا وہیں قرابادین (فارماکوپیا) کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار نبھایا۔ اس لیے اس وقت تک قرابادین کی تدوین باضابطہ طور پر نہ تھی مگر عرب کے طبیبوں نے اس کی ترتیب وتدوین بھی کی اور حکومتِ وقت سے تسلیم بھی کرایا جس سے وہاں کے شفاخانوں میں اسی کے مطابق دوائیں تیار کی جانے لگیں۔ چنانچہ پہلی قرابادین کا درجہ یوحنا بن ماسویہ 857 کو حاصل ہے۔ اس کے بعد ایک اور قرابادین وجود میں آئی جسے سرکاری درجہ حاصل تھا وہ تھی سابور بن سہل 255ھ/869 کی قرابادین اور یہ قرابادین تین سو سال تک رائج رہی پھر ابن تلمیذ 560ھ/1164 کی قرابادین منظرعام پر آئی اور ابن تلمیذ نے جو قرابادینی اصول مرتب کیے انھیں اصولوں پر عمل کرتے ہوئے شفاخانوں میں مرکبات کی تیاری ہوتی رہی۔

اطبائے عرب نے قرابادین کی ترتیب دواؤں کی شکلوں کے اعتبار سے بھی کیا جیسے ضماد، خمیرہ، جوارش، اقراص اور معجونات وغیرہ نیز امراض کے تحت نسخے بھی تحریر کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قرابادین کی ترتیب دوسرے قرابادین سے مختلف نظر آتی ہے جیسا کہ ابن جلجل کی قرابادین سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ابن سینا نے القانون کی پانچویں جلد میں مرکبات کو تحریر کیا نیز مشہور عرب فلسفی یعقوب کندی نے 870 / 800 نے قرابادین کی ترتیب میں بحیثیتِ امراض مرکب نسخوں کو تحریر کیا ہے۔

ابوالفضائل داؤد ابن البیان اسرائیلی 1161ھ کی تصنیف 'الدستور البیمار ستانی فی الادویۃ المرکبۃ' میں ان اطبا کے نسخوں کو مجتمع کردیا۔ یہ ایسا مجموعہ ہے جس میں مختلف بیماریوں کے چنیدہ چنیدہ نسخے موجود ہیں۔

امراض کا لحاظ کرتے ہوئے سہلان بن کیسان 990ء کی کتاب 'مختصر فی الادویۃ المرکبۃ فی اکثر الامراض' ہے جس میں دوا مرکب کا انتخاب مرض کے لحاظ سے ہے۔ معجون، روغن اور شربت اسی انداز سے تحریر کیے گئے ہیں۔

تیرہویں صدی کی مایہ ناز کتاب 'نجیب الدین سمرقندی' 1222 کی 'القرابادین علیٰ ترتیب العلل' ہے۔ چند مشہور قرابادین جو عربی عہد کے ختم ہونے سے پہلے تیرھویں صدی میں تحریر کی گئیں ان میں شہرت یافتہ قرابادین کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) سابور بن سہل کی قرابادین، جس کا ایک نسخہ میونخ میں موجود ہے۔

(2) اسحاق بن حنین کی قرابادین جن کی وفات 911 میں ہوئی اس کا ایک نسخہ بوڈلین میں ہے۔

(3) زکریا رازی کی قرابادین جن کا سنہ وفات 924 ہے اس کے نسخے کتب خانہ تہران اور کتب خانہ فقد مرزا طاہر تنکابنی طبرسی میں ہے جس کا عبرانی ترجمہ 1257 میں کیا گیا۔

(4) ماسویہ المردینی کی قرابادین اگرچہ اصل کتاب کی شکل میں دستیاب تو نہیں ہیمگر Pletro-Dabano۔ 1250 نے اپنی لاطینی قرابادین کا تکملہ (Aenxure) بنا کر تحفظ فراہم کردیا اور یہی لاطینی زبان کی قرابادین یورپ میں سیکڑوں سال تک مستند رہی۔ دواسازی اور مرکبات کی اعلیٰ اور معیاری کتاب کی حیثیت سے رائج رہی۔

(5) سعد بن ہبۃ اللہ 1100 کی قرابادین جو کہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

(6) تلمیذ بن سلامہ 1165 کی قرابادین یہ بھی برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

(7) بدرالدین فلانسی 1149 کی قرابادین بھی ایک زمانے تک رائج رہی۔ اس کے نسخے سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کی لائبریری، پیرس، مانچسٹر اور خدا بخش

لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

خدا بخش پٹنہ میں جونسخہ موجود ہے وہ مخطوطہ ہے جو 782ھ یعنی 1380 کا ہے۔

(8) نجیب الدین سمرقندی 1222 جسے مارٹن لیون اور نوری الخالدی نے عربی متن کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی ترجمہ کیا جو امریکہ سے 1967 میں شائع ہوئی۔

طبی نسخے جومختلف اطبا کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہیں وہ بھی علم الادویہ کے ذخائر میں کم قیمتی نہیں البتہ بعض اطبا نے اپنا ذاتی تجربہ بعض نے چند اطبا کے مجربات پر تالیف کر کے علم الادویہ کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔

ذاتی مجربات کی کڑی کافی طویل ہے مثلاً مجربات فی الطب ابن الجزاز 400ھ، مجرباتِ فی الطب ابن واقد 460ھ مجرباتِ فی الطب ابوالبیان بن المدور 580ھ، مجرباتِ فی الطب ابوالفضائل بن الناقد 584۔ مجرباتِ فی الطب ابن ابی اصیبعہ کے عم رشید الدین علی بن خلیفہ 616ھ، کتاب التجارب والفوائد عمران اسرائیلی 636-561ھ کتاب التجارب زکریا رازی اس کے علاوہ مجربات فی الطب کے نام سے مجرب اور منتخب نسخوں پر مشتمل مختلف اطبا نے اپنے طرزِ تحریر پر علم الادویہ کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔

مجربات ابوالعلا بن زہر کے انتقال کے بعد بادشاہ وقت علی بن یوسف بن تاشقین کے حکم پر اس کی تلاش کی گئی اور جمع ہوجانے پر جمادی الاخریٰ 526ھ میں اسے کتابی شکل میں ترتیب دی گئی۔ موفق الدین ابونصر عین زربی کی کتاب مجربات فی الطب کو جمع و تدوین کے بعد مصر سے شائع کیا گیا۔

قرابادین میں تفصیلات یعنی مواقع استعمال، اجزاء، ترکیب تیاری اور مقدارِ خوراک کا ذکر ضروری ہوتا ہے ادویہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم عمومی سطح پر نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی بھی کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں مختصر طبی نسخے موجود ہیں جس طرح عیون الطب جس میں منتخب نسخوں کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تالیف الملک الصالح نجم الدین ایوب کے رشید الدین ابوسعید نصرانی قدسی نے کی تھی جس کی وفات 646ھ/1248 میں ہوئی۔

قرابادین کا ذکر ہو اور جالینوس کا تذکرہ نہ ہو یہ ممکن نہیں چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جالینوس وہ پہلا طبیب ہے جس نے قرابادین کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ضخیم کتاب کو مرتب کیا اسی لیے قرابادین کا موجد جالینوس کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جابر حسن نامی طبیب نے خلافتِ عباسیہ کے آغاز میں سریانی زبان میں قرابادین کو ترتیب دیا جس کا ترجمہ حنین بن اسحاق بغدادی نے کیا۔

متوکل کے زمانے میں سابو بن سہل نے ایک ایسی جامع قرابادین ترتیب دی جو سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔

بین الاقوامی قرابادین

دواؤں کی معیار بندی، اجزاء ترکیبی، اصلاحات اور مقدارِ خوراک کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے پہلی بار 1847 میں بین الاقوامی قرابادین کی طرف توجہ ہوئی۔

چنانچہ 1948 میں بین الاقوامی قرابادین کے لیے عالمی صحت اسمبلی نے ماہرین فن کی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے بین الاقوامی قرابادین کے لیے عالمی صحت، تجزیاتی طریقوں اور مہنگے آلات سے بچنے کے لیے قدیم مستند طریقوں نیز پیچیدہ اصول کی جگہ متبادل طریقوں کا انتخاب کیا اور اس کی تفاصیل شائع کیں۔

چونکہ پہلا مطمح نظر دواؤں کی عمدگی کی ضمانت جو ہر موثرہ کا حصول اور مقدارِ خوراک جو قرابادینی اصول کے مطابق ہوں اس کے لیے Good manufacturing practice کے لیے اصول وضع کیے گئے تاکہ عمل ترکیب، احاطہ آلات اور جو دوائیں بنائی جائیں اس کے لیے لائسنس یا تجارت کے اختیار کے لیے قانون پر عمل کرنا ضروری قرار دے دیا گیا۔ دواؤں کی برآمدگی کے لیے بین الاقوامی شرائط کی دفعات بھی متعین کی گئیں تاکہ اس دوا کا تجزیہ جب کیا جائے تو اسی معیار پر ہو یہ ضروری ہے۔

بین الاقوامی قرابادین میں دواساز کمپنی کے لیے یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ ترکیب استعمال، مقامات، دواسازی یا کسی دوا کا تجزیاتی نتیجہ عمومی سطح پر شائع کیا جائے۔ اگرچہ اختصار کے ساتھ ہو مگر یہ اختصار بھی قرابادین کے اختصار کے عین مطابق ہو۔ تحفظِ ادویہ، تاریخ حصول، مدتِ عمر اور وقت حصول کا سرٹیفکیٹ متعلقہ محکمے سے جاری کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ قرابادین کی ضرورت اور اس کی تدوین اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں غیر مستند معالج اور بازاری ادویہ فروشوں کی جماعت پر پابندی لگا کر تجارتی کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔ بین الاقوامی قرابادین میں شامل مادہ کی جانچ WHO Technical Report Seres. No 2007 in Press سے رہبری حاصل کی جاسکتی ہے۔

شکلوں کا تعین، مادہ کی جانچ، آلودگی کا درجہ، خودمختار تجربہ گاہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں قرابادین کو مستند کرنے کے لیے حکومتی سطح پر نہ تو کوئی قانون تھا اور نہ ہی کوئی کمیٹی پہلی بار حکومت ہند نے 1940 میں ڈرگس اینڈ کاسمیٹک ایکٹ بنایا اور پھر 1964 میں کچھ ترمیموں کے ساتھ اصول اور ضابطہ متعین کیا جس کے تحت ہر ایک پیتھی کے لیے الگ الگ ماہرین فن کی کمیٹی تشکیل کی اسی کمیٹی کے ذریعے قرابادین کو درجۂ استناد حاصل ہوسکا۔

چند قرابادینی کتب

(1) بیاض فیروز: حکیم فصیح الدین حکیم داؤد، کتب خانہ لاہور
(2) دہلی کے متبادل مرکبات: رام لبھایا گوسوامی، کتب خانہ دہلی
(3) ہمدرد فارماکوپیا آف ایسٹرن میڈیسن: حکیم محمد سعید پاکستان
(4) جدید طبی فارماکوپیا: انیس احمد صدیقی، لاہور
(5) کتاب المجربات: بورڈ آف یونانی اینڈ آیورویدک سسٹم، لاہور
(6) مخزن المرکبات: حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی، گجرات
(7) معمولات مطب خاندانِ شریفی: احسن علی قادری، لاہور
(8) قرابادین: سید حسین محمد، کانپور
(9) قرابادین ہمدرد: حکیم عبدالحمید، دہلوی، کراچی
(10) قرابادین نجم الغنی: حکیم نجم الغنی
(11) قرابادین اعظم: حکیم محمد اعظم
(12) قرابادین احسانی: حکیم احسان
(13) بیاض کبیر: حکیم کبیر الدین
(14) بیاضِ وحیدی: حکیم سید ظل الرحمٰن، علی گڑھ
(15) مطب مرتعش: حکیم سید ظل الرحمٰن، علی گڑھ
(16) قرابادین مجیدی: سی سی آر یو ایم
(17) نیشنل فارمولری آف یونانی میڈیسن: سی سی آر یو ایم
(18) قرابادین قادری: حکیم ارزانی

کتابیات

- بیاضِ وحیدی: حکیم سید ظل الرحمٰن، علی گڑھ 1976
- تذکرہ خاندانِ عزیزی: حکیم سید ظل الرحمٰن، علی گڑھ، 1978
- مطب مرتعش: حکیم سید ظل الرحمٰن: علی گڑھ
- منہاج الصید لہ والکیمیا حکیم محمد رفیق الدین 2001، ادارہ کتاب الشفا دہلی
- توضیحات ادویہ: حکیم عبداللطیف، علی گڑھ
- القانون، جلد پنجم: شیخ الرئیس

■

Prof Hakeem Sayeed Ahsan, Dept Ilmul-Adaviya, Z V M Unani Medical College

بلقیس بانو

غذا اور ہماری صحت

کھانا ہماری زندگی کے لیے ازحد ضروری ہے اور جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے متوازن غذا بہت ضروری ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے جسم کی حفاظت کرے اسے بیماریوں سے پاک رکھے۔ اگر ہم صحت کے اصولوں سے باخبر رہیں اور کھانے پینے میں احتیاط برتیں تو کوئی وجہ نہیں کہ صحت بگڑے۔ جسم میں کسی قسم کی بیماری کا نہ رہنا ہی صحت کی علامت ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ بیماری سے مبرا انسان بھی غیر صحت مند رہ سکتا ہے۔ صحت مند جسم کی علامت جسم میں کمزوری نہ ہو۔ ٹھیک طرح سے بھوک لگے۔ اچھی نیند آئے۔ کام کرنے میں تھکان محسوس نہ ہو۔ آنکھوں کی روشنی ٹھیک رہے۔ ان تمام باتوں کے لیے باقی چیزوں کے علاوہ متوازن غذا انسان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سائنس کے نقطہ نظر سے متوازن غذا میں مندرجہ ذیل چیزوں کا ہونا ضروری ہے (1) پروٹین (2) کاربوہائیڈریٹ (3) چربی (4) نمک (5) پانی (6) وٹامن۔

اگر یہ تمام چیزیں غذا میں توازن اور صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہوں تو ہم بڑی حد تک بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

پروٹین: پروٹین کی ہماری غذا میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ غذا ہم کو دودھ، گوشت، انڈا، مچھلی، گیہوں، دالیں، جو چنا، پنیر وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ گوشت کی پروٹین سبزی کی پروٹین سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں ضروری امینو ایسڈ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ امینو ایسڈ پروٹین کی خام اشیا ہوتی ہیں۔ یعنی بہت سے امینو ایسڈ مل کر پروٹین بناتے ہیں۔ امینو ایسڈ کاربن ہائیڈروجن آکسیجن نائٹروجن اور سلفر سے بنے ہوتے اور یہ 20 قسم کے ہوتے ہیں۔ امینو ایسڈ کی مقدار مختلف پروٹین میں مختلف ہوتی ہے۔ یہ پچاس سے لے کر کئی سو کی تعداد میں ہوسکتی ہیں۔ مختلف پروٹین میں یہ مختلف ترتیب میں جڑے ہوتے ہیں۔ ان 20 قسم کے امینو ایسڈ میں 10 ایسے ہوتے ہیں جن کو ہمارا جسم خود تیار کرسکتا ہے اور یہ غیر ضروری امینو ایسڈس کہلاتے ہیں بقیہ دس امینو ایسڈس ضروری کہلاتے ہیں اور ہمارا جسم ان کو تیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اسی لیے غذا میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔ پروٹین کی اہمیت کا اندازہ ضروری امینو ایسڈ کی مقدار سے ہی لگایا جاتا ہے۔ جس پروٹین میں ان کی مقدار زیادہ ہوگی۔ وہ غذا کے لحاظ سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ اس لحاظ انڈے کی پروٹین 100 فیصد اچھی ہے۔ دودھ اور گوشت کی پروٹین 80 فیصد اور دالوں کی پروٹین کی اہمیت 47-40 فیصد ہے۔ غذا میں پروٹین کی کمی سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ جسم کی نشوونما میں پروٹین کا بڑا دخل ہے۔ ہمارے جسم میں یہ مختلف قسم کے کام انجام دیتی ہیں۔ مثلاً کھانے کا ہضم ہونا، جسم کی بناوٹ اور اس کی نشوونما، جسم کی حفاظت، ہمارا چلنا پھرنا وغیرہ سب پروٹین کی مدد سے ہی ہوتا ہے۔

چربی: چربی ہم کو مکھن، گھی، بالائی، انڈے کی زردی اور کئی طرح کے تیلوں سے حاصل ہوتی ہے یہ بھی کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہوتا ہے۔ چربی کا تھوڑا بہت جز جسم کے ہر خلیے میں پایا جاتا ہے۔ لیکن کچھ خلیے چربی سے بھرے رہتے ہیں جب چربی میں آکسیجن کے ساتھ کیمیائی تبدیلی ہوتی ہے تو حرارت کی شکل میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے ہڈیوں کے جوڑ میں لچیلا پن اور چمڑے میں چکنائی آتی ہے غذا میں چربی کی مقدار زیادہ ہونے سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

کاربوہائیڈریٹس: یہ بھی چربی کی طرح کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مرکب چربی کے مرکب سے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن مختلف مقدار میں موجود ہوتے ہیں اور یہ جسم میں طاقت پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہیں مگر چربی کی نسبتاً اس سے کم حرارت پیدا ہوتی ہے۔ کاربوہائیڈریٹس زیادہ تر غلہ جیسے چاول، گیہوں، ساگودانہ آلو، شکرقند، گڑ، مکہ شہد اور میٹھے پھلوں میں پائے جاتے ہیں۔

نمک: جسم کو قائم رکھنے کے لیے نمک بھی بے حد ضروری ہے۔ نمک سوڈیم، پوٹیشیم، لوہا، کیلشیم، گندھک، فاسفورس، آیوڈین اور کلورین کی مرکب شکل ہے۔

کلیشم فاسفورس سے ہڈیاں بنتی ہیں۔ خون اور خاص کر اس کے سرخ ذرّے لوہے سے ہی تیار ہوتے ہیں جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے خوراک میں آیوڈین کا ہونا ضروری ہے۔ خوراک میں اس کی کمی سے گھیگھے کا مرض ہوجاتا ہے۔ نمک ہم کو دودھ، انڈا، اناج اور ہری سبزیوں جیسے پالک، بتھوا، سرسوں وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔

پانی: پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ اس میں دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہوتی ہے۔ تمام جاندار اور نباتات کے لیے پانی ایک حد درجہ ضروری ہے ہمارے جسم کے وزن کا تین چوتھائی حصہ پانی ہی ہے۔ یوں تو کیمیائی تبدیلیوں سے جسم کے اندر پانی بنتا رہتا ہے۔ مگر اتنا پانی جسم کے کاموں کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے جسم کی ضرورت کے مطابق ایک مقرر مقدار میں پانی پینا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ ہم لوگوں کو 24 گھنٹے میں کم سے کم دو لیٹر پانی پینا چاہیے جو کچھ ہم کھاتے ہیں اسے رقیق بنانے کے لیے اور جسم کی غلاظت

نکالنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن: جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے خوراک میں وٹامن کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ سائنسی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ کوئی جاندار جو خالص پروٹین، کاربوہائیڈریٹ چربی، نمک اور پانی لیتا ہے کبھی تندرست نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کی غذا میں وٹامن شامل نہ ہو۔ وٹامن قدرتی غذا میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ غذا میں وٹامن کی کمی سے بچوں کی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے مریض بن سکتے ہیں۔ وٹامن کو حیاتین بھی کہتے ہیں۔ پانچ قسم کے وٹامن صحت مند رہنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔

وٹامن اے: یہ دودھ، پنیر، انڈے کی زردی، مکھن، پنیر، ہری پتیاں، گاجر، ٹماٹر، جگر اور گردے میں پایا جاتا ہے۔ مچھلی کے تیل میں اس وٹامن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ چربی میں گھلنے والا وٹامن ہے یہ پانی میں نہیں گھلتا ہے اس کی کمی سے جسم میں بیماریوں سے لڑنے کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ اس وٹامن کی کمی سے رتوندی (Night Blindness) کی بیماری ہوجاتی ہے۔ اُبالنے سے یہ وٹامن برباد نہیں ہوتا۔

وٹامن بی: یہ زیادہ ترکاریوں، اناج، دال، دودھ، انڈے، کلیجی، آلو، گاجر، مولی، شلجم، مچھلی گوشت میں پایا جاتا ہے۔ یہ وٹامن پانی میں گھل جاتا ہے۔ اس وٹامن کی کمی سے دماغی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں، آنتوں کی خرابیاں بھی اس وٹامن کی کمی سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ پٹھوں کی کمزوری اور بیری بیری کا مرض ہوجاتا ہے۔ یہ پانی میں گھلنے والا وٹامن ہے۔

وٹامن سی: یہ بھی پانی میں گھلنے والا وٹامن ہے۔ یہ ابالنے سے برباد ہوجاتا ہے۔ یہ ترکاریوں، پھلوں، انڈوں، ساگ، سبزی میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ٹماٹر، لیمو، سنترا، امرود، آنولا، رس بھری وغیرہ میں یہ کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اکثر غذا میں اس کی کمی سے خون کی کمی پیدا ہوجاتی ہے، وزن کم ہوجاتا ہے اور پٹھے کمزور ہوجاتے ہیں اور مسوڑھوں سے خون نکلنے لگتا ہے۔ دانتوں کی بیماریوں اور سوکھے کے مرض کے لیے یہ وٹامن مفید ہے۔

وٹامن ڈی: یہ چربی میں گھلنے والا وٹامن ہے۔ یہ مچھلی کے تیل، دودھ، مکھن، پنیر، چربی اور انڈے وغیرہ سے ملتا ہے۔ یہ ہڈیوں کو ٹھیک سے بڑھنے میں مدد دیتا ہے اس لیے اس کی کمی سے سوکھے اور دق کی بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ وٹامن ابالنے سے برباد نہیں ہوتا ہے۔

وٹامن ای: یہ بھی چربی میں گھلنے والا وٹامن ہے۔ یہ گیہوں میں کثیر مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کی کمی سے انسان کی پیدا کرنے کی طاقت یعنی افزائش نسل کی قوت ختم ہونے لگتی ہے۔ یہ وٹامن ابالنے سے ضائع نہیں ہوتا ہے۔ اس کی اچھی مقدار دودھ، پھل اور ترکاریوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

غذا کے متعلق چند ضروری باتیں:

(1) خوب چبا کر کھانا کھائیں۔ دانتوں کا کام معدے پر نہ ڈالیں۔

(2) تھوڑی بھوک باقی رہے تو ہاتھ روک لیں۔ زیادہ کھانا بیماری لاتا ہے۔

(3) جب تک کھانا بخوبی ہضم نہ ہوجائے۔ کسی قسم کی سخت جسمانی ورزش نہیں کرنا چاہیے۔

(4) کھانا کھا کر جلدی نہیں سونا چاہیے۔ کم از کم ایک گھنٹہ بعد سونا چاہیے۔

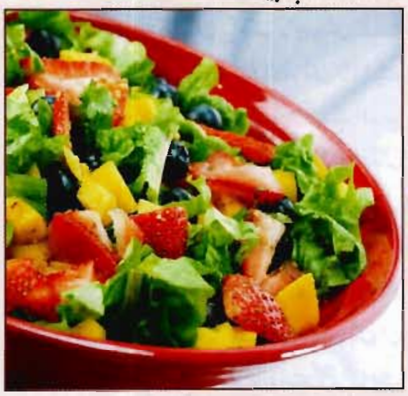

(5) لیمونیڈ سوڈا، شربت خواہ کسی قسم کے ہوں، شراب نشہ جو کسی قسم کا ہو، سگریٹ، برانڈی، شیرینی وغیرہ معدہ کے لیے نقصان دہ ہیں۔

مختصر طور پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چلنا پھرنا، محنت کرنا اس قدر جو بآسانی کی جاسکے اور سادہ غذا مثلاً اناج ترکاری، گوشت کا شوربہ جیسی زیادہ مصالحہ نہ ہو صاف پانی پینا، چھ سات گھنٹہ سونا، صبح سویرے اٹھنا، جلدی سونا، ہلکی ورزش کرنا، دن کا زیادہ حصہ کام میں مشغول رکھنا۔ دواؤں سے جب تک ہوسکے پرہیز کرنا ایسی چیزیں ہیں جو معدہ کو قوت دیتی ہیں اور عمر کو بڑھاتی ہیں۔ آیئے اب اس بات کا جائزہ لیں کہ انسان کو کام کرنے کے لیے کتنی غذا ضروری ہے۔

ایک مرد بہ نسبت ایک بچہ اور ایک عورت کے زیادہ کھاتا ہے۔ 10 سے لے کر 13 برس کے بچے اتنا کھاتے ہیں جتنا ایک عورت کیونکہ یہ عمر ان کی بڑھنے والی عمر ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف لوگوں کی مختلف غذائیں ہیں کچھ تو صرف چاول اور سبزی کھاتے ہیں کچھ مکھن گھی گوشت وغیرہ کھاتے ہیں۔ بہرحال جو کھانا ہم کھائیں یہ ہماری پسند پر منحصر ہے۔ لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ غذا متوازن ہو۔ ہماری غذا میں کاربوہائیڈریٹ، پروٹین اور چربی طاقت پیدا کرنے کے لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں بلکہ کھانے کا وزن اور کھانے کی قسم طاقت کے لحاظ سے دونوں ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ چونکہ کھانے کا وزن ہر شخص کی خوراک کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری بات یہ ہے کہ کھانے کی قسم کیا ہو۔ کچھ چیز کی اہمیت طاقت (کیلوریز) کے لحاظ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً گوشت، دودھ، انڈا مچھلی وغیرہ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری غذ میں کتنا وزن کاربوہائیڈریٹ پروٹین اور چربی کا ہونا چاہیے انسان کا وزن جتنا کلوگرام ہوتا اتنے ہی گرام پروٹین اتنے ہی گرام چربی اور باقی حصہ کاربوہائیڈریٹ ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر 70 کلوگرام وزن کے انسان کو لیجیے جس کی عمر 25 سال ہے اس کے لیے چربی 70 گرام، کیلوریز 630☆ پروٹین 70 گرام کیلوریز 280 ☆ کاربوہائیڈریٹ 525 گرام کیلوریز 2100 کیلوریز کے حسب سے کل میزان = 3010 ہوتا ہے۔ اس طرح ایک 25 سال کے انسان کو 3000 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ 12 سال سے کم عمر کے بچوں کو 1300 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔

13-15 سال کے بچوں کو 3100 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے اور 16-19 سال کی عمر کے بچوں کے لیے 3600 کیلوریز کی ضرورت ہے۔ لیکن 45 سال کی عمر میں صرف 3000 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ 65 سال کی عمر میں یہ مقدار گھٹ کر 2550 کیلوریز رہ جاتی ہے۔ اس حساب سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہر عمر میں بچوں اور بڑوں کو غذا میں کتنا کاربوہائیڈریٹ، کتنی پروٹین اور کتنی چربی لینی چاہیے تاکہ غذا متوازن رہے۔ اس کے لیے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ ایک گرام کاربوہائیڈریٹ سے 400 کیلوریز ملتی ہیں۔ ایک گرام پروٹین سے بھی 400 کیلوریز ملتی ہیں لیکن ایک گرام چربی سے 900 کیلوریز حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر شخص یہ جان سکتا ہے کہ صحت مند رہنے کے لیے کتنا اور کیا کھانا ضروری ہے۔ اس طرح انسانی صحت میں غذا کی بڑی اہمیت ہے۔

■

Prof. Bilqees Bano, Chairperson, Dept of Bio-Chemistry F/O Life Sciences AMU, Aligarh - 202001 (UP)

محمد اسلم فاروقی

تعلیمی اداروں میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال

اکیسویں صدی میں جدید ٹیکنالوجی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوگئی ہے اور ٹیکنالوجی کا استعمال اپنے کام کو بہتر بنانے میں لازمی تصور کیا جارہا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں بہت بڑا انقلاب آیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کبھی کبھی کوئی نادر واقعہ پیش آتا تو اسے بریکنگ نیوز کہا جاتا تھا۔ آج ٹیلی ویژن کے نیوز چینلوں پر ہر تھوڑی دیر میں ہمیں دنیا کے کسی حصے سے بریکنگ نیوز کی اطلاع ملتی ہے۔ ہر دن کوئی نہ کوئی نئی ایجاد اور نئے طور طریقے ہماری زندگی میں شامل ہورہے ہیں۔ الیکٹرانک کے شعبے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ جیب میں رکھے جانے والے ایک چھوٹے سے آئی فون میں ہمیں انفارمیشن کے حصول سے متعلق ہر سہولت دستیاب ہے۔ جیسے فون سے بات کرنا ویڈیو کالنگ، انٹرنیٹ براؤزنگ، فیس بک چیٹنگ، ای میل کی سہولت اور بہت کچھ۔ آج کے اس دور میں جہاں ٹیکنالوجی کے بڑھتے اثرات نے زندگی کو تیز رفتار بنادیا ہے۔ وہیں تعلیم کے شعبے میں بھی ٹیکنالوجی کا اثر محسوس کیا جارہا ہے اور جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے اساتذہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر پیشہ تدریس کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرسکتے ہیں اور تعلیمی ادارے بھی اپنے انتظامی امور میں ٹیکنالوجی کو اختیار کرتے ہوئے اپنی انتظامیہ کو بہتر اور فعال بنا سکتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ ٹیکنالوجی کس طریقے سے ہماری موجودہ تعلیم کا حصہ بن رہی ہے۔

تعلیم کامفہوم: تعلیم کے معنی جاننے کے ہیں۔ جو بات ہمیں نہیں معلوم اسے جاننے کا نام تعلیم ہے۔ علمی اصطلاح میں ایک انسان کو اس دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے لیے یا بطور پیشہ کوئی شعبہ اختیار کرنے کے لیے جن باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اسے تعلیم کہتے ہیں۔ تعلیم صرف کتابی نہیں ہوتی، بلکہ زندگی میں آنے والا ہر دن اور اس دن ہونے والے کسی واقعہ سے سبق حاصل کرنا تعلیم کا ہی حصہ ہے۔ اچھی تعلیم وہی ہے جس میں فرد کی ہر لحاظ سے ترقی ہو۔ تعلیم کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی سنورتی ہے اور وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ تعلیم روشنی ہے اور جہالت اندھیرا ہے۔ ایک جاہل انسان کبھی کبھی اپنی جہالت سے دنیا والوں کو نقصان بھی پہونچا سکتا ہے۔ اس لیے معاشرے کی ذمے داری ہے کہ وہ خواندگی کو عام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں حکومت نے ہر بچے کے لیے لازمی تعلیم قانون بنایا ہے۔ اور بچہ مزدوری کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ ہندوستان میں روایتی 3+2+10 کا نظام تعلیم رائج ہے۔ آج تعلیم کے حصول کے ذرائع میں اسکول، کالج، یونیورسٹی، اساتذہ اور کتابوں کے علاوہ الیکٹرانک ذرائع جیسے ای کلاس روم، اسمارٹ کلاس، اوور ہیڈ پروجیکٹر، کمپیوٹر سی ڈیز، ٹیبلٹ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ وغیرہ شامل ہیں، جن کی مدد سے عصر حاضر کا استاد اپنے نئے زمانے کی تعلیم کو بہتر بنا سکتا ہے۔

اسکول کی سطح پر بہ طور تدریسی وسائل جدید ٹیکنالوجی کا استعمال:

اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ وہ دوران تدریس، تدریسی آلات جیسے بلیک بورڈ، چاک پیس، کتاب، نقشہ جات، تصاویر اور دیگر ماڈلس کا استعمال کریں تاکہ اپنے سبق کو دلچسپ اور معلوماتی بنایا جاسکے۔ اسکول کی سطح پر جب کہ بچہ نو آموز ہوتا ہے اور اسے دنیا کی بہت سی باتوں سے

واقفیت نہیں ہوتی۔ وہاں ان تدریسی وسائل کا استعمال لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کل بعض مدارس پرائمری سطح پر کمرہ جماعت کو عصری ٹیکنالوجی سے لیس کر رہے ہیں اور ہر کمرہ جماعت کو پروجیکٹر سے آراستہ کرتے ہوئے لیپ ٹاپ اور تعلیمی سی ڈیز کی مدد سے اپنے سبق کو بہتر انداز میں پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح کی کلاس کو اسمارٹ کلاس کا نام دیا جا رہا ہے۔ بعض تعلیمی ادارے ماہرین کمپیوٹر اور گرافکس و اینیمیشن کی مدد کے ساتھ کتابوں کے روایتی سائنسی سماجی علوم اور ریاضی و زبان کے اسباق کو معیاری بنا رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک ادارہ ہے جو Educomp کے نام سے کام کر رہا ہے، جس کی تعارفی کلاسیس انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ Educomp ادارے کے لوگ کسی تعلیمی ادارے سے معاہدہ کرتے ہیں اور ان کے نصاب یا خود ادارے کے نصاب کی مکمل کلاسیس کے اسباق انٹرنیٹ اور خصوصی پاس ورڈ کے ذریعے دستیاب کراتے ہیں اور اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ کیسے اسمارٹ کلاس میں پڑھائیں۔ جو تعلیمی ادارے اس طرح کی ٹیکنالوجی استعمال کر رہے ہیں ان کے بچوں میں اور روایتی کتاب کاپی قلم سے سیکھنے والے تعلیمی اداروں کے طلبا کے معیار تعلیم میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اس میں والدین اور تعلیمی اداروں کے ذمے داروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبا کو معیاری تعلیم دینے کے لیے عصر حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھیں۔ اسکولی سطح پر طلبا کو خصوصی انٹرنیٹ پروگرام کے ذریعے تعلیم کے علاوہ کسی موضوع پر پہلے سے دستیاب سی ڈی کا پروگرام دکھاتے ہوئے بھی تعلیم دی جا رہی ہے۔ آج کل کتابوں کی دکانوں میں چھوٹے بچوں کے لیے نظموں کی سی ڈی، انگریزی بول چال سیکھنے کی سی ڈی، وائیلڈ لائف سی ڈی وغیرہ دستیاب ہیں۔ ایسے والدین جو گھر میں کمپیوٹر یا سی ڈی پلیر رکھتے ہیں۔ وہ اس طرح کی معلوماتی سی ڈی حاصل کرتے ہوئے گھر پر بھی بچوں کو ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم فراہم کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ تو ان دنوں معلومات کی فراہمی کا سب سے اہم اور ایک طرح سے آسان ذریعہ ہو گیا ہے۔ Google سرچ انجن کا دعویٰ ہے کہ اس کے ہاں سب کچھ ملتا ہے۔ کسی لفظ کے معنی معلوم کرنا ہو، کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ کرنا ہو، کسی موضوع پر تفصیلی معلوماتی مضمون درکار ہو، کسی موضوع کی تصویر درکار ہو یا کسی موضوع پر ویڈیو چاہیے بس گوگل کی سہولت سے ترجمہ، تصاویر، ویکی پیڈیا یا یوٹیوب پر جائیے آپ کی پسند کی ہر چیز اور ہر موضوع کی معلومات دستیاب ہیں۔ اس کے لیے سرچ انجن میں درست الفاظ ٹائپ کرنے ہوں گے۔ گزشتہ 11 نومبر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر ملک بھر میں قومی یوم تعلیم تقاریب منائی گئیں۔ ہمارا ارادہ ہوا کہ کیوں نہ انٹرنیٹ سے مولانا آزاد کی آواز میں ان کی تقریر تلاش کی جائے چنانچہ یوٹیوب پر سرچ کرنے پر مولانا آزاد کی آواز میں 1947 میں کی گئی ان کی تقریر ڈاؤن لوڈ کی گئی اور فون کی مدد سے اسے ریکارڈ کر کے مائیک کے ذریعے اسے نئی نسل کے طلبا کو سنایا گیا۔ اس طرح ٹیکنالوجی کا یہ

فائدہ ہوا کہ مولانا آزاد کے گزر جانے کے بعد بھی ان کی آواز ان کے بعد آنے والی نسلیں سن پائی ہیں۔ اس طرح والدین اور اساتذہ اگر طلبا پر نگرانی رکھیں اور ان کے لیے تعلیمی ویب سائٹس تک رسائی کو ممکن بنائیں تو بچے چھٹی کے اوقات میں انٹرنیٹ سے بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ جن طلبا کو کمپیوٹر پر ٹائپنگ آتی ہو وہ کوئی سبق ٹائپ بھی کر سکتے ہیں۔ بعض مدارس اپنے طلبا کو اس طرح کا ہوم ورک دے رہے ہیں اور ای میل کے ذریعے ہوم ورک کی جانچ ہو رہی ہے۔ بعض طلبا کو ڈرائنگ میں دلچسپی ہوتی ہے۔ ان طلبا کو پینٹنگ اور ڈرائنگ میں ماہر بنانے کے لیے کمپیوٹر کے ورڈ آرٹ سافٹ ویئر سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس طرح اسکول کی سطح پر 'Educomp' کی اسمارٹ کلاس 'لیپ ٹاپ' سی ڈی اور انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم کو بہتر 'معلوماتی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

کالج کی سطح پر بہ طور تدریسی وسائل جدید ٹیکنالوجی کا استعمال:

ایک معیاری اسکول سے فارغ جب ایک طالب علم کالج کی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو کالج کی انتظامیہ کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے کالج کو تدریسی وسائل کے طور پر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رکھے۔ چنانچہ کالج کا ہر کمرہ جماعت ای کلاس روم ہو جہاں اساتذہ کے لیے پروجیکٹر کے استعمال کی سہولت ہو اور طلبا بھی اس سہولت سے استفادہ کر سکیں۔ کالج کا طالب علم عنفوان شباب کی عمر کے دور سے گزر رہا ہوتا ہے اور آج کل طالب علم انٹر نیٹ، ٹیلی ویژن اور سیل فون کے اچھے برے اثرات کے ساتھ کالج کے ماحول میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ایسے میں طالب علم کی صلاحیتوں کو مثبت افکار کی جانب موڑنا ایک ماہر تعلیم استاد کی اولین ذمے داری ہوتی ہے۔ چنانچہ کالج کے کلاس روم میں بھی روایتی کتاب: بلیک بورڈ اور چاک پیس و نقشہ جات کے علاوہ ایک ماہر استاد اپنے لیپ ٹاپ اور پروجیکٹر کی مدد سے طلبا کو اپنا سبق بہتر طور پر سمجھا سکتا ہے۔ اس کے لیے استاد کو کمپیوٹر کا ماہر ہونا ہوگا اور وہ پاور پوائنٹ سہولت کی مدد سے مختلف معلوماتی سلائیڈز کی مدد سے اپنے سبق کو بہتر دلچسپ اور عصر حاضر کے تقاضوں سے متعلق ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ سائنس کے مضامین ہوں کہ کوئی اور مضمون جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اسے بہتر طور پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ ای کلاس کے لیے اسباق کی تیاری ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے تیار کرنا سب کے بس کی بات نہیں اور اگر ایک معیاری سبق تیار ہو تو قومی سطح پر اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ریاستی سطح کے انٹرمیڈیٹ و ڈگری کے بورڈ اور NCERT اور SCERT کی جانب سے ماہر اساتذہ کو طلب کیا جا رہا ہے اور انھیں تمام سہولتوں سے لیس کمپیوٹر لیب فراہم کیا جا رہا ہے نیز انھیں معاوضہ دے کر تعلیمی اسباق تیار کیے جا رہے ہیں۔ ان اسباق کی ڈی وی ڈیز تعلیمی اداروں کو مہیا کرائی جا رہی ہیں۔ ان کی مدد سے تعلیم کو ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا جا رہا ہے۔ کالج کی سطح پر لائبریری کو بھی عصر حاضر کی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اگر لائبریری میں مختلف موضوعات کی سی ڈی ہوں اور کوئی طالب علم لائبریری میں بیٹھ کر کمپیوٹر کی مدد سے وہ سی ڈی دیکھ سکتا ہو تو اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کل کالج

آندھرا پردیش میں MANA TV کے نام سے سرکاری چینل چل رہا ہے، جس پر ہر تین ماہ کے مختلف پروگرام کا ٹائم ٹیبل دیا جاتا ہے اور کالج میں ایک لیکچرر کو اس کا انچارج بنایا جاتا ہے۔ وہ وقت مقررہ پر طلبا کو کمرہ جماعت میں جمع کرتا ہے اور مخصوص ڈش انٹینا سے نشر ہونے والے پروگرام کو دکھایا جاتا ہے۔ ان پروگراموں میں کچھ براہ راست پروگرام بھی ہوتے ہیں اور طلبا کو فون کی سہولت دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے سوالات کر سکیں۔

کی لائبریری کے ایک ہال میں ایک بڑا مانیٹر لگایا جارہا ہے۔ اگر کسی دن کسی مضمون کا لیکچرر غیر حاضر ہو تو لائبریری کا انچارج طلبا کے لیے اس مضمون سے متعلق سی ڈی لگاتا ہے اور ساری کلاس ایک لیکچرر کی غیر موجودگی کے باجود وقت پر ایک اہم لیکچر سے مستفید ہوسکتی ہے۔ آج کل کالج کے طلبا کے لیے حکومتی سطح پر چلائے جانے والے خصوصی ٹیلی ویژن چینلوں پر بھی معلوماتی پروگرام نشر کیے جارہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں MANA TV کے نام سے سرکاری چینل چل رہا ہے، جس پر ہر تین ماہ کے مختلف پروگرام کا ٹائم ٹیبل دیا جاتا ہے اور کالج میں ایک لیکچرر کو اس کا انچارج بنایا جاتا ہے۔ وہ وقت مقررہ پر طلبا کو کمرہ جماعت میں جمع کرتا ہے اور مخصوص ڈش انٹینا سے نشر ہونے والے پروگرام کو دکھایا جاتا ہے۔ ان پروگراموں میں کچھ براہ راست پروگرام بھی ہوتے ہیں اور طلبا کو فون کی سہولت دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے سوالات کرسکیں۔ اکثر پروگرام ایسے ماہر اساتذہ پیش کرتے ہیں جن کے طریقہ تدریس میں شک وشبہ کی گنجائش کم ہوتی ہے اور طالب علم کو سیر حاصل معلومات ہوتی ہیں۔ قومی سطح پر دوردرشن اور دیگر خانگی ٹیلی ویژن چینل بھی طلبا کے لیے پروگرام پیش کر رہے ہیں جن سے طلبا استفادہ کرسکتے ہیں۔ سوشیل میڈیا جیسے فیس بک اور ٹویٹر وغیرہ کو بھی فروغ تعلیم کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے طالب علم فیس بک کے دیوانے ہیں۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ یا استاد اپنا ایک فیس بک گروپ رکھے اور اس میں اپنے طلبا اور ماہرین تعلیم کو ممبر بنائے اور معلومات اور اہم اعلانات کا تبادلہ ہو تو اس سے طلبا کی تعلیمی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ گراج گورنمنٹ کالج نظام آباد کے شعبہ اردو نے بھی اس طرح کا ایک گروپ 'شمع فروزاں' کے نام سے بنایا ہے۔ اس گروپ میں کالج کے طلبا کے علاوہ یونیورسٹی اور کالج کے ماہر اساتذہ ،ماہرین تعلیم، شعرا، ادیب اور کیریئر گائیڈنس کے ماہرین شامل ہیں جو اپنی قیمتی معلومات اور افکار سے طلبا کو مستفید کرتے ہیں اور گروپ انچارج طلبا کو اہم اعلانات سے واقف کراتے ہیں۔ اس طرح تعلیم کے فروغ میں سوشیل میڈیا کا بہتر استعمال ہوسکتا ہے اور طلبا کی صلاحیتوں

کو منفی رجحانات کے بجائے مثبت رجحانات کی جانب موڑا جاسکتا ہے۔

آن لائن تدریس: انٹرنیٹ کی بڑھتی مقبولیت اور اس کی عام آدمی تک رسائی سے بہت سی سہولتیں عام ہوگئی ہیں اور آج آن لائن خدمات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ تعلیمی ادارے بھی آن لائن درخواستیں وصول کررہے ہیں اور طلبا کو مختلف مسابقتی امتحانات کے ہال ٹکٹ بھی آن لائن فراہم کررہے ہیں۔ اسی آن لائن سہولت کو تدریس میں بھی استعمال کیا جارہا ہے اور آؤٹ سورسنگ خدمات کے ذریعے طلبا کو خانگی ٹیوشن فراہم کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی مقام پر رہنے والا ایک قابل استاد دنیا کے کسی بھی گوشے میں موجود اپنے شاگرد کو ایک تیز رفتار کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنکشن کی بدولت آن لائن ٹیوشن پڑھا سکتا ہے اور یہ سہولت ان دنوں مقبول بھی ہورہی ہے۔ آج کل ایسے رائٹنگ پیڈ بھی دستیاب ہیں جن کی مدد سے اسکرین پر قلم کی طرح لکھا بھی جاتا ہے۔ اس طرح آؤٹ سورسنگ اور آن لائن کی بدولت ہر طرح کی تعلیم گھر بیٹھے ممکن ہوگئی ہے۔ کالج کی سطح پر طلبا اس قسم کی سہولت سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ کالج میں چونکہ طے شدہ نصاب ہی پڑھنا ہوتا ہے اس لیے طلبا کو زیادہ کتابوں کی ضرورت نہیں پڑتی اگر ضرورت ہو بھی تو ای کتابوں کی مدد سے یا انٹرنیشنل لائبریری سے بہ ذریعہ انٹرنیٹ دنیا کے کسی بھی کتب خانے کی لائبریری سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ کالج کے طلبا کو مسابقتی امتحانوں کی تیاری میں بھی انٹرنیٹ سے مدد ملتی ہے اور سابقہ امتحانوں کے پرچے اور امتحان کی تیاری کا مواد نیٹ سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور تدریس کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ کالج کے اساتذہ کو کمپیوٹر کی مہارت کا حامل ہونا ضروری ہے اور وہ ایک ایسا لیپ ٹاپ بھی ساتھ رکھے جس میں نیٹ کی سہولت ہو۔ آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی سہولت کے لیے wifi انٹرنیٹ سہولت دی جارہی ہے طلبا اور اساتذہ اس سہولت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

یونیورسٹی کی سطح پر بہ طور تدریسی وسائل ٹیکنالوجی کا استعمال: کالج کے بعد ایک طالب علم کے لیے حصول علم کا ایک بڑا موقع یونیورسٹی کی تعلیم ہوتی ہے جہاں پوسٹ گریجویشن کے بعد ریسرچ کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ یونیورسٹیوں کا نگراں ادارہ یو جی سی اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے ایسے قابل سائنس داں اور ماہر تعلیم تیار ہوں جو ملک اور دنیا کو ان کے مسائل سے نجات دلانے کے لائق بنیں۔ اس لیے یو جی سی یونیورسٹیوں کی ترقی کے لیے لاکھوں روپے کا بجٹ منظور کررہی ہے اور تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے ہر قسم کے وسائل مہیا کرا رہی ہے۔ یونیورسٹی میں کلاس روم تدریس کم ہی ہوتی ہے اور طالب علم کو انفرادی طور پر حصول علم کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں اور یونیورسٹی طالب علم کے لیے علم کا خزانہ لائبریری ہوتی ہے۔ چنانچہ لائبریری میں کتابوں کے علاوہ ای کتابیں، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مدد سے دنیا بھر کی لائبریریوں سے استفادے کی سہولت دستیاب کرائی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں یونیورسٹی آف حیدرآباد کی اندرا گاندھی لائبریری جنوبی ہند میں اس طرح کی سہولت کے لیے مشہور لائبریری ہے۔ یونیورسٹی کے پروفیسر کے لیے

ضروری ہے کہ وہ پاور پوائنٹ کے ذریعے تدریس کا ماہر ہو۔ چنانچہ وہ ایسے اسباق تیار کرتا رہے اور انھیں مختلف سمیناروں اور سمپوزیموں میں پیش کرتا رہے۔ طلبا اگر اس طرح کے لیکچر میں شرکت کریں تو انھیں استفادے کا موقع ملتا ہے۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی، امبیڈکر اوپن یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے ٹیلی ویژن پر تعلیمی پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔ جن سے طلبا مستفید ہو سکتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا بھی انٹرنیٹ کے ذریعے اپنی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

تعلیمی ٹیکنالوجی اور اردو: اردو زبان بھی آج انٹرنیٹ سے کافی ہم آہنگ ہو رہی ہے اور اردو ان پیج کے علاوہ اردو یونیکوڈ سافٹ ویئر کی مدد سے کمپیوٹر میں بآسانی تحریر کی جا سکتی ہے۔ mbilal.com پر اردو یونیکوڈ سافٹ ویئر دستیاب ہے۔ اس سافٹ ویئر کی مدد سے ایم ایس آفس کے تمام پروگراموں میں اردو میں کام کیا جا سکتا ہے اور فیس بک پر اردو میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اس سافٹ ویئر کی مدد سے اردو میں ای کتابوں کا خزانہ بڑھ رہا ہے اور ان پیج سے یونیکوڈ اور یونیکوڈ سے ان پیج اور پی ڈی ایف کنورٹر سافٹ ویئر کی مدد سے اردو کمپوزنگ کی دنیا میں انقلاب آیا ہے۔ اور دور جدید میں اردو کتابت کا کام تیز رفتار اور آسان ہو گیا ہے۔ یونیکوڈ سے اردو ای میل بھی روانہ کیا جا سکتا ہے۔ ان پیج کی تحریر کو پی ڈی ایف کنورٹر کی مدد سے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح اردو زبان بھی کمپیوٹر سے بہت حد تک ہم آہنگ ہوئی ہے۔ NCPUL فروغ اردو کا قومی ادارہ ہے جس کے تعلیمی پروگراموں سے اردو اور کمپیوٹر کو سکھایا جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دن قبل مرکزی وزیر کپل سبل نے اعلان کیا کہ اردو کو کمپیوٹر کے سرچ انجن کو گوگل کا حصہ بنایا جائے گا۔ اس سے اردو سرچ میں آسانی ہوگی۔

تعلیمی اداروں میں انتظامی ضرورت کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال: ایک طرف جہاں تعلیمی معیار کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جا رہا ہے وہیں انتظامی امور کے لیے بھی تعلیمی ادارے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں۔ اسکول کی سطح پر ایسا سافٹ ویئر استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس کی مدد سے طالب علم کے داخلے سے لے کر اس کے اسکول چھوڑنے تک تمام ریکارڈ ایک داخلہ نمبر کے ساتھ محفوظ کیے جا رہے ہیں اور طالب علم کی ترقی اور پیش رفت کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔ گروپ ایس ایم ایس کے ذریعے ٹیچر بچوں کے ہوم ورک والدین کے فون پر مسیج کر رہے ہیں اور اسی طرح اہم اعلانات بھی ایس ایم ایس سے کیے جا رہے ہیں۔ طلبا کے پروگریس کارڈ اور امتحانی پرچے اور ماڈل پیپر وغیرہ بھی کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیے جا رہے ہیں۔ ہائی اسکول اور کالج کی سطح پر اس قسم کے سافٹ ویئر استعمال ہو رہے ہیں اور بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور بورڈ بچوں کے مارکس کے میمو اور تعلیمی اسناد کمپیوٹر کی مدد سے تیار کر رہے ہیں۔ طلبا کے لیے آن لائن داخلوں کی کونسلنگ ہو رہی ہے۔ فیس کا ادخال کور بینکنگ کے ذریعے ہو رہا ہے۔ طلبا کے ہال ٹکٹ اور او ایم آر بار کوڈ شیٹ بھی کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیے جا رہے ہیں۔ امتحانات کے بعد نتائج کا اعلان اور مزید کارروائی بھی کمپیوٹر اور آن لائن ٹیکنالوجی کی مدد سے ہو رہی ہے۔ بعض تعلیمی اداروں نے اپنے اسٹاف میں وقت کی پابندی اور ڈسپلن لانے کے لیے پنچ کارڈ سسٹم شروع کیے ہیں، جس میں ملازمین کی دفتر میں آمد اور روانگی کا ٹائم محفوظ ہو جاتا ہے۔ پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر سی سی کیمروں کی مدد سے اسکول اور کالج کے انتظامی امور پر نظر رکھ رہے ہیں اور پبلک ایڈریس سسٹم اور اجتماعی فون کی مدد سے رابطہ رکھ رہے ہیں۔ اس طرح تعلیمی اداروں کے انتظامی امور میں بھی ٹیکنالوجی اہم رول ادا کر رہی ہے۔ زیراکس مشین، فیکس مشین، اسکینر، اور دیگر آلات بھی تعلیمی اداروں کے کام کی رفتار اور معیار میں فرق پیدا کر رہے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے منفی اثرات: تعلیمی ادارے ہوں یا زندگی کا کوئی اور شعبہ ہو آج کل ٹیکنالوجی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کے منفی اثرات اور حدود بھی ہیں۔ سب سے پہلی بات کے ہندوستان جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک میں جہاں کا عام آدمی روٹی کپڑا اور مکان کے لیے پریشان ہے۔ اسے ٹیکنالوجی تک رسائی حاصل کرنا مشکل ہے۔ ٹیکنالوجی مہنگی ہے۔ اور مہنگی ٹیکنالوجی کی مدد حاصل کرنا تعلیمی اداروں اور عام آدمی دونوں کے لیے مشکل ہے۔ ٹیکنالوجی کے مناسب استعمال کے لیے ماہر افراد کی بھی کمی ہے۔ کمپیوٹر ہو کہ پروجیکٹر سب کے چلانے کے لیے بجلی کی ضرورت ہے اور ہندوستان میں موسم گرما کے بعد سے کافی عرصے تک ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں دیہات میں برقی کٹوتی کی جا رہی ہے جس کی بنا پر وسائل رکھنے کے باوجود ٹیکنالوجی کا استعمال ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔ اگر کوئی جنریٹر استعمال کرتا ہے تو اس کے اخراجات اور بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ صحت کے اعتبار سے بھی ٹیکنالوجی کے نقصانات ہیں۔ مسلسل کمپیوٹر کے استعمال سے بینائی متاثر ہو رہی ہے۔ کمر کے درد کی عام شکایت ہے۔ بچے کھیل کود کے بجائے ویڈیو گیمس کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اور بچوں پر نظر نہ رکھی جائے تو وہ انٹرنیٹ اور فون کے ذریعے فحش ویب سائیٹ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے اپنے اخلاق اور صحت کو بگاڑ رہے ہیں۔ ایسے میں تعلیم کے میدان میں ٹیکنالوجی کا استعمال ایک بڑے طبقے کے لیے ایک خواب ہی ہے۔ ملک میں صرف دو تا دس فیصد طبقہ ہی ٹیکنالوجی کے ثمرات سے استفادہ کر رہا ہے۔ ابھی اس کے عام ہونے میں مناسب سرکاری پالیسی اور اس پر سنجیدگی سے عمل کی ضرورت ہے۔ حکومت نے تمام طلبا کو کم قیمت پر آکاش ٹیبلٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے لیے مرکزی وزیر کپل سبل نے اعلان بھی کیا اور اقدامات بھی لیکن ابھی آکاش ٹیبلٹ ملک کے عام طالب علم کی پہنچ سے دور ہی ہے۔ مجموعی طور پر تعلیم کے فروغ میں ٹیکنالوجی اہم رول ادا کر رہی ہے لیکن روایتی طریقہ تعلیم بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

□

DR MOHAMMED ASLAM FAROQUI, Head Dept of Urdu, Giriraj Govt College, Nizamabad - 503001(AP)

تبصرہ وتعارف

خط کی کہانی

مصنف: غلام حیدر
صفحات: 108، قیمت: 13 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: جاوید اختر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'خط کی کہانی' دراصل ایک آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہے جسے جناب غلام حیدر نے زبان دی ہے۔ مصنف نے بڑے اچھے انداز میں خط کی زبانی، خط کی کہانی لکھی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی سادہ اور سلیس گفتگو کی شکل میں خط کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بچوں کی اصلاح و پرورش کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ذہنی نشو و نما کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہے، لہٰذا پہلی سطر سے ہی بچوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مصنف نے عام فہم زبان اور الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے خط کی کہانی، خط کی زبانی بیان کرنے میں بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ 'خط کی کہانی' میں مصنف نے سادہ اور سلیس زبان میں خط کی اہمیت اور افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے کہ خط کی ترسیل کا نظام کن دشوار گزار راستوں سے گزر کر ہم تک پہنچا اور آج ہم گھر بیٹھے بیٹھے خط کے ذریعے دور دراز کی خبریں حاصل کر لیتے ہیں اور ڈاک کی مدد سے پارسل کے ذریعے اشیا اور منی آرڈر کے ذریعے پیسے اپنے عزیز و اقارب تک پہنچا دیتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے اس دور میں خبر رسانی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ برقی خط کے اس دور میں بھی ڈاک کا نظام اور خطوط کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ آج بھی ہمیں محکمۂ ڈاک کا سہارا کہیں نہ کہیں لینا پڑتا ہے۔ آج انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میل کے اس دور میں بھی ڈاکیہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

زیر نظر کتاب 'خط کی کہانی' کو مصنف جناب غلام حیدر نے کل چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے 'خط کی کہانی' کے عنوان سے گویا خط کی تاریخ اور ادوار کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر شروع ہوتا ہے باب اوّل 'پیغام سے خط تک' جس کے تحت میرا سفر، زبانی خط- پتھر، تانبے، موم اور لکڑی کے خط، کاغذ کے بزرگ کے عنوان سے خط کی زبانی ہی مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے تحت 'خط' اپنی زبانی اپنا کام خود بیان کرتا ہے ملاحظہ ہو:

''ہاں! تو میرا اصلی کام ہے سفر کرنا اور جلدی سے جلدی اس شخص کے پاس پہنچ جانا جس کے پاس مجھے بھیجا گیا ہے۔''

ہزاروں سال کے ادوار پر مشتمل اس 'خط' کو نہ جانے کتنے مراحل اور کتنے امتحانات سے گزرنا پڑا ہے۔ مصر کی تاریخ سے لے کر آج تک کا دور جوں جوں ترقی کرتا گیا ہے۔ خط نے بھی نت نئے ادوار دیکھے ہیں۔ دراصل اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی تکمیل میں خط یا پیام یا سندیشہ لفظ سامنے آیا۔ پرانے زمانوں میں کبوتروں سے لے کر پیام بروں کے ذریعے پیغام ارسال کیے جاتے تھے۔ وہ خطوط پتھر، تانبے، موم اور لکڑی وغیرہ کے ہوتے تھے۔ بعد ازاں مصر میں دریائے نیل کے کنارے ایک پودا جسے پیپائیرس (Papyrus) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے ذریعے کاغذ تیار ہوا۔ کاغذ یعنی انگریزی میں پیپر کی اصطلاح اسی (Papyrus) سے آئی ہے۔ دوسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ شاہی ڈاک سے لے کر نجی ڈاک کو ہرکارہ پہنچاتے آئے ہیں۔ 'کارا' لفظ سنسکرت کا ہے، جس کے معنی 'جاسوس' کے ہوتے ہیں۔ بعد میں 'ہر' لفظ جانے کیسے جڑ گیا۔ گو اب سے 80-70 سال پہلے تک آج کے ڈاکیے کو 'ہرکارہ' ہی کہا جاتا تھا۔

تیسرے باب میں خط کے ساتھ قاری گویا یوروپ کی سیر کرتے ہوئے، یونیورسٹی ڈاک، قصائی ڈاک، ڈاک کا بیوپار، ٹیکس اور پھر بادشاہوں کے دربار میں ہوتے ہوئے خط مہنگا ثابت ہوتا تھا۔

چوتھا باب سستے خط، عام آدمی کا خط اور میری سواریاں جیسے عنوانات پر مشتمل ایک معلوماتی ذخیرہ ہے تو وہیں پانچویں باب کے تحت پردادا کا خط، بہنگی خط، نئی ڈاک، خط کا ایک اور گن اور آزادی سے پہلے جیسے موضوعات پر تفصیلاً جانکاری دی گئی ہے۔

آخری یعنی چھٹے باب میں خط کے سلسلے میں مشکلیں اور علاج کا باب مختص کیا گیا ہے جس کے تحت احتیاط و تدابیر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سب سے اخیر میں 'ایک دلچسپ مشغلہ' کے تحت ٹکٹ جمع کرنے کا مشغلہ (جسے انگریزی میں Philantophy کہتے ہیں) پر ایک مختصر نوٹ بھی لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ٹکٹ جمع کرنے والے اپنے ذوق و شوق کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اب تو ہندوستان میں بھی ایک قومی میوزیم موجود ہے جہاں ہندستان کے ہر زمانے کے اور ہر قسم کے ٹکٹ موجود ہیں۔ ہندستان کے مختلف شہروں میں لوگوں کے جمع کیے ہوئے نادر و نایاب ٹکٹوں کی نمائشیں بھی ہوتی ہیں۔

خوبصورت ٹائٹل گیٹ اپ اور litho کاغذ پر شائع یہ کتاب محض 13 روپے کی ہے۔ امید ہے قاری کو پسند آئے گی اور خاص کر ڈاک کا اور اس کی خدمات کا صحیح تعارف پیش کرتے ہوئے ہمیں اس کی اہمیت و افادیت اور ضرورت سے باخبر کرے گی۔

بچے کی صحت

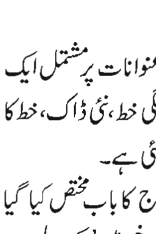

مصنف: ستیہ گپتا
صفحات: 97، قیمت: 39 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: صبا خانم، F 19/8 نفیس روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی زیر نگرانی اردو زبان میں محض ادبی مواد ہی شائع نہیں ہوتا بلکہ کونسل کی زیر نگرانی شائع ہونے والی کتابوں کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ کونسل ہر طرح کے موضوعات پر کتابیں شائع کرتی ہے، چاہے وہ ادبی ہوں، تاریخی، سماجی و سیاسی یا پھر ادب اطفال۔ ان تمام موضوعات پر کونسل بڑے اہتمام سے کتابیں شائع کرتی رہی ہے۔

زیر نظر کتاب 'بچے کی صحت آپ کے سوالات کے جوابات' نومولود بچوں کی ماؤں کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ستیہ گپتا کی یہ کتاب جس کا ترجمہ شمیم نکہت نے کیا ہے، 97 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ

کتاب پیش لفظ کے علاوہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔

موجودہ دور میں جہاں ہمارا سماجی نظام بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے وہیں اس تبدیلی کا اثر ہمارے خاندانی نظام پر بھی پڑا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام جو ہماری تہذیب کا ایک اہم جز تھا اب وہ بہت حد تک بکھر چکا ہے۔ ان حالات میں نئے شادی شدہ جوڑوں کو ماں باپ بننے کا موقعہ آتا ہے تو ان کے ذہن میں بہت سے ایسے سوالات ابھرتے ہیں جن کے صحیح جوابات دینے والا کوئی تجربہ کار انسان ان کے پاس موجود نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں ستیہ گپتا کی اس کتاب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے بچوں کے متعلق ماؤں کے ذہن میں آنے والے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ستیہ گپتا نے عورت کے حاملہ ہونے سے لے کر بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش میں آنے والی چھوٹی چھوٹی دشواریوں کے حل اچھے انداز میں بتائے ہیں۔

پہلے باب میں مثالی کنبے کی تعریف کے بعد دوسرے باب میں مصنفہ نے حمل سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں، کہ کس طرح نئی شادی شدہ عورت اپنے حاملہ ہونے کا یقین کرسکتی ہے اور کس طرح دوران حمل وہ اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی دیکھ بھال کرسکتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک معلوماتی باب ہے۔

دوسرا باب نومولود بچے کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے۔ جس طرح نوزائیدہ بچہ اس دنیا میں ایک نیا مہمان ہوتا ہے اسی طرح پہلی بار ماں بننے والی عورت بھی ماں کے منصب کے لیے نئی ہوتی ہے۔ اس کو اس بچے کی پیدائش اور اس کی دیکھ بھال کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا۔ ستیہ گپتا نے اس کتاب میں ایسی ماؤں کے لیے وہ تمام معلومات اکٹھا کر دی ہیں جن کو جاننے کی ضرورت ہر نئی ماں بننے والی عورت کو ہوتی ہے۔

آگے آنے والا باب بچوں کی دیکھ بھال کے متعلق ہے اس میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی بیماریوں اور پریشانیوں کے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بچوں کی مختلف بیماریوں، ان بیماریوں کی علامتیں اور ان کی دیکھ بھال ان سب کے متعلق مصنفہ نے اس باب میں ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر جب بچوں کو دستوں کی بیماری ہو جاتی ہے تو ایک ماں کو اس بات کا کس طرح اندازہ ہو کہ بچے کے جسم میں کس حد تک پانی کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس طرح کی بہت سی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے متعلق اس باب میں معلومات ملتی ہیں۔

بچوں کے ساتھ چھوٹی بڑی بیماریاں لگی رہتی ہیں۔ بچے بڑے ہوں یا شیر خوار دونوں کو ہی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو مختلف قسم کی بیماریوں سے کس طرح محفوظ رکھا جائے اور اگر بچہ بیمار ہو تو اس کی دیکھ بھال کس طرح کی جائے ان سب مسائل کا حل ستیہ گپتا نے 'بیماریوں سے تحفظ' کے باب میں دیا ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے بڑھتے ہوئے بچوں کے رویے میں آنے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ اس کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ گھریلو حادثوں سے نمٹنے کے طریقوں کو مصنفہ نے بڑے موثر انداز میں کتاب کے آخری باب میں بتایا ہے۔ اس کتاب کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ اس کتاب میں نوزائیدہ بچوں کے مسائل سے لے کر 5-4 سال کی عمر تک کے بچوں کے مسائل اور ان کی نفسیات سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں دوران حمل اور پیدائش کے بعد بچوں کو لگنے والے ٹیکوں کا چارٹ دیا گیا ہے جس سے کہ والدین کو یہ جاننے میں آسانی ہو کہ ان کو کون سا ٹیکہ کب لگوانا ہے ساتھ میں بچوں کی عمر کے مطابق وزن کا چارٹ بھی موجود ہے۔ مجموعی طور پر ستیہ گپتا کی یہ کتاب معلوماتی اور مفید ہے۔ پہلی بار ماں بننے والی عورتوں کے لیے یہ کتاب ایک کار آمد تحفہ ہے۔

کلیم الدین احمد شخصیت اور تنقید نگاری

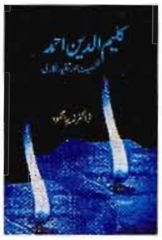

مصنفہ: ڈاکٹر زیبا محمود
صفحات: 200 قیمت 250 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: محمد مقیم خان، ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر تبصرہ کتاب پر ڈاکٹر زیبا محمود کو پی ایچ ڈی کی ڈگری گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور سے 1996 میں تفویض ہوئی۔ اس وقت محترمہ ڈاکٹر زیبا محمود G.S.P.G کالج سلطانپور میں شعبۂ اردو کی ہیڈ اور ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی ہیں۔

کتاب 'کلیم الدین احمد شخصیت اور تنقید نگاری' کا انتساب مصنفہ نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ کتاب میں حاصل کلام اور کتابیات کو ملا کر کل آٹھ ابواب ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کا حرفِ آغاز خود مصنفہ نے لکھا ہے۔ اس کے بعد زیبا محمود کے والد پروفیسر محمود الٰہی نے 'کلیم الدین احمد کی تنقید-ایک نظر' کے نام سے لکھا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور کے شعبۂ اردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی اپنے اس مختصر مضمون میں لکھتے ہیں کہ کلیم الدین احمد کا طرز تحریر استدلالی نہیں لیکن اس کے باوجود ان کی تنقید یں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔ کتاب کا 'پیش لفظ' پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے۔ شارب ردولوی نے کلیم الدین احمد کی سخت گیری سے اردو ادب کو ہونے والے فائدے اور نقصان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زیبا محمود کو ایک مشکل موضوع کے انتخاب پر مبارک باد پیش کی ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے کتاب کا تعارف پیش کیا ہے۔

پہلا باب 'کلیم الدین احمد کی زندگی کے اہم گوشے' ہے۔ اس میں ان کی سوانح 'اپنی تلاش میں' سے کلیم صاحب کی زندگی کے دلچسپ مگر بہت اہم پہلوؤں کو مصنفہ نے ابھارا ہے۔

دوسرا باب 'اردو میں تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ اور اردو تنقید میں مغربی اثرات کی نشاندہی' ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے مختلف نقادوں کے اقتباسات کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اردو ادب میں تنقید نگاری کا رجحان بڑھتا گیا اور پھر کس طرح مغرب سے استفادے کی صورت پیدا ہوئی۔ اس باب میں ڈاکٹر زیبا محمود نے مختلف نقادوں کے اقتباس درج کر کے بحث ومباحثے کا جو ماحول بنایا ہے اس سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔ وہ ایسے نقادوں کا مطالعہ کرتا ہے جو تنقید میں مغربی اثرات کے لیے معتدل رویہ اپنانا چاہتے تھے اور کچھ اس کے انتہائی طور پر حامی تھے اور تو اور انھوں نے اردو تنقید میں مغربی اصول وقواعد مقرر کر رکھے تھے، اور اردو ادب کی تخلیقات کو انھیں اصولوں پر پرکھنا چاہتے تھے۔ کلیم الدین احمد چونکہ مغرب سے اس استفادے کو اور وسیع کرنا چاہتے تھے لہٰذا ان کے اندر غضب کا جذبہ انقلاب تھا۔

کتاب کا تیسرا باب 'کلیم الدین احمد کا تنقیدی شعور' ہے۔ ان کے تنقیدی رویے کی نشاندہی اور 'اردو تنقید پر ایک نظر' کا تنقیدی جائزہ' ڈاکٹر زیبا محمود نے کلیم الدین احمد کی کتاب سے اقتباسات نقل کر کے اس پر دوسرے نقادوں کے اقتباس لکھ کر کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور اور رویے کو اجاگر کیا ہے کہ کس طرح کلیم الدین احمد نے تمام نقادوں کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکا ہے۔

اگلے باب 'اردو شاعری پر ایک نظر'' کا تنقیدی جائزہ'' میں ڈاکٹر زیبا محمود نے کلیم الدین احمد کی کتاب میں شاعری کی تمام اصناف پر کیے گئے مباحثے کی وضاحت کے لیے متعدد اقتباسات درج کیے ہیں۔ زیبا محمود نے بڑی کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ کلیم الدین احمد غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ سے نالاں نہیں تھے بلکہ اپنے

مقرر کردہ اصولوں کی میزان پر ان اصناف میں در آنے والی کمیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

''کلیم الدین احمد کی تحقیقی کاوشوں اور ان کی نثر نگاری کی خصوصیات'' کے تحت مصنفہ نے کلیم الدین احمد کے اس اہم خیال کو ابھارا ہے کہ تنقید اور تحقیق میں کس قدر گہرا رشتہ ہے۔ کلیم صاحب نے بہت سے تذکرے مرتب کیے اور بہت سے شعرا کے خطی نسخوں کو دریافت کیا۔ مثلاً بینی نرائن جہاں کا تذکرہ 'دیوان جہاں' اس کے علاوہ 'گلزار ابراہیم' اور 'تذکرہ شورش' بھی ان کے مرتب کردہ اہم تذکرے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے واجد علی شاہ کی 'تاریخ نور' کی بھی تدوین کی۔ جس سے تحقیق اور تنقید کے مابین کلیم صاحب کی عمل آوری کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر زیبا محمود نے اس اہم بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کلیم الدین احمد نے خود بھی روایتی شاعری کی اور ان کے تذکروں کی تحقیق اور تدوین سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں غزلوں اور اردو شعرا سے نفرت نہیں تھی بلکہ وہ صرف ان کی خامیوں کو جتانا چاہتے تھے انھیں مٹانے کے خواہش مند تھے۔

چھٹے باب میں 'کلیم الدین احمد کا شاعرانہ مرتبہ' متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کلیم الدین احمد کے دو شعری مجموعے '42 نظمیں' اور '25 نظمیں' بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ انھوں نے دو بیاضیں 'کشکول' اور 'سبد گلچیں' کے نام سے درست کی تھیں۔ جن کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین صاحب نے جو نکتہ چینی دوسرے شعرا پر کی تھی اس میں اور ان کی شاعری میں بڑا تضاد پایا گیا ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر زیبا محمود نے نقادوں کے ایسے اقتباسات درج کیے ہیں جو کلیم الدین احمد کو مجموعی طور پر اردو کے ممتاز شاعروں کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔

حاصل کلام پر کتاب اختتام پذیر ہوتی ہے۔ حاصل کلام کے تحت زیبا محمود نے کلیم الدین احمد کو بے باک اور ستائش کی تمنا سے عاری اور صلے کی پرواہ نہ کرنے والا نقاد بتا کر اپنے قارئین کو ان کے بصیرت افروز ذہن کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ڈاکٹر زیبا محمود تحسین و تبریک کی مستحق ہیں جنھوں نے اتنے پیچیدہ اور سمجھ میں نہ آنے والے نقاد پر قلم اٹھایا۔ کلیم الدین احمد کی شخصیت اور تنقید کے حوالے سے زیبا محمود کی تحریر معتدل اور غیر جانب دار ہے۔

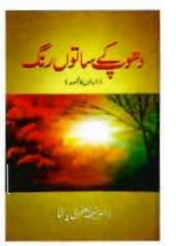

دھوپ کے ساتوں رنگ

مصنفہ: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
صفحات: 260، قیمت: 250 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر شاہد اختر انصاری

اردو افسانہ نگاری نئے تقاضوں کی تکمیل کر رہی ہے اور افسانہ نگاروں کا کارواں مسلسل رواں دواں ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی اور ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے سفر افسانہ نگاری کی روداد ہے۔ نعیمہ جعفری اردو کی معروف شخصیات میں سے ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ 'آٹھ راتیں سات کہانیاں' اور 'یادرفتگاں' ان کی انعام یافتہ تصنیفات ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کافی پہلے منظر عام پر آچکا ہے۔ 'دھوپ کے ساتوں رنگ' ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جس میں کل 39 افسانے شامل ہیں جن میں سے 12 افسانے مصنفہ کے پہلے افسانوی مجموعے میں بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ دراصل افسانوں اور افسانچوں کا مجموعہ چند ایک کہانیاں قدرے طویل معلوم ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں پر منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر کے ہلکے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ 'چوتھی کا ایک اور جوڑا' عصمت چغتائی کی کہانی 'چوتھی کا جوڑا' کی توسیع ہے۔ اس کڑی کو کہانی کار نے بڑے سلیقے سے جوڑا ہے۔ زبان و بیان اور وحدت تاثر کے لحاظ سے مصنفہ عصمت کے بہت قریب آگئی ہیں۔ اسی طرح 'ٹھیکرے کی مانگ' تہذیب، زبان اور کہانی پن کی عمدہ مثال ہے۔ کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نعیمہ جعفری کے قلم کے نب نے قرۃ العین حیدر کی روشنائی چکھ لی ہے۔ مصنفہ الفاظ کے معاملے میں کفایت شعار ہیں۔ منظر نگاری کے لیے وہ بہت مختصر و منتخب الفاظ و جملے کا استعمال کرتی ہیں۔

نعیمہ جعفری ایک خاتون ہونے کے ناتے خواتین کے مسائل کو بہتر سمجھتی ہیں۔ چنانچہ جب وہ گھریلو کہانیاں لکھتی ہیں تو ان کا قلم اپنی تمام صلاحیتوں کو انڈیل دیتا ہے۔ ان کے افسانچوں میں طنز کی لہریں بھی سر ابھارتی ہیں۔ عزت دار، دوسرا کنس، شیشے کی دیوار اور سرکٹی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ سماج کا تضاد دکھاتی ہیں۔ انا ہزارے جیسی تحریکوں میں شامل راونوں کے اصلی چہرے بھی دکھانے کی کوشش کرتی ہیں اور سوال بھی اٹھاتی ہیں۔ وہ بابل کے آنگن کے چھوٹنے کا درد بھی بیان کرتی ہیں اور ٹوٹتی بکھرتی ہندوستانی تہذیب اور نئی نسل کی پرانی نسل سے بغاوت کی داستان بھی بیان کرتی ہیں۔ ان کے مجموعے میں گھریلو کہانیاں بھی ہیں اور عصری دفتروں کی کہانیاں بھی ہیں۔ انھوں نے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی کریدنے کی کوشش کی ہے۔ 'ضمیر کا صلیب' اور 'احساس کا مجرم' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ ثانی الذکر خاص طور سے نفسیاتی مریض کی کہانی ہے۔ اس میں مرض اور اس کے وجوہات پر غور کیا گیا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ مسلم خاندان کی کہانی ہے۔

وہ بسا اوقات بہت اچھی کہانی کہنے کے قریب آجاتی ہیں۔ انھیں کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اکثر وہ چونکا بھی دیتی ہیں۔ زبان سلیس اور رواں دواں ہے۔ تصنع سے پاک، انگریزی اور ہندی الفاظ کا مناسب استعمال بھی کرتی ہیں کہانیوں میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال خوب ہوا ہے۔ زیادہ تر کہانیاں ضمیر متکلم کے فارم میں ہیں۔ ساتھ ہی خطوط کا فارم بھی استعمال کیا گیا ہے۔

نعیمہ جعفری کی کہانیوں کے کردار زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ لیکن وہ کسی ہندو کی کہانی لکھتی ہیں تو ان کے قلم کا جوہر مزید کھلتا ہے۔ 'تحلیل' ایسی ہی ایک عمدہ کہانی ہے جو اونچی ذات کے مسائل سے گفتگو کرتی ہے۔ ملک میں تعلیمی اداروں میں ریزرویشن اور نمبروں کی مارا ماری سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں جعفری نے بہت خوبصورتی سے انھیں پیش کیا ہے۔ اس میں کہانی پن بھی ہے اور زبان پر مصنفہ کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت مجموعے کا نام 'دھوپ کے ساتوں رنگ' کسی افسانے کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کے اس تنوع کی طرف اشارہ ہے جو ان کی کہانیوں کے بین السطور میں موجود ہے۔ کتاب کی طباعت اور بائنڈنگ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور خوبصورت رنگوں کا استعمال ہوا ہے۔ کمپوزنگ کی چند معمولی غلطیاں ہیں جو اکثر ہوجایا کرتی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ کتاب اہل علم تک پہنچے گی اور مقبول ہوگی۔

پس نوشت

مصنف و ناشر: ڈاکٹر اشفاق انجم
ضخامت: 152، قیمت: 150 روپے
مطبع: الہدیٰ آفسیٹ پریس مالیگاؤں
مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی A-128، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

'پس نوشت' ڈاکٹر اشفاق انجم کی تنقیدی تصنیف ہے۔ انھوں نے پس نوشت میں شعر کے معانی و مفاہیم کے ساتھ ان کے عیوب و محاسن، زبان و بیان دیگر ضروری امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کا انداز استدلال عقلی و نقلی دونوں جامع ہے۔ ان کا قلم

رواں، شائستہ اورمہذب ہے۔ ان کے ہاں زبان وبیان کا حسن اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے تمام ادبی امور کو صاف واشگاف اور واضح الفاظ میں پیش کیا ہے اور اپنے اسلوب کو خشک نہیں ہونے دیا۔ ان کی یہ کاوش فکر بلند کے ساتھ صحت فکر پر بھی دال ہے۔

زیرتبصرہ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب کتاب ڈاکٹر اشفاق انجم کی کاوش 'پس نوشت' لائق تعریف ہی نہیں بلکہ لائق مطالعہ ہے۔ انھوں نے جس انداز میں تنقید کی ہے اس سے اندازہ لگتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت ہی وسیع وعمیق ہے۔ انھوں نے ادب میں خطا وصواب ،صحت ولغزش، اور دیگر خامیوں کے درمیان جو خط امتیاز کھینچا ہے اس میں ان کا قلم اپنے مقصد سے ہٹنے نہیں پایا ہے۔ شعر میں غلطی کہاں ہے اس کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک تجربہ کار نقاد، ادیب اور ماہر مہندس کی طرح یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس میں محکمی کی مقدار کس درجہ کی ہے۔ مثلاً 'مسدس شاہراہِ دعوت' جوکہ صلاح الدین مقبول احمد مصلح نوشہروی کی کاوش ہے، بلاشبہ صلاح الدین صاحب کا یہ ایک گراں مایہ کارنامہ ہے، لیکن اس پر صاحب 'پس نوشت' نے لکھا ہے کہ اس میں زبان وبیان اورفنی اعتبار سے بہت سارے عیوب ہیں۔ یہ موصوف کی نیت پر منحصر کرتا ہے کہ یہ تنقید برائے تنقید ہے یا اصلاح۔ ڈاکٹر اشفاق انجم کی اس کتاب کا موضوع ہی تنقید ہے۔ انھوں نے کشودمعانی اورتشریح حقائق کے سلسلے میں بصیرت ودانش کی ضیاافروزیوں اور غور وتشخص کی صلاحیتوں سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔

کتابوں پر رائے زنی اور تبصرہ کرتے وقت اپنے علم وعقل کے مطابق صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط، خوبی کو خوبی اور عیب کو عیب ہی لکھنا چاہیے، زیرنظر کتاب میں صاحب کتاب نے بھی اس اصول کو اپنایا ہے۔ اس سے ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچے، لیکن اگر ڈاکٹر اشفاق انجم کی تنقید سے کسی کی اصلاح ہوجاتی ہے تو یہ اصلاح دیگر لوگوں کے لیے بھی رہنمائی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اس کے علاوہ 'آنسو: مولانا اسلم ملک مدنی' پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب پس نوشت نے لکھا ہے کہ مجموعہ آنسو کو پڑھ کر آنسو آگئے، کیونکہ اس میں بے شمار عیوب واغلاط ہیں۔

نذرغالب: رئیس احمد قلیل دھولیوی کی تخلیق پر ڈاکٹر اشفاق انجم نے لکھا ہے کہ رئیس احمد قلیل کی تخلیق 'نذرغالب' یقیناً لائق تحسین ہے، اس میں انھوں نے غالب کی تمام زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ یہ کتاب غالبیات میں ایک نادر اضافہ ہے لیکن صاحب کی عجلت پسندی کہیں یاپھر وقت کی کمی، انھوں نے اس پر نظرثانی نہیں کی، جس کی وجہ سے چند خامیاں رہ گئی ہیں۔

پس نوشت کے صفحہ 75 میں 'نقرئی کنگن بول اٹھے' پر ڈاکٹر اشفاق انجم نے لکھا ہے کہ اس کی ہر غزل چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ ہمیں بڑی بے دردی سے تختہ مشق بنایا گیا ہے۔ ان کی لفظیات وتراکیب سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ''دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو''۔ واقعی قلمکار کے لیے ضروری ہے کہ جس فن پر وہ خامہ فرسائی کرنے جارہے ہیں اس پر گہرا مطالعہ ہو اور اس کے فنی رموز واسرار واقف ہو۔ بصورت دیگر وہ فن اپنے وجود پر آنسو بہانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ صاحب پس نوشت نے مصنفہ عائشہ سمن کو اچھی چیزوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر اشفاق انجم کی کاوش 'پس نوشت' سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ فن کوئی بھی ہو اپنے لیے محنت وریاضت اور خودسپردگی کا متقاضی ہوتا ہے۔ کسی فن کو سیکھنے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے حدود وقیود، نشیب وفراز، اوزار وآلات سے مکمل طور پر آگاہی ہو۔ کسی بھی فن پارے پر تبصرہ یا تنقید کرنے سے پہلے ہم کو کسی دیگر اختلافات سے بالاتر ہوکر سوچنا چاہیے اور کسی کی غلطی پر تبصرہ یا تنقید کا مقصد اعلائے حق ہونا چاہیے نہ کہ اعلائے نفس۔ حالانکہ صاحب کتاب نے اس کی پوری کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق انجم کی تنقید اچھی لگی، کیونکہ وہ اپنی اس تنقید میں مبنی برحق ہونے پر مستحکم دلائل رکھتے ہیں۔ میرے خیال سے ایسے شخص روشن دماغ اور فکر ودانش کے قافلے کو آگے بڑھانے کے حقدار ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ ادبی دنیا میں پس نوشت کو بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا اور اسے اس کا جائز حق ملے گا۔ اگر اس کاوش کو ادب پسندوں کے لیے بانگ جرس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ امید کی جاتی ہے کہ موصوف کا یہ طرز، تنقید کے شعبہ میں ایک نئے اسلوب کے آغاز کے ساتھ ساتھ نئے اسلوب کا ایک نیاباب بھی قائم کرے گا۔

سائبر دنیا میں اردو

مصنف: مظہر حسنین

صفحات: 377، قیمت: 300 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: نظام الدین احمد، 12 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

انسانی زندگی میں ترسیل وابلاغ کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی کے سبب ہمارا سماجی ڈھانچہ قائم ہے۔ جدید معاشرے میں اس نے ہماری زندگی کو ہر چہار جانب سے اس طرح گھیر لیا ہے کہ انسان تقریباً اسی میں قید ہوکر رہ گیا ہے۔ کمپیوٹر کا ابتدائی دور 1945 کے آس پاس مانا جاتا ہے۔ لیکن یہ کمپیوٹر کا تجرباتی دور رہا ہے۔ اس حوالے سے بیسویں صدی کا نصف آخر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں کمپیوٹر نے انسانی زندگی کے ہر شعبے تعلیم، طب وصحت، انجینئرنگ، تجارت، تفریح، موسیقی، رقص، ذرائع ابلاغ، جنگ یا دیگر میدان میں اپنی معنویت اور اہمیت کا احساس دلایا۔ کمپیوٹر کے بعد انٹرنیٹ نے لوگوں کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا۔ کمپیوٹر نے جہاں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اپنی معنویت واہمیت کا احساس دلایا وہیں انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے انقلابی دور میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کی روشنی ہر چہار جانب بکھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس نے ہماری سماجی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی وثقافتی زندگی کو پورے طور پر متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ کلچر کو 'میڈیا کلچر' کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ اور گوشہ نہیں جوان ترسیلی ذرائع کی دسترس سے باہر ہو۔ موجودہ دور میں ان ذرائع ترسیل سے منقطع ہوکر زندگی کرنا تقریباً ناممکن سا نظر آنے لگا ہے۔ ہر سطح پر ان کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان سے الگ ہوکر ہماری سماجی زندگی مفلوج ہوکر رہ جائے گی۔ باوجود اس کے اردو میں اس تعلق سے غور وفکر کا انداز بہت مثبت نہیں ہے۔ بالخصوص اردو کے حوالے سے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی کیا اہمیت ہے؟ ان ترسیلی ذرائع سے اردو کا فروغ ہورہا ہے؟ یا پھر اردو ان ذرائع کا ساتھ کس حد تک دے پارہی ہے؟

زیرتبصرہ کتاب 'سائبر دنیا میں اردو' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان 'کمپیوٹر اور اردو' ہے جو تین ذیلی عناوین پر مشتمل ہیں۔ اس باب میں کمپیوٹر کی تعریف، تاریخ اور اس کے ارتقائی سفر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں کمپیوٹر کی مختلف نسلوں وادوار پر الگ الگ گفتگو کی گئی ہے۔ پھر سائز کے لحاظ سے کمپیوٹر کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کا الگ الگ تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ گویا کمپیوٹر کے حوالے سے تقریباً تمام چیزیں اس میں سمیٹ لی گئی ہیں۔ ساتھ ہی کمپیوٹر میں اردو کے استعمال پر بھی خاصی طویل گفتگو کی گئی ہے۔ اردو کے مختلف سافٹ ویئر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کمپیوٹر کے وجود میں آنے کے بعد خصوصاً اردو کے لیے تیار کیے گئے کمپیوٹر میں اردو کے استعمال میں جو دشواریاں درپیش ہیں اس کے تدارک کی بھی کوششیں چل رہی ہیں۔ اس حوالے سے کافی تفصیلی بحث اس باب

میں موجود ہے۔ باب دوم 'انٹرنیٹ اور اردو' ہے، جس میں دو ذیلی عناوین ہیں۔ اس کے تحت انٹرنیٹ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کے دیگر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی اردو کے حوالے سے انٹرنیٹ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انٹرنیٹ پر اردو کس شکل میں موجود ہے اور اس کا کیا مقام ہے، ان سب باتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم 'اردو کی سائبر دنیا' ہے اس میں اردو کی مختلف ویب سائٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ادبی ویب سائٹ اور اخباری ویب سائٹ پر الگ الگ گفتگو کی گئی ہے۔ باب چہارم 'سائبر اسپیس اور اردو' ہے۔ یہ باب بھی تین ذیلی عناوین پر مشتمل ہے۔ اس میں دوسری زبانوں سے اردو کے موازنہ کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر و انٹرنیٹ کے لیے اردو کی اہم سہولیات و حصولیابی پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اصطلاحات کو بہ طور فرہنگ شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب میں کمپیوٹر و انٹرنیٹ سے وابستہ پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ آ گیا ہے۔

اردو کے حوالے سے بہت سارے کام ہوئے ہیں لیکن ٹکنالوجی اور خصوصاً اطلاعاتی ٹکنالوجی کے حوالے سے خاطر خواہ کامیابی نظر نہیں آتی ہے۔ پھر بھی انٹرنیٹ پر موجود اردو کے مواد کو دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کو کس قدر ٹکنالوجی کے تقاضوں کے مطابق لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کمپیوٹر و انٹرنیٹ سے متعلق کچھ نہ کچھ مضامین اخبارات و رسائل میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی اس پر کوئی باضابطہ کام نہیں ہوا۔ مگر یہ کتاب اس کمی کو ایک حد تک پوری کرتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو سمجھنے کے لیے بہتر ثابت ہوگی۔

عصمت چغتائی اور جین آسٹین

مصنف: محبوب حسن
صفحات: 221، قیمت: دو سو روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر مولا بخش، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی

نوجوان اسکالر محبوب حسن کی کتاب 'عصمت چغتائی اور جین آسٹین' ('ٹیڑھی لکیر' اور 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' کے آئینے میں) اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ فی زمانہ نئی نسل کی ایک ایسی کھیپ سامنے آگئی ہے جو ادب کا مطالعہ سنجیدگی سے پیش کرنے میں رواں دواں ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ اب صرف انگریزی کے چند نقاد یا تخلیق کاروں کا فقط نام لے کر یا کچھ جملے بغیر حوالہ دیے اپنی کتاب یا مضمون میں رعب انگریزی دانی کے مظاہرے کا زمانہ لد گیا ہے کیونکہ محبوب حسن جیسے نوجوان اسکالروں اور ایسے ہی دوسرے نوجوانوں نے راست طور پر اردو اور انگریزی کے متون کا تقابلی مطالعہ پیش کرنے میں اپنی ذہانت اور شوق مطالعہ کا ثبوت فراہم کرنے کی ایک طرح ڈال دی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب محبوب حسن کے ایم فل کا مقالہ ہے اور محبوب حسن نے ہنوز تقسیم ہند پر مبنی اردو اور انگریزی ناولوں کے مطالعے کو اپنی پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا ہے۔ اس کتاب کا باب اول 'سوانحی کوائف اور شخصیت کی تشکیل' باب دوم 'ٹیڑھی لکیر اور پرائیڈ اینڈ پریجوڈس کا موضوعاتی مطالعہ' باب سوم 'ٹیڑھی لکیر اور پرائیڈ اینڈ پریجوڈس کا فنی مطالعہ' باب چہارم 'ماحصل' کے جملہ مباحث میں انھوں نے تقابلی تنقید اور ادب کے اصول و ضوابط سے آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی کہ کس نوع کے دو متون کا ہی تقابل مستحسن قرار پاتا ہے۔ مثلاً محبوب حسن کی یہ رائے ملاحظہ فرمائیں:

''تقابلی مطالعے کے لیے دو چیزوں میں مکمل یکسانیت کا ہونا شرط نہیں۔ بلکہ ان کے درمیان پائے جانے والے چند افتراقات بھی قابل غور ہوتے ہیں۔ ان میں صرف یکسانیت کو تلاش کرنا تقابلی مطالعے کی معنویت کو کم کرتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان دو چیزوں میں ملنے والی یکسانیت کے پہلو کا مضبوط ہونا بنیادی شرط ہے۔''

محبوب حسن نے دونوں ناول نگاروں کی سوانح، شخصیت نیز دونوں کے ناولوں کا موضوع، دونوں ناولوں میں موجود پلاٹ، کردار، مکالمے اور اسلوب کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں اور افتراقات کے پہلوؤں کو نشان زد کرنے کی اپنی سی سعی کی ہے۔ اور حتی المقدور تعین قدر کی مثالیں بھی فراہم کی ہیں جو ادبی تنقید کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً 'ٹیڑھی لکیر' کے مقابلے آسٹین کے ناول کے کینوس کو چھوٹا قرار دیا ہے۔'' (ص: 211) 'ٹیڑھی لکیر' متوسط طبقے کا پورا معاشرہ سامنے لاتا ہے جبکہ 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' صرف چار گھروں کی کہانی پر مبنی ہے۔ لیکن دونوں ناولوں کے مرکزی کردار شمن اور ایلیزابیتھ کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں مثلاً دونوں کی نفسیات کی نوعیت پر بھی محبوب حسن نے روشنی ڈالی ہے نیز اسے ناول کی کس قسم کے ذیل میں رکھا جائے، اس پر ایک مبحث قائم کیا ہے۔ جیسا کہ محبوب حسن نے اسے ڈومیسٹک ناول قرار دیا ہے اور انگریزی میں اس نوع کے ناولوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے نیز محبوب حسن نے دوسرے نقادوں کی طرح اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آسٹین نے جو کہ انگلینڈ کے پرآشوب دور سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کے ناول پر اس کا کوئی اثر قاری محسوس نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ عصمت چغتائی نے بھی بے باکانہ طور پر اپنے عہد کے ادبی فیشن یعنی ترقی پسند تحریک کی لیک سے انحراف کرتے ہوئے اپنے ناول کو عورت کے وجود اور اس کی نفسیات کی گرہ کشائی کا مرکز کیونکر بنا دیا ہے۔

محبوب حسن نے حتی المقدور صاف ستھری زبان کا استعمال کیا ہے۔ یہ ان کی پہلی کاوش ہے لہٰذا ان سے یہ توقع کرنا کہ دونوں ناولوں کے بیانیہ کی جہتیں کیا ہیں؟ یا یہ کہ آج کی تانیثی تنقید کے حوالے سے دونوں ناولوں کا مطالعہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ یعنی کیوں عصمت نے Sexuality and Textuality پر حد درجہ زور دیا ہے اور آسٹین نے اس مسئلے کو کسی حد تک نظر انداز کیا ہے اور اس کے باوجود انگریزی کے جدید نقادوں نے کیونکر اس ناول کو تانیثی ادب کے پہلے دور سے جوڑ کر دیکھا ہے، یا اس ناول کے دوسرے دبے ہوئے معنی کو عصر حاضر کے انگریزی نقاد ابھار رہے ہیں، ضرورت سے زیادہ تقاضے کی مثال ہوگی۔ محبوب حسن نے اپنی بساط بھر پھر بھی دونوں ناولوں کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور ایسا کرتے ہوئے محبوب حسن نے کہیں کہیں ایک ہی امر کی تکرار کی ہے جو قاری کو کھٹکتی ہے۔

بہر کیف دونوں ناولوں کے عنوانات اور اس کے متن سے اس کے رشتے پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی تھی۔ مثلاً 'ٹیڑھی لکیر' کیونکر ایک اساطیری کوڈ ہے کہ عورت بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور اسی طرح 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس' کیونکر آسٹین کے مختلف کرداروں کی حرکات و سکنات اور نفسیات میں دخیل ہے۔ جیسا کہ ڈارسی پرائیڈ کا اور ایلیزابیتھ کیونکر پریجوڈس کا نشان ہے۔ ان چند معروضات سے قطع نظر محبوب حسن کی یہ کتاب اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے لیے اردو قارئین کے حافظے میں مضبوطی سے اپنی جگہ بنا لے گی۔

خالد سہیل : فن اور فن کار

مصنفہ: شبانہ خاتون
صفحات: 168، قیمت: 85 روپے
ناشر: حلقہ ادب و ثقافت، شیخ داموں پورہ، مئوناتھ بھنجن، یو پی
مبصر: خلیق الزماں نصرت، فلیٹ نمبر 15، سائی نگر کالونی، بھیونڈی

اردو میں تحقیق کا معیار گرتا جا رہا ہے جب کہ مغرب کی زبانوں، خاص کر انگریزی

ادب اور اس کی تحقیق روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اسے روزانہ کی زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی تحقیق کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اردو ادب کے بڑے بڑے محقق نے تو حد کردی ہے ،وہ لکھ رہے ہیں۔ غالب مرادآباد میں، اکبر لندن میں اور اس طرح کی کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ کہیں لوگ یہ بھی نہ لکھ دیں کہ'' غالب ساتویں عرش پر''۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اردو زبان کے محقق کو فلاسفر نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کے پاس ایک ڈگری فلاسفی کی ہوتی ہے جو اس مصرعہ کی مصداق....

'دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے'

میں مذکورہ بالا عنوانات کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ ایسے مضامین سے اردو والوں کو کیا ملتا ہے؟ کیا یہ اردو میں اضافہ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ 5 ورق کے مضمون کو 500 صفحات بنانا فضول ہے۔ اسے اردو کے میدان میں بھاگ دوڑ کہا جاتا ہے، یہ کوئی اہم کام نہیں۔ خیر ان باتوں کے بعد'' خالد سہیل ...فن اور فن کار'' محقق شبانہ خاتون کی ورق گردانی کے نتیجے سے آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں۔

کتاب کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ خالد سہیل صاحب جو ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹری کی سند لینے کے بعد پشاور کے لیڈی ریڈنگ اسپتال میں سروس کی۔ محترمہ شبانہ کے لیے یہ تعجب کی بات ہے کہ ایک لیڈی ہاسپٹل میں خالد سہیل نے کام کیا لیکن اس زمانے میں جب خالد صاحب نے ڈاکٹری کی تھی اکثر عورتوں کی بیماریوں کے ڈاکٹر مرد ہی ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ہمارے آس پاس میں کئی ڈاکٹر ہیں جو بوڑھے ہوچکے ہیں، وہ عورتوں کی بیماریوں کا اچھا علاج کرتے ہیں۔ ہاں وہ DGO نہیں ہوتے۔ خالد صاحب ایران منتقل ہوگئے۔ وہاں انھوں نے نفسیات کی تعلیم حاصل کرکے اس کے ماہر ہوئے۔ ہاں اس واقعہ سے جو انھوں نے اپنے مضمون کو آگے بڑھایا ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ خالد صاحب نے اپنے افسانے میں نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ خاص کر عورتوں کی نفسیات کا انھیں گہرا مطالعہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالد صاحب کے افسانے کو موثر بنانے میں ان کا یہ تجربہ کافی کام آیا ہے۔ شبانہ خاتون لکھتی ہیں کہ نفسیاتی مطالعے کے لیے ان کے گھر سے ان کو بڑی مدد ملی ہے۔ ان کے والد اور والدہ نفسیاتی مریض تھے۔ یہ وجہ سب سے بڑی ہے۔ جس طرح 1999 میں میں نے پروین شاکر کا ایک بھرپور نفسیاتی جائزہ ''پروین شاکر کی غزلوں میں مردوں کی بے وفائی'' لیا تھا جو ہندوستان اور پاکستان میں بڑا مقبول ہوا۔ میری بیوی کی نفسیاتی بیماری کی وجہ سے میں اس موضوع پر بہت اچھا لکھ سکا۔

شبانہ خاتون نے خالد سہیل کی اس خوبی کو ان کے افسانے میں جگہ جگہ دیکھا ہے۔ ایک جگہ اپنے مخلصانہ نظریے کو اس طرح ظاہر کرتی ہیں........'' جب تک تحت الشعور میں پنپنے والے جذبات و احساسات کی شناخت نہ کی جائے گی۔ افسانوں کے ظاہری اعمال اور ردعمل کو کماحقہ سمجھا نہیں جاسکے گا۔''

بے شک فن کار صرف فوٹو گرافر نہیں ہوتا جو دیکھا لکھ دیا یا کسی رپورٹر کو صحافی نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک وہ کسی واقعہ کا تجزیہ نہیں کرتا ہے۔ فن کار کو نتیجہ اخذ کرنا چاہیے، حادثے کی گہرائی تک پہنچنا چاہیے۔ شبانہ خاتون کے درج بالا جملوں کے علاوہ بھی ان کی تحریر بڑی جاذب ہے اور ادبی بھی ہے۔ اس عمر میں طرز تحریر دلکش ہے تو ہماری عمر تک آتے آتے تو ان کی تحریر مشہور ہوجائے گی۔ ہاں خالد سہیل کے افسانے اور ان کی زندگی پر لکھتے وقت میں نے ہر جگہ دیکھا ہے کہ ان کا تنقیدی رویہ کافی نرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خالد سہیل صاحب سے مرعوب ہوگئی ہیں۔ انھیں ان کا material بہ آسانی مل گیا ہوگا اور پھر زندہ لوگوں پر لکھنے میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں قابل مطالعہ کئی عنوانات ہیں۔ سوانح عمری جس دلچسپی سے لکھی گئی ہے وہ میری دلچسپی کا خاص حصہ بن گیا ہے۔ ہمارے علاوہ بھی ہندوستان کے اردو نواز حلقے میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی کیونکہ ہمیں ہندوستانی افسانہ نگار کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات رہتی ہے مگر پاکستانی افسانہ نگاروں کی معلومات نہیں کے برابر ہوتی ہے اور خالد سہیل کی جگہ تو اس سے بھی الگ ہے۔ یہ کتاب افسانے کی تنقید نگاری کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

ماھنامہ ضیاءِ وجیہ

ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی

جلد 24، شمارہ 4، اپریل 2013

ضخامت: 64، قیمت: 25 روپے

ناشر: اندرون مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، بازار مسٹن گنج، رام پور

مبصر: ادارہ

ماہنامہ 'ضیاء وجیہ' رامپور سے گزشتہ 23 برسوں سے ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی کی ادارت میں شائع ہوتا آرہا ہے۔ یہ رسالہ اپنے منفرد انداز واسلوب اور وقیع علمی، تحقیقی و دینی مضامین کے لیے معروف ومقبول ہے۔ ایڈیٹر ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی خود بھی علمی وتحقیقی شخصیت ہیں۔ انیسویں صدی کے اردو اخبارات ان کی ایک مایہ ناز تصنیف ہے۔ زیرتبصرہ شمارہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شمارے میں نہ صرف دین و مذہب بلکہ علم و ادب، تاریخ وتمدن اور کھیل سے متعلق علمی وتحقیقی مضامین شامل ہیں۔ مدیر نے اداریہ میں پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی جمہوریت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی عدلیہ کی مصنف مزاجی کی بھی ستائش کی ہے۔ رسالے میں قبول اسلام کی ایمان افروز داستان، کتابوں کی سیر اور شب و روز وغیرہ مستقل کالم ہیں۔ ایڈیٹر کا ایک بے حد اہم مضمون مولانا ابوالکلام آزاد علم و ادب اور سیاست ملکی کا عظیم پیکر شامل ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر شعائر اللہ خاں نے مولانا آزاد کے مختصر حالات زندگی اور ان کی علمی وادبی وصحافتی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شائستہ اختر نے نثار احمد فاروقی کے علمی کارنامے پر لکھے مضمون میں ان کی تصنیف شدہ کتابوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی سوانح حیات پیش کی ہے۔ رسالے میں یوسف دہلوی کی خطاطی پر ایک مختصر مضمون شامل ہے۔ معروف صحافی سہیل انجم نے شایاں قدوائی کی رباعیات پر عمدہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ سمیع اللہ خاں بیرن کا مضمون رامپور کی ہاکی بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ قلمکار نے رامپور میں ہاکی کی شروعات اور اس کے ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں ہندوستان میں تین ایسے ضلعے تھے جنھوں نے ملک کو اچھے سے اچھے کھلاڑی دیے۔ ان میں بھوپال، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی اور رامپور ان تینوں جگہ کے کھلاڑیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کا سلیکشن کھیل میں اچھے مظاہرے پر ہوتا تھا کسی سفارش کے بل پر نہیں ہوتا تھا اور جب کھلاڑی انڈیا کی ٹیم میں اپنے کھیل اور اپنے ہنر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کا بھی نام ہوتا تھا اور ان کھلاڑیوں سے ضلع اور صوبے کی بھی عزت اور شہرت ہوتی تھی۔ اس شمارے میں امام اعظم ابوحنیفہ سیمینار اور رامپور رضا لائبریری کے سیمینار کی تفصیلی رپورٹ بھی شائع کی گئی ہے۔ یہی نہیں مسکین حجازی کے ناول چیچنیا کے سرفروشوں کی داستان اور انوارالعارفین کا اردو ترجمہ کی اقساط بھی شمارے کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی قابل صد ستائش ہیں کہ انھوں نے 64 صفحات کے رسالے میں اسلام، شعروادب، تصوف، تاریخ وثقافت کے موضوعات پر نہایت نادر تحریریں جمع کردی ہیں۔

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

امریکہ کے اردو پروفیسروں کو استقبالیہ

علی گڑھ: ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اردو زبان کا فروغ ہورہا ہے۔ امریکہ کی نورتھ کیرولائنا یونیورسٹی کے شعبہ ایشین اسٹڈیز میں اردو

زبان کو سکھانے کے لیے خاص توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ ٹیلی فلم کے ذریعے بھی اردو زبان کو سکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار امریکہ کی نورتھ کیرولائنا یونیورسٹی کے شعبۂ ایشین اسٹڈیز میں اردو زبان کے پروفیسر ڈاکٹر افروز تاج نے شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیمینار میں ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر افروز تاج امریکی یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کے وفد کو لے کر اردو اور ہندی زبان کی روانی کے مقصد سے علی گڑھ کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر افروز تاج شعبہ اردو میں آج مذکورہ وفد کے اعزاز میں منعقد استقبالیہ پروگرام کو خطاب کررہے تھے۔ پروفیسر افروز نے اے ایم یو کے طلبہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ شعبہ اردو کے طلبہ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اردو زبان کا اسکوپ بڑھ رہا ہے۔ مستقبل میں امریکہ اور دیگر بیرونی ممالک میں بھی اردو داں طبقے کے لیے روزگار کے بہتر مواقع میسر ہوں گے۔ اس سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر محمد زاہد نے امریکہ کی نورتھ کیرولائنا یونیورسٹی سے آئے طلبہ واساتذہ کے وفد کا استقبال کیا۔ استقبالیہ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر جان کالڈویل نے کہا کہ امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں اردو اور ہندی زبان پڑھائی جارہی ہیں۔ خود نورتھ کیرولائنا یونیورسٹی میں ہی غزلوں کا ترجمہ کیا جارہا ہے۔ وہ خود غالب کی اہم غزلوں کا شاعرانہ بندشوں کے تحت انگریزی میں ترجمہ کررہے ہیں۔ پروفیسر جان کالڈویل نے کہا کہ موجودہ دور میں یونیورسٹیاں صرف اپنی سرزمین پر ہی نہیں بلکہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے پورے عالم کی یونیورسٹی کے ساتھ علم کی شمع روشن کررہی ہیں۔ ہماری یونیورسٹی بھی چائنا، جاپان، روس اور دیگر ممالک کے ساتھ آن لائن رابطہ قائم کرکے اردو زبان کا درس دے رہی ہے۔ نورتھ کیرولائنا یونیورسٹی میں عربی کی استاد پروفیسر دریہ نے عربی زبان میں اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے علی گڑھ شہر اور اردو زبان کی تعریف کی۔ اس دوران شعبے کے طلبہ نے امریکہ میں اردو زبان کے فروغ اور تدریس کے متعلق سوالات بھی کیے۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے امریکہ سے آئے اساتذہ کرام، طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر قمرالہدیٰ فرید، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر موصوف عالم، ڈاکٹر محمد شارق، ڈاکٹر مامون احمد بھی موجود تھے۔

روزنامہ'ہمارا سماج'، دہلی، 31 مئی 2013

جے این یو، نئی دھلی

محمد حسن میموریل لیکچر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں محمد حسن میموریل لیکچر کے موقعے پر معروف ناقد عتیق اللہ نے پروفیسر محمد حسن کو اردو تنقید کا متبادل نظریہ ساز قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے عہد کے نظریات پر اکتفا کرنے کے بجائے اپنی تنقیدی فکر کو نئی اور الگ سمت عطا کی۔ انھوں نے بین العلومیت کی وکالت کرتے ہوئے ادب کی تفہیم میں ہر اس علم اور طریقے کار کو جگہ دی جس سے ادب فہمی میں مدد مل سکتی تھی۔ محمد حسن تاریخ، تہذیب اور معاشرتی اقدار اور روایات کا گہرا شعور رکھتے تھے جس کا اظہار ان کی تنقید، ڈرامے، ادبی تاریخ کی کتابوں، ناولوں اور صحافتی تحریروں میں ملتا ہے۔ انھوں نے ہر سطح پر اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑی ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے اپنے تعارفی خطاب میں محمد حسن کی شخصیت اور خدمات کو ہمہ جہت قرار دیتے ہوئے انھیں اردو ادب و تنقید میں دانشوری کی روایت کا علمبردار قرار دیا اور کہا کہ محمد حسن کی ہمہ جہت خدمات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک فرد نہیں بلکہ ان کی ذات انجمن سے عبارت تھی۔ مہمان اعزازی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے معروف ادبی صحافی نند کشور وکرم نے محمد حسن کو معاصر

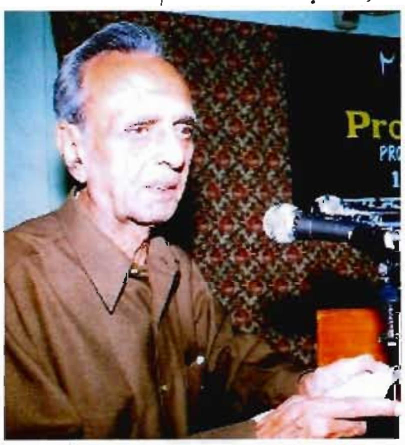

ادب و تنقید کا روشن باب قرار دیا اور کہا کہ محمد حسن کی ذات میں علم ونظر کی کئی جہتیں یکجا تھیں۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اسکول آف لنگویجز کے ڈین پروفیسر اسلم اصلاحی نے اپنے خطاب میں کہا کہ محمد حسن نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔ وہ ہمیشہ نئی نسلوں کو تحریک و ترغیب دیتے تھے۔ ان کی علمی تحریریں قاری پر مثبت اثر چھوڑتی ہیں اور ذہن کے دریچے کھولتی ہیں۔ جلسے کو پروفیسر محمد شاہد حسین اور ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے صدر پروفیسر رام بخش نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں ڈاکٹر آصف زہری نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ لیکچر کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مالی معاونت سے ہوا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2013

عالمی اردو نامہ

نیپال

نیپال میں بیگم حضرت محل کے مزار کی خستہ حالی

نئی دہلی: نواب واجد علی شاہ کی پہلی بیوی بیگم حضرت محل کی نیپال میں واقع مزار بہت بری حالت میں ہے اور سماجی تنظیموں نے بہادر شاہ ظفر کی رنگون میں واقع مزار سے باقیات ہندوستان لانے کی طرز پر بیگم کی مزار کو لے کر بھی کچھ ایسی ہی پہل کی ہے۔ مورخ امریش مشرا نے کہا کہ وہ حال ہی میں نیپال گئے، جہاں بیگم کے مزار کو دیکھ کر انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ بیگم اودھ میں رہتی تھیں اور انگریزوں کے خلاف 1857 کی بغاوت میں ان کا کافی اہم کردار تھا۔ انھیں اودھ کی بیگم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انگریزوں کے خلاف 1857 کی بغاوت پر کئی کتابیں لکھ چکے اور اس موضوع میں مہارت رکھنے والے مشرا نے بتایا کہ بیگم کے شوہر کو جب کلکتہ میں جلاوطن زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے اودھ کی کمان سنبھالی اور لکھنؤ پر مکمل کنٹرول کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے برجس قادر کو اودھ کا ولی بنادیا۔ انھوں نے نیپال میں پناہ لی اور وہیں 1879 میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے کہا سماجی تنظیموں کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے کہ بیگم کی مزار کی تعمیر نو کی جائے یا پھر ان کے باقیات ہندوستان لائے جائیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 مئی 2013

کویت

کویت میں عالمی مشاعرہ اور ایوارڈ فنکشن

کویت: انجمن فروغِ اردو ادب، کویت کے زیر اہتمام ہر سال کی طرح اس سال بھی پانچواں عالمی مشاعرہ اور ایوارڈ فنکشن منعقد کیا گیا جس میں دنیائے اردو کے معروف شعرا نے شرکت کی مہمان خصوصی کے طور پر کویت میں پاکستان کے سفیر سید ابرار حسین نے شرکت کی۔ جب کہ صدارت حیدر آباد کی معروف بزرگ شاعرہ بیگم نسیم نیازی نے کی۔ انجمن کے بانی اور صدر عبداللہ عباسی نے مہمانوں اور شعرا کا استقبال کیا۔ ایوارڈ فنکشن کی نظامت کویت میں مقیم معروف شاعر افروز عزیز نے کی۔ ہندوستان سے تشریف لانے والے دو مشہور شعرا راحت اندوری اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو اس سال 2013 کا فروغ اردو ادب ایوارڈ سفیر پاکستان سید ابرار حسین کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان میں ہندوستان سے راحت اندوری، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، بحرین سے الطاف رانا، طارق اقبال، قطر سے عزیز نبیل اور آسٹریلیا سے عندلیب صدیقی کے علاوہ کویت میں مقیم شعرا میں افروز عالم بدر سیماب، صفدر علی صفدر، عامر قدوائی، اسلم عمادی منظر عالم، فیاض وردک کے علاوہ صدر مشاعرہ بیگم نسیم نیازی اور شاہ جہاں جعفری کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2013

جرمنی میں سردار جعفری کی صد سالہ سالگرہ کا جشن

برلن: اردو انجمن برلن کے زیر اہتمام علی سردار جعفری کی صد سالہ تقریب کا اہتمام اتوار 2 جون 2013 کو راجدھانی برلن کے مرکزی علاقے میں ایک ہال میں کیا گیا۔ جلسے میں سیمینار، موسیقی اور مشاعرے کے پروگراموں سے سردار جعفری کی شاعری میں انسانیت، ترقی پسندی، امن اور محبت کے پیغام کو سراہتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز ستار اور طبلے کی جھنکاروں سے کیا گیا اس کے بعد اردو انجمن برلن کے صدر عارف نقوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے خاص طور سے دلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی کا سواگت کیا جنھیں انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنس ICCR نے اس اہم تقریب میں شرکت کے لیے خاص طور سے جرمنی بھیجا تھا۔ عارف نقوی نے اردو انجمن کی طرف سے ICCR کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اردو انجمن کے پروگرام مذہب و ملت، قومیت اور رنگ و نسل

سے بالاتر ہوتے ہیں اور ہر وہ شخص ان میں شرکت کرسکتا ہے جسے اردو زبان و ادب سے دلچسپی ہے۔ اس کے بعد سردار جعفری کی زندگی اور شاعری پر انور ظہیر کی بنائی ہوئی مختصر فلم کی جھلکیاں دکھائی گئیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے طویل کلیدی مقالے سے قبل سردار جعفری کی زندگی سے وابستہ چند اہم واقعات سنائے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں جعفری کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جعفری ایک ایسے اہم ترقی پسند شاعر تھے جنھوں نے کلام کے شعری محاسن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ سردار جعفری نے اپنی متعدد نظموں کے ذریعے غالب، میر، کبیر اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ روایت کے احترام کی دلیل ہے۔ خالد علوی نے اپنے طویل مقالے کا اختتام مجنوں گورکھپوری کے اس قول پر کیا ''علی سردار جعفری کی شاعری کی جو خصوصیت سب سے پہلے ہم کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنے 'بربط دل' کو نئے انداز سے چھیڑا ہے لیکن ان کا یہ نیا انداز بہت رچا ہوا ہے اور ہمارے موروثی روایات کی تمام شائستگی اور تہذیب کے لطیف ترین عناصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ...'' سیمینار کے دوران اردو انجمن برلن کے روح رواں عارف نقوی نے سردار جعفری کی شخصیت، فکر و فن اور ترقی پسندانہ نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سیمینار کے بعد عارف نقوی کے تازہ مجموعہ کلام 'کھلتی کلیاں' کا ڈاکٹر خالد علوی کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر محترمہ قدسیہ خواجہ نے عارف نقوی کے فن اور شخصیت پر اپنے مقالے میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے 'کھلتی کلیاں' سے اشعار کے حوالے دیے جس کا جرمن زبان میں ترجمہ سارہ ظہیر نے پڑھ کر سنایا۔ رسالہ 'پرواز' کے عشرت معین سیما نمبر کا تعارف کراتے ہوئے عارف نقوی نے سیما کی شعری اور نثری صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔ جلسے میں عشرت معین سیما، نایاب خواجہ، اودے فائکباخ اور دھیرج رائے کو اردو کی خدمات کے لیے اردو انجمن برلن کی طرف سے سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ برلن کے مشہور گلوکار دھیرج رائے نے اپنی خوبصورت آواز میں سردار جعفری کی نظم اردو، جرمن اور بنگالی زبان میں سنا کر اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے آخری دور میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

پریس ریلیز، عارف نقوی، صدر اردو انجمن برلن 7 جون 2013

تخلیقی ادب کے انتخاب میں تخلیق کاروں کی شمولیت

قومی اردو کونسل کے تخلیقی ادب پینل کا قیام

نئی دهلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں تخلیقی ادب پینل کی پہلی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ تخلیق کی اولیت اور اہمیت کے پیش نظر اردو کے تخلیقی ادب کے اشاعتی اورامدادی پروگرام کوزیادہ بامعنی اور وسعت طلب بنانے کے لیے فیصلوں میں تخلیق کاروں کی حصہ داری کوضروری سمجھتے ہوئے اس پینل کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ تخلیقی کرب، تخلیقی تجسس اورتخلیقی توانائی کے رمزآشناتخلیق کاروں کے مفید مشوروں سے پروگرام کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی اورنئے امکانات کے در کھلیں گی۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں تخلیقی ادب پینل کی پہلی میٹنگ کا منظر

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق کے سوتے سے ہی ادب پروان چڑھتا ہے۔ تخلیق دراصل ہر ایک ادب کی بنیاد ہے اور کسی بھی وجہ سے تخلیقی ادب اور تخلیق کار کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس پینل کی تشکیل کا مقصد تخلیق اور تخلیق کار کے باہمی رشتے کو مزید مضبوطی فراہم کرنا ہے۔ اس میٹنگ میں دو اہم فیصلے کیے گئے۔ قومی اردو کونسل کا تخلیقی ادب کا سہ ماہی رسالہ جاری کیا جائے گا۔ دوسرے تخلیقی ادب اور بدلتے منظر نامے میں ادب کی مختلف اصناف اور جہات کو سمجھنے کے لیے کونسل ناول، شاعری، ڈرامے، افسانے، فکشن اور نان فکشن پر جلد ہی ہفت روزہ ورکشاپ منعقد کرے گی۔

علی گڑھ سے آئے پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ اب اعلیٰ ادب کی پیمائش کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جناب حسین الحق نے کہا کہ ہندوستانی معاشرے میں تخلیق اور تخلیق کار کی اہمیت واضح کرنا لازمی ہے۔ اس خاص موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ جو بھی کلاسیکی ادب ہے وہ نہ صرف یکجا کیا جائے بلکہ اس کی فراہمی کو بھی ممکن بنایا جائے۔ اردو کے اہم ڈرامے، ناول، افسانے، فکشن اور نان فکشن، تخلیقی ادب کو دوبارہ شائع کرایا جا سکتا ہے۔ روزنامہ انقلاب، ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے کہا کہ اخبار سے جڑے رہنے کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ روز بہ روز اردو کے قارئین کی تعداد میں کمی آرہی ہے۔ نوجوان نسل کو اگر ٹٹولا جائے تو وہ ادب سے بالکل بیگانی نہیں ہے لیکن وہ اب کتابوں کو ہاتھ میں لے کر پڑھنا نہیں چاہتی اس لیے تخلیقی ادب کی فراہمی نئی تکنیک کے ذریعے ہونی لازمی ہے۔ بنگلور سے تشریف لائیں محترمہ شائستہ یوسف نے کہا کہ ہم اس سچائی کا اعتراف کرتے ہیں کہ قارئین کی کمی ہے لیکن تخلیق کار ہی ایک عہد کو بناتا ہے۔

گلزار دہلوی نے کونسل کے ڈائرکٹر اور وائس چیرمین کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ میں کونسل کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے تخلیقی ادب اور تخلیق کاروں کے سلسلے میں اہم مجلس کا انعقاد کیا جس میں ہم کو ان نکات پر غور کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل اپنی اس کوشش میں دوسری زبانوں کے ماہرین اور تخلیق کاروں کو بھی شامل کرے تاکہ یہ مہم ملکی سطح پر کارگر ثابت ہو۔ جناب سلام بن رزاق نے اس پینل کی تشکیل کو اہم تصور کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تخلیق کے عمل کو مزید جلا ملے گی۔ اس مجلس میں کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید اور محترمہ آبگینہ عارف نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 جون 2013

اقلیتی اداروں میں اردو کی صورت حال پر 'اردو دنیا' کا خصوصی شمارہ

قومی اردو کونسل نے اپنے مقبول اور کثیر الاشاعت ماہانہ رسالے 'اردو دنیا' میں کور اسٹوریز اور خصوصی شماروں کے ذریعے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو زبان و ادب کے مکمل منظرنامے کی تصویر کشی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کے تحت کونسل نے اس مرتبہ ملک کے اقلیتی تعلیمی اداروں میں اردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس اور اس کے فروغ کے سلسلے میں ہونے والی سرگرمیوں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی اردو دانش وروں کی آرا اور تاثرات پیش کرنے کے لیے 'اردو دنیا' کے ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب میں سرگرم سبھی اقلیتی ادروں کے سربراہان و منتظمین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ادارے کی تاریخ، سرگرمیوں اور ادارے کی اردو خدمات کا مختصر احوال، تصاویر کے ساتھ 'اردو دنیا' کے ای میل آئی ڈی urduduniyancpul@yahoo.co.in یا editor@ncpul.in پر زیادہ سے زیادہ 31 جولائی 2013 تک ارسال فرمادیں۔ مضمون اور تصاویر قومی اردو کونسل کے پتے پر بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ پتہ ہے۔ شعبۂ ادارت، قومی اردو کونسل، فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

(منجانب: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام، ڈائریکٹر قومی اردو کونسل و ایڈیٹر، ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی)

اردو تلفظ درست کرنے والا سافٹ ویئر زیر تکمیل

نئی دہلی: ہندوستان میں اردو کی مضبوط وراثت کو کامیابی کی ایک اور منزل حاصل ہونے کی امید ہے۔ آن لائن اردو تعلیم کا آغاز ہو ہی چکا ہے۔ مسئلہ اردو کے صحیح تلفظ کا۔ اب یہ بھی حل ہوجائے گا۔ بولنے والی اردو ڈکشنری (اردو ٹاکنگ ڈکشنری) کا سافٹ ویئر کسی بھی اردو لفظ کے معنی تو بتائے گا ہی ساتھ ہی اس کا صحیح تلفظ بھی بتائے گا۔ اتنا ہی نہیں اس کی پہنچ آپ کے اسمارٹ فون تک بھی ہوگی۔ ہندوستان میں اردو سے متعلق تمام نئی معلومات ابھی اردو کے چاہنے والوں تک بھلے ہی نہ پہنچی ہوں مگر ملک میں اس زبان کی ترقی کی ایک نئی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ ہندوستان اپنا اردو وکی پیڈیا بنا رہا ہے۔ اردو یونی کوڈ سپورٹ کے لیے اپنا سافٹ ویئر تیار کر رہا ہے۔ اس کڑی کے تحت وزارت مواصلات کا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا محکمہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) ٹاکنگ اردو ڈکشنری کے سافٹ ویئر پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا سافٹ ویئر ہوگا، جس کے ذریعے کمپیوٹر یا اسمارٹ موبائل فون پر کسی لفظ کو لکھتے ہی وہ رومن اور اردو میں اسکرین پر اس کے مطلب کے ساتھ اس کا درست تلفظ بھی بتائے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام کے مطابق اردو کا یونی کوڈ سپورٹ سافٹ ویئر اور اردو کے ایسے کی بورڈ کے سافٹ ویئر تیار ہوتے ہی سارے راستے آسان ہوجائیں گے۔ نئے سافٹ ویئر کو اسٹڈی ٹول بنایا جاسکتا ہے۔ وہ اسمارٹ فون پر بھی قابل استعمال ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی ہمارے پاس اردو کا آپٹیکل کریکٹر ریکگنیشن (او سی آر) نہیں ہے۔ اس کے لیے کوشش جاری ہے۔ او سی آر ہونے کے بعد اردو میں ڈیجیٹل ڈاکیومینٹیشن آسان ہوجائے گا۔ ابھی پی ڈی ایف ہی واحد راستہ ہے اور موجودہ پی ڈی ایف کنورٹر اردو اور ہندی کو سپورٹ نہیں کرتا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مئی 2013

کونسل کی کتاب گاڑی گلبرگہ پہنچی

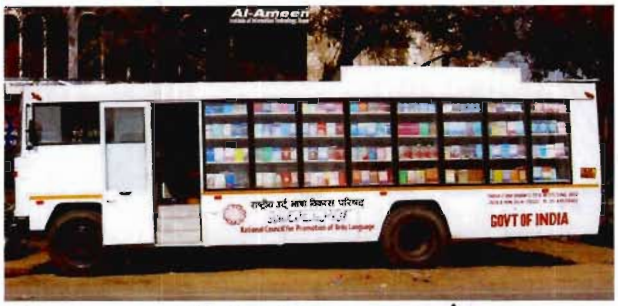

بنگلور: قومی اردو کونسل کی موبائل وین کا کرناٹک کے شہر گلبرگہ میں شاندار استقبال کیا گیا۔ شہر کی اہم ادبی شخصیات نے اِس موقعے پر کونسل کی اِس کوشش کی ستائش کی اور کہا کہ کونسل کی کتاب گاڑی سے ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی عاشقان علم وادب اپنی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ہم اہلِ جنوبِ ہند، شاکر و شاد ماں ہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے وہ اپنی موبائیل وین کے ذریعے اردو آب یاری، خدمت گزاری کا کام نہایت سلیقے سے سرانجام دے رہی ہے۔ پریس ریلیز، محمد طیب علی خرادی، کرناٹک، 27 مئی 2013

(2)

گلبرگہ: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی نے اپنی مطبوعات کو اب تک شمالی ہند کے دور دراز علاقوں میں موبائل وین کے ذریعے مختلف شہروں میں اردو زبان وادب کی مختلف اصناف پر کتابوں کی نمائش و فروخت کی ہیں، یہ اردو زبان وادب کی خدمت و فروغ کا اہم سلسلہ تا حال 18 واں مرحلہ طے کر چکا ہے، اور اب اسی سلسلے کے 19 ویں مرحلہ میں حیدرآباد و کرناٹک کے مختلف شہروں سے ہوتی ہوئی موبائل وین کا شہر گلبرگہ میں بتاریخ 15 تا 18 مئی 2013 قیام رہا، موبائل وین سے اردو کتابوں کی نمائش و فروخت اردو قارئین کے لیے زریں موقع جانتے ہوئے اردو ادب کے اساتذہ، ادبا، شعرا اور طلبہ نے اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شہر گلبرگہ کے تاریخی ہفت گنبد میدان نیشنل کالج گلبرگہ میں موبائل وین کا قیام 3 دن رہا، اور شہر کے گنجان اردو آبادی والا علاقہ جیلان آباد میں بھی ایک دن قیام رہا، حلیمہ این سی پی یو ایل کمپیوٹر سنٹر گلبرگہ کے چیف جناب امجد جاوید نے خصوصی دلچسپی لے کر موبائل وین کی گلبرگہ آمد پر شہر بھر میں بینرس لگوائے، تمام اردو احباب کو بذریعہ موبائل فون مطلع بھی کیا، جس کا اچھا response رہا، اور شہر کے اہم اداروں کو ذاتی خطوط کے ذریعے اطلاع پہنچائی۔ مزید یہ کہ شہر کے دو روزناموں میں روزانہ کتابوں کی نمائش و فروخت پر خبرنامہ شائع کرتے رہے۔ گلبرگہ میں کتابوں کی فروختگی بہت حوصلہ افزا رہی۔ شہر کے تعلیمی اداروں نے بھی کتابیں خرید کر اردو زبان کی ترقی و ترویج میں بھرپور حصہ لیا۔ بذریعہ ڈاک، رشید سگری لکچرار، حلیمہ این سی پی یو ایل کمپیوٹر سنٹر گلبرگہ، 28 مئی 2013

موبائل وین پروگرام کا 20 واں مرحلہ

(آندھرا پردیش اور تمل ناڈو)

27 سے 28 جون 2013	کرنول
30 جون سے 1 جولائی 2013	کڈپہ
2 جولائی سے 3 جولائی 2013	ترو پتی
4 سے 5 جولائی 2013	چتور
7 سے 15 جولائی 2013	چینئی

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

نظیراکبرآبادی پرقومی سیمینار

علی گڑھ: ممتاز ماہرِتعلیم، دانشوراورعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسرنظیرمحمد نے کہا ہے کہ آج ہندوستان کو نظیراکبرآبادی کی فکر اور تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ وہ ملت بیداری مہم کمیٹی علی گڑھ (ایم بی ایم سی) کے زیرِ اہتمام قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی اور جامعہ اردوعلی گڑھ کے مشترکہ تعاون سے 'نظیراکبرآبادی کا عہد اور ان کی شخصیت' پر منعقدہ قومی سیمینار سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ نظیر کی شاعری ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے اور انھوں نے عوام کو مذہبی شدت پسندی کے محدود دائرے سے نکال کر روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔

جامعہ اردوعلی گڑھ کے رجسٹرار شمعون رضا نقوی نے کہا کہ ہندوستان کی ترقی و کامرانی کے لیے ضروری ہے کہ ہندی کے ساتھ اردو کے فروغ کی بھی مساوی کاوشیں ہونی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ گزشتہ 74 سال سے دنیا بھر میں اردو کی ترویج و اشاعت اوراسے روزگار سے جوڑنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے ایسے میں حکومت کو چاہیے کہ وہ اس ادارے کے ساتھ انصاف کرے یہی حکومت کی اردو دوستی کا ثبوت بھی ہوگا۔ اس سے قبل حاضرین کا خیرمقدم کرتے ہوئے ایم بی ایم سی کے سکریٹری جنرل جسیم محمد نے کہا کہ نظیراکبرآبادی کی افادیت آج کے دور میں پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور ضرورت ہے کہ آج کی نوجوان نسل کو ان کی حیات و خدمات سے روشناس کرایا جائے۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے تعلق سے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل اپنے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی سربراہی میں اردو کے فروغ کی سمت میں جو اقدامات کررہی ہے وہ نہ صرف قابلِ ستائش ہیں بلکہ ہر اردو والا ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے جامعہ اردوعلی گڑھ کی 74 سالہ خدمات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ایم بی ایم سی کے صدر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ نظیراکبرآبادی

منٹو کی ادبی نگارشات: ایک بازیافت

پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، سہیوگ سوشل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور وزارت ثقافت حکومت ہند کے اشتراک سے خدابخش لائبریری میں ''منٹو کی ادبی نگارشات: ایک بازیافت'' کے عنوان سے قومی سیمینار منعقد ہوا جس کے افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی جبکہ صدارت کے فرائض پروفیسر لطف الرحمٰن نے انجام دیے جناب اشرف فرید مدیر قومی تنظیم اور پروفیسر اسلم آزاد مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے، ڈاکٹر مولا بخش نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اولاً مہمانوں کا استقبال گلدستہ سے کیا گیا۔ بعدازاں وزیر وزارت ثقافت علمی جناب کے۔ رحمٰن کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا جو اپنی مصروفیت کے باعث سیمینار میں شرکت نہیں کرسکے۔ سیمینار کا آغاز ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ موصوف نے خیر مقدمی کلمات کے بعد منٹو کے حوالے سے ایک مختصر مگر جامع گفتگو میں کہا کہ منٹو نرا افسانہ نگار نہیں بلکہ اس کی شخصیت اور کارنامے کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ منٹو کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس حکومت نے منٹو کو ملزم قرار دیا تھا اسی حکومت نے اسے نشان امتیاز سے نوازا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد کے بعد ڈاکٹر مولیٰ بخش نے اپنے کلیدی خطبے کا آغاز بیانیہ تکنیک سے کیا اور کہا کہ اس تکنیک پر ہنوز کوئی باضابطہ کتاب

موجود نہیں ہے۔ اس تکنیک کا استعمال اردو میں اپنے اپنے طور پر ہوا۔ اس کے کوئی Tools یہاں مقرر نہیں اور اس تناظر میں منٹو کا بیانیہ قابل غور بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ موصوف نے ان کے کئی افسانوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر اسلم آزاد نے کہا کہ مجھے منٹو بچپن سے پسند رہا اور منٹو کو بہت پڑھا ہے اور جتنی بار پڑھا ہے منٹو ایک نئی صورت میں سامنے آیا ہے۔ روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر اشرف فرید نے کہا کہ ان کی تخلیقی اور طبعی زندگی مختصر رہی لیکن اس کے باوجود انھوں نے جو شاہکار افسانے اردو ادب کو دیے وہ صرف اور صرف ان کا خاصہ تھا۔ ان کے ساتھ ہی ان کا اسلوب ختم ہوگیا اور ہنوز ویسی تحریریں وجود میں نہ آسکیں۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطبے میں تمام مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے مقالوں کی تعریف کی اور فرمایا جس طرح شاعری کو سمجھنے کے لیے مختلف نکات ہیں اسی طرح فکشن کو بھی سمجھنے کے لیے کچھ مخصوص نکات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ ہر افسانہ ایک لسانی ساخت ہوتا ہے۔ پلاٹ، کردار، واقعات اور دیگر اجزا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ انھوں نے منٹو کے مختلف افسانوں سے مثالیں دے کر یہ بات کہی کہ منٹو کا قلم ہر جگہ لغزش کا شکار ہوتا ہے اور ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو قابل یقین نہیں ہوتیں اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ منٹو نے اپنی کہانیوں پر نظر ثانی نہیں کی۔ انھیں نہ تو اس کی فرصت تھی اور نہ انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی کیونکہ ان کا ذریعہ معاش ہی کہانیاں رہیں اور انھیں اس کا لحاظ تو رکھنا تھا۔ دوسری بات یہ کہ منٹو کی کہانیاں عمومی طور پر فساد، بازاری عورتوں اور جنس کے درمیان گھومتی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ بھی یہی رہی اور شاید یہ بڑی وجہ رہی کہ منٹو اس درجے کا افسانہ نگار نہ بن سکا جس کی اس سے توقع تھی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد تین ٹیکنیکل اجلاس ہوئے جس میں ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین، ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی، ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، محترمہ مہناز پروین، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر ابوبکر رضوی، ڈاکٹر امتیاز وحید، ڈاکٹر فرزانہ اسلم، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، جناب محمد امین، محترمہ الفیہ نوری اور جناب ارشد ظفر خاں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر اعجاز علی ارشد دوسرے کی ڈاکٹر مشتاق صدف اور تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور ڈاکٹر سرور ساجد نے کی۔ پریس ریلیز، خدابخش لائبریری، پٹنہ، 10 جون 2013

اردو کے فروغ میں محمد علی جوہر کا کردار

علی گڑھ: نورجن سیوا سمیتی اور اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک سیمینار بعنوان 'اردو کے فروغ میں مولانا محمد علی جوہر اور مسلم اقلیت کے مسائل' کا انعقاد کیا گیا، جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع نے شرکت کی۔ انھوں نے جلسے کو خطاب

کرتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ صرف استاد ہی نہیں بلکہ مجاہد بھی ہیں، حکومت اساتذہ مہیا کرا سکتی ہے اردو طلبہ کی موجودگی کو یقینی بنانا والدین کی ذمے داری ہے۔ ڈاکٹر ظفر دارک نے مولانا محمد علی جوہر کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی بے باک صحافت کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کے ذریعے نکالا گیا روزنامہ 'ہمدرد' صرف ایک اخبار ہی نہیں بلکہ پوری تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ دورِ حاضر میں صحافت اور صحافی کے لیے ان کی زندگی ایک مثال ہے۔ گلزار احمد نے صوبائی حکومت کے کچھ افسران کے ذریعے اردو کے ساتھ کی جا رہی ناانصافی کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ مادری زبان اردو کو بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں اردو کو فروغ دیں اور اردو اخبارات منگائیں۔ کنور نسیم شاہد نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ چند دنوں میں میں اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اردو کی لڑائی لڑی ہے اور لڑتا رہوں گا۔ جلسے کی صدارت شہر تعلیمی آفیسر نسیش جارنے کی۔ نظامت اویس جمال شمسی نے کی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 مئی 2013

نے حیاتِ انسانی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جنھیں عام طور پر دانشور اور شعرا نظرانداز کر دیتے ہیں۔ پروگرام کے اعزازی مہمان پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا کہ نظیر جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر مجیب شہزر نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کی اہمیت صرف اردو زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر زبان کے ریسرچ اسکالرس کو نظیر اکبرآبادی کی تخلیقات سے اپنے موضوع کی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے کنٹرولر برائے امتحانات رضوان علی خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نظیر اکبرآبادی صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر اور سماجی مصلح بھی تھے۔ مذکورہ سیمینار میں نظیر اکبرآبادی کی حیات و خدمات پر بیس سے زائد تحقیقی مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 19 مئی 2013

منشی نول کشور: مشرقی علوم وفنون کا بےلوث خدمت گار

لکھنؤ: سلیم جن کلیان ایجوکیشنل سمیتی کے زیراہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے اشتراک سے رائے اماناتھ آڈیٹوریم قیصر باغ میں ایک سیمینار بعنوان 'منشی نول کشور: مشرقی علوم وفنون کا بے لوث خدمت گار' منعقد ہوا جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر عمار رضوی (سابق وزیر تعلیم اترپردیش)، پروفیسر شارب ردولوی، عابد سہیل، احمد ابراہیم علوی، پروفیسر صابرہ حبیب شریک ہوئے۔ پروگرام کا آغاز ناظم تقریب ڈاکٹر ہارون رشید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

مہمانوں کی رسم گل پوشی کے بعد خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کنوینر پروگرام ڈاکٹر جہاں آرا سلیم نے سوسائٹی کی رپورٹ پیش کی۔ ساتھ ہی انھوں نے منشی نول کشور کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے سیمینار کی غرض و غایت بیان کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عباس رضا نیر اور غفران نسیم نے اپنے پرمغز مقالات میں منشی نول کشور کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے دورِ حاضر میں ان کی قدر و قیمت کا جائزہ لیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ منشی نول کشور ہمارے عہد کے وہ دانشور ہیں جن کی خدمات تقریباً دو صدیوں پر محیط ہیں۔ ان کے اس کارنامے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں نشر و اشاعت نے ان کے نقوش قدم سے روشنی حاصل کی۔ انھوں نے نہ صرف ادب و ثقافت اور صحافت کے میدان میں سنگِ میل قائم کیا بلکہ قرآن و احادیث کی بااحتیاط اشاعت سے مذہبی میدان میں بھی ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔ ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ منشی نول کشور نے جس اہتمام کے ساتھ قرآن مجید و مذہبی کتابوں کی اشاعت کی، اسی اہتمام کے ساتھ رام چرت مانس اور مہابھارت و گیتا کے تراجم بھی شائع کیے۔ انھوں نے دوران تقریر یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاستی حکومت علوم مشرقیہ کی ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرے جہاں منشی نول کشور کی خدمات اور ان کے کاموں کو نہ صرف پہچانا جاسکے بلکہ آنے والی نسلوں کے یہ کام ایک تہذیبی و علمی وراثت کی شکل میں محفوظ ہوں۔ پروفیسر

گزارش

مضمون نگاروں سے گزارش ھے کہ اپنی نگارشات کے ساتھ ایک عدد پاسپورٹ سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔ مضمون کے ساتھ تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا بھی ضروری ھے کہ یہ مضمون غیرمطبوعہ ھے اور کسی بھی رسالے اخبار یا کتاب میں شایع نہیں ہوا ھے۔ مضمون تحریر کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھا جائے کہ نئے موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھے گئے مضامین کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔ (ادارہ)

شارب ردولوی نے کہا کہ منشی نول کشور کے ان مخطوطات اور نوادرات کا تحفظ بھی نہایت ضروری ہے جو ہماری تہذیبی وراثت کا حصہ ہیں۔ عابد سہیل نے کہا کہ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر آج نول کشور ہوتے تو کیا کر رہے ہوتے۔ اس لیے اہل اردو کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی زبان کو زندہ، متحرک اور وسیع کرنے کے لیے اپنے لغات کی تجدید نو کرتے رہیں۔ احمد ابراہیم علوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد بے شمار ادبی و علمی سرمایہ ضائع ہو چکا تھا۔ اس کی از سر نو حفاظت میں منشی نول کشور نے اپنی بھر پور توانائی صرف کی۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا کہ منشی نول کشور نے اپنے تمام کارناموں میں سب سے زیادہ ادبی صحافت پر زور دیا۔

بذریعہ ڈاک، منیجر سلیم جن کلیان ایجوکیشنل سمیتی، لکھنؤ، 22 اپریل 2013

سماج میں اردو میڈیا کے کردار پر سیمینار

نئی دھلی: ایکشن فار ڈیولپمنٹ اینڈ ویلفیئر آف سوسائٹی اینڈ انوائرمنٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک سیمینار بعنوان 'موجودہ سماج میں اردو میڈیا کا کردار' کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار کا افتتاح معروف ڈاکیومنٹری فلم ہدایت کار ڈاکٹر محمد علیم الدین نے کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علیم الدین نے

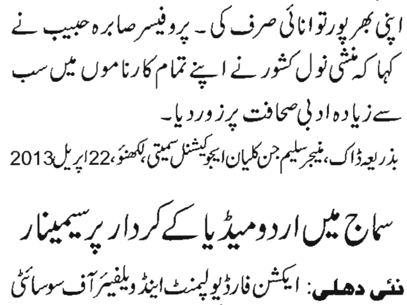

کہا کہ ملک میں جس طرح کا ماحول بنا ہوا ہے خاص کر مسلمانوں کے لیے اس میں صرف اردو میڈیا مثبت قدم کے ساتھ اپنی ذمے داری نبھا رہی ہے۔ ڈاکٹر مقصود الحسن قاسمی نے کہا کہ اردو میڈیا نے چند برسوں میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اب اردو میڈیا کی افادیت کو سمجھا جانے لگا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد شیخاوت، محمد اسحاق، وغیرہ نے خطاب کیا۔ تنظیم کے صدر ڈاکٹر آصف عمر نے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مالی تعاون فراہم کرانے کے لیے بطور خاص شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مئی 2013

فارسی میں سفر نامہ نویسی

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی کے رادھا کرشنن ہال میں مورخہ 9 مئی 2013 کو شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے دوسرے مولوی مہیش پرشاد یادگاری خطبے کا انعقاد پروفیسر ایم این رائے، ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی زیر صدارت عمل میں آیا۔ خطبے کا موضوع 'فارسی میں سفر نامہ نویسی' تھا۔ مقرر پروفیسر چندر شیکھر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے فارسی میں سفر نامہ نویسی کا جائزہ لیتے ہوئے 17 ویں صدی کے نصف اول کے ایک سفر نامے 'بحر الاسرار فی معرفت الاخیار' تالیف محمود ابن امیر والی بلخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کی چھے جلدیں تھیں مگر مفقود ہیں صرف دو جلدیں ابھی تک دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک جلد اس کے اسفار سے متعلق ہے۔ بلخی کے

سفر کا جغرافیہ برصغیر کے علاوہ مرکزی اور مشرقی ایشیا کے سواحل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زمانہ نذر محمد خاں کی حکومت کا ہے جس میں بلخی کتابدار کے اہم منصب پر فائز تھا۔ سفر نامے کا آغاز 1625 اور اختتام 1631 یعنی جہانگیر کے آخری عہد اور شاہجہاں کے اولین زمانے کا دہلی کے لال قلعے یا آگرہ کے حالات میں تاج محل کا ذکر نہیں ملتا۔ ایک موضوع بہت حاوی ہے اور وہ ہے سفر نامہ نویس کی ہندو جوگیوں سے ملاقات جس کا آغاز پیشاور سے ہی ہو جاتا ہے۔ وہ ان کی صحبت میں رہتا ہے اور ان کے ساتھ مندروں میں جاتا ہے۔ اس سفر نامے کے احوال بعض جگہ سفر نامہ ابن بطوطہ سے مشابہ ہیں۔ اس نے تاریخ وار ہندوستان کے شہروں، قصبوں وغیرہ کے احوال رقم کیے ہیں۔ بہت سارے واقعات مسموع ہیں۔ پروفیسر چندر شیکھر نے 18 ویں صدی کے سفر نامہ بیان واقع مولفہ منشی عبدالکریم اور سفر نامہ مخلص (آنندرام مخلص) کا بھی تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ سفر نامے ادبی خزانے تو ہیں ہی ان سے سیاسی، سماجی اور تاریخی مسئلوں پر بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر اودھیش پردھان (شعبہ ہندی، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے مہمان خصوصی کے طور پر اپنی گفتگو کا آغاز مولوی مہیش پرشاد کے سفر نامے 'میری ایران یاترا' (اس کا اردو ترجمہ اسی نام سے ڈاکٹر سید حسن عباس نے کیا ہے) کے ذکر سے کیا اور کہا کہ مولوی صاحب نے 1929 میں ایران کا سفر کیا تھا اور وہاں کے مندروں، گرودواروں اور غیر مسلموں کی صورتحال کی کافی عمدگی سے تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایران ایک قدیم ملک ہے اور ہمارے ملک سے اس کے قدیم دوستانہ روابط ہیں اور فارسی زبان میں ہر موضوع منجملہ سفر ناموں پر اچھا ذخیرہ محفوظ ہے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر سید حسن عباس (صدر شعبہ فارسی) نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے مولوی مہیش پرشاد یادگاری خطبے کے سلسلے میں قومی کونسل کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر حسن عباس نے فارسی میں سفر نامہ نویسی کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کیا۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر مہیندر ناتھ رائے نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پروفیسر چندر شیکھر نے فارسی سفر ناموں پر جو تفصیلی خطبہ پیش کیا اسے میں نے بہت توجہ سے سنا اور میرے ذہن میں فارسی میں لکھے سفر ناموں کی بابت ایک اچھی تصویر ابھری۔ انھوں نے ڈاکٹر حسن عباس کو مخاطب کر کے کہا کہ ایسے پروگرام کا سلسلہ چلتے رہنا چاہیے تاکہ اس سے سبھی بہرہ مند ہوں۔ پروفیسر شمیم اختر نے اظہار تشکر کی رسم ادا کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد عقیل نے انجام دیے۔ واضح رہے کہ قومی کونسل کے تعاون سے 16 فروری 2013 کو مولوی مہیش پرشاد یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے 'مولوی مہیش پرشاد: حیات اور ادبی خدمات' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا تھا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سید حسن عباس صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، 10 مئی 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

اردو تہذیب کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنے کو تیار ہوں: کپل سبل

ممبئی: مرکزی وزیر قانون کپل سبل نے کہا کہ حکومت جلد ہی یکساں مواقع فراہم کرنے والا قانون تشکیل دے گی جس کے تحت اقلیتوں کو بھی دیگر برادران وطن کی طرح یکساں مواقع فراہم ہوں گے۔ مسٹر سبل نے کہا کہ ہمہ جہت قومی ترقی کے لیے اقلیتوں میں تحفظ کا جذبہ پیدا کرنا اور ان کا اعتماد حکومت پر بحال کرنا ازحد ضروری ہے۔

وزیر قانون نے کہا کہ مسلم طلبا کے داخلے کو وہ صرف اقلیتی اداروں تک محدود دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ عام کالجوں میں بھی انھیں تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ ملک کے 15 کروڑ مسلمانوں کے لیے اقلیتی کالج قائم کیے جائیں گے۔ اقلیتوں کے لیے یکساں قانون جلد از جلد نافذ کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے اس قانون کے نفاذ کے بعد ان کی یہ شکایت دور ہوجائے گی کہ ان کی مختلف معاملات میں حق تلفیاں کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل سے وہ اچھی طرح واقف ہیں انھیں اپنا آشیانہ بسانے یعنی کہ کرایہ پر اپنا گھر لینے سے اسکولوں اور کالجوں میں داخلے تک بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے لیے جہد مسلسل کی ضرورت ہے اور وہ کی جارہی ہے۔ مسٹر سبل نے کہا کہ ''اردو تہذیب کے تحفظ کے لیے میں جنگ لڑنے کو تیار ہوں اور یہ بات انسانی جذبے سے کہہ رہا ہوں جب تک ہم تعلیم کی اہمیت پر توجہ نہیں دیں گے ملک آگے نہیں بڑھ سکتا اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا صرف والدین کی ہی ذمے داری نہیں ہوتی بلکہ سماج کی بھی ذمے داری ہوتی ہے۔ حق تعلیم کا یہ قانون اس وقت بنایا گیا تھا جب وہ وزیر تعلیم تھے اور اس کی منظوری میں انھوں نے کلیدی رول ادا کیا تھا۔ حکومت نے اس لیے علاقائی اسکول کی تجویز منظور کی ہے کہ اگر آپ کے حلقے میں اسکول نہیں ہے تو آپ رٹ پٹیشن داخل کرسکتے ہیں۔ حکومت کو اسکول کی سہولت فراہم کرنی ہوگی چونکہ ہمارے یہاں اچھے اسکول اور یونیورسٹی مخصوص ہے۔ اس لیے عام اسکولوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس کے دوران 256 قراردادیں منظور کی گئیں جس میں پندرہ نکاتی پروگرام کے نفاذ کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی تشکیل دینے کا مطالبہ کیا گیا جس طرح پسماندہ طبقات کے لیے سرکاری منصوبوں کے نفاذ کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اسی طرز پر اراکین اسمبلی کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ اقلیتی تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ دی جائیں، جماعت اول تا بارہویں مسلم طالبات کو مفت تعلیم مہیا کرائی جائے اردو اساتذہ کی تقرری، مسلم طلبا کو تعلیمی سرکاری وظائف، مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلم طلبا کی مفت کوچنگ، پسماندہ طبقات کی طرز پر مسلم طلبا بیرون ملک حصول تعلیم کے لیے سرکاری امداد کے بندوبست کے ساتھ ریاست کے 4 اقلیتی اضلاع میں حکومت کی جانب سے 4 یونانی کالج قائم کیے جائیں، پسماندہ طبقات کی طرز پر مسلم طلبا کو پائلٹ اور ہوٹل مینجمنٹ کی ٹریننگ کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے۔ مولانا آزاد مالیاتی کارپوریشن کو دوبارہ زندہ کرکے اقلیتوں کو مدد فراہم کی جائے، نیشنل ڈیٹا بینک سچر کمیٹی رپورٹ کی مناسبت سے کمیٹی تشکیل دی جائے، یکساں حق کمیشن تشکیل دیا جائے، فرقہ وارانہ فساد کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی ضرورت سمیت دیگر قراردادیں شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مئی 2013

قومی: ——————

پارلیمنٹ لائبریری میں اردو اخباروں کا 'لنک' غائب

نئی دهلی: پارلیمنٹ لائبریری کے آن لائن نیوز پیپر لنک میں اردو اخبارات کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے، جب کہ پارلیمنٹ لائبریری کے نیوز پیپر لنک میں ہندوستان کی بڑی مقامی زبانوں کے اخبارات کے لنک دیے گئے۔ جیسے اس لنک میں انگریزی اخبارات کی بڑی فہرست کے ساتھ ہندی، گجراتی، مراٹھی، ملیالم، تمل اور تیلگو جیسی زبانوں کے مقامی اخبارات کے لنک موجود ہیں۔ واضح ہو کہ پارلیمنٹ میں اسٹاف لائبریری کے نام سے ایک مکتبہ ہے جسے لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبران استعمال کرتے ہیں اس لائبریری سے لوک سبھا اور راجیہ سبھا سکریٹریٹ کے تقریباً 4 ہزار عملے استفادہ کرتے ہیں اور انھیں رجسٹریشن کے بعد کتابیں پڑھنے اور لے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ لائبریری کے بارے میں ویب سائٹ پر دی گئی معلومات کے مطابق پارلیمنٹ لائبریری کو ایک کمیٹی چلائی جاتی ہے جو ہر سال لوک سبھا کے اسپیکر کے ذریعے تشکیل دی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ لائبریری کے تعلق سے یہ کمیٹی اپنے مشورے دیتی ہے۔ اس میں لوک سبھا کے 6 ممبران اور راجیہ سبھا کے 3 ممبران شامل ہوتے ہیں۔ لائبریری کے بارے میں موجود تفصیلات کے مطابق پارلیمنٹ لائبریری کو اَپ ڈیٹ بھی کیا جاتا ہے، یہاں 14 روزنامے آتے ہیں، جن میں 7 انگریزی کے، 5 ہندی کے، 1 پنجابی اور 1 اردو کا اخبار ہوتا ہے جب کہ 30 میگزین منگائے جاتے ہیں جن میں 16 انگریزی اور 14 ہندی کے ہوتے ہیں۔ یہ روزنامے ہارڈ کاپی ہوتے ہیں؛ جب کہ اسی لائبریری کی 'سب ویٹ سائٹ' ہے جہاں انگریزی، ہندی اور پنجابی اخبارات کے علاوہ آدھے درجن سے زائد مقامی زبانوں کے اخبارات کی لنک موجود ہیں۔ اس کی ویب سائٹ پر جا کر آسانی سے ان اخبارات تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ پارلیمانی لائبریری کی سب ویب سائٹ پر ان اخبارات کی موجودگی سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ ان مقامی اخبارات کی آواز پارلیمنٹ تک پہنچتی ہے مگر پارلیمنٹ لائبریری کے نیوز لنک میں اردو اخبارات کے لنک نہیں دیے گئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2013

بہادر شاہ ظفر کے باقیات دہلی لائے جائیں: جسٹس سچر

نئی دھلی: سوشلسٹ پارٹی آف انڈیا نے صدر جمہوریہ ہند کو ایک میمورنڈم بھیج کر درخواست کی کہ وہ حکومت کو ہدایت دیں کہ ملک کی پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفر کے باقیات میانمار کی راجدھانی رنگون سے دہلی لاکر مہرولی میں دفن کیے جائیں۔ اس سے قبل 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے شہیدوں کی یاد میں سوشلسٹ پارٹی آف انڈیا نے منڈی ہاؤس سے جنتر منتر تک پیدل مارچ کیا جہاں جسٹس راجندر سچر کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر جسٹس راجندر سچر نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر ملک کی متحدہ فوج کے کمانڈر تھے اور انگریزوں سے بغاوت کرکے آئے ہندوستانی سپاہیوں نے انھیں اپنی قیادت کی پیش کش کی تھی۔ جسٹس سچر نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے دفن کے لیے دہلی کے مہرولی میں جگہ منتخب کی تھی جو آج تک خالی ہے۔ اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے قومی ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر کے باقیات رنگون سے دہلی لائے۔ اس میں حکومت کو کسی طرح کا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ سوشلسٹ پارٹی آف انڈیا کے قومی جنرل سکریٹری ڈاکٹر پریم سنگھ نے کہا کہ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے 11 مئی 1857 کو جو جنگ چھیڑی گئی تھی اس کی قیادت بہادر شاہ ظفر نے کی تھی۔ وہ دن ہندوستان کی ہندو۔مسلم یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کا ایک تاریخی دن تھا، حالانکہ کچھ ہندوستانیوں کی غداری کے سبب وہ جنگ ہار گئے، لیکن اس جنگ میں متعدد افراد نے اپنی جانوں کی قربانی دی۔ انگریز بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون لے گئے جہاں 7 نومبر 1862 کو 87 سال کی عمر میں بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوگیا اور انھیں وطن واپس لانے کی بجائے وہیں دفن کر دیا گیا، جب کہ ان کی آخری خواہش دہلی میں دفن ہونے کی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مئی 2013

یواین آئی اردو کی 21ویں سالگرہ

نئی دھلی: یواین آئی اردو سروس کی 21ویں سالگرہ کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے معروف صحافی اور کانگریسی سیاست داں جناب م افضل نے کہا کہ اردو خبررساں ایجنسی کے قیام سے سماج میں ایک خاموش انقلاب برپا ہوا ہے جس کی وجہ سے اردو اخبارات کی تصویر بدل گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 1995 سے پہلے تک اردو اخباروں کے سامنے اطلاعات کے ذرائع کا مسئلہ درپیش تھا جو یواین آئی اردو سروس نے بخوبی انجام دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس سے اردو اخباروں میں بہتری اور ان کی خبروں میں تسلسل پیدا ہوا ہے۔ یواین آئی کی اردو ایجنسی کا قیام 5 جون 1992 میں عمل میں آیا تھا اور آج ملک بھر میں اردو اخباروں کے لیے یہ ایجنسی ریڑھ کی ہڈی بن چکی ہے۔ موجودہ یواین آئی اردو دنیا کی پہلی اردو ایجنسی ہے جس نے ٹیلی پرنٹر پر سروس فراہم کی اور اب اس کے دائرے میں ملک کے تمام بڑے اخبار آچکے ہیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اردو کی ترقی کے لیے اس خبررساں ایجنسی کی جدید کاری میں ہرممکن تعاون دیں گے۔ کانگریس ترجمان نے کہا کہ اردو بولنے والوں کی آواز کو بلند کرنے اور انھیں اطلاعات کے ہتھیار سے لیس کرنے میں یواین آئی اردو کا انتہائی اہم رول رہا ہے جس کا فائدہ سیاسی اور سماجی تنظیموں اور حکومت کو اٹھانا چاہیے انھوں نے کہا کہ اس سے اردو اخبار ہی نہیں بلکہ ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو فائدہ پہنچے گا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 3 جون 2013

دھلی:

مرکزی و ریاستی حکومت کے دفاتر میں اردو کا استعمال

نئی دھلی: حق اطلاعات قانون کے تحت مرکزی اطلاع کمیشن کے ذریعے دیے گئے فیصلے کے نفاذ میں مرکزی وزارت داخلہ کے محکمہ آفیشیل لینگویج کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر رَتی رام نے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی سماعت کے بعد اپنا نوٹیفکیشن مورخہ 20 جون 2012 مہیا کرایا ہے، جس کے تحت اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مرکزی حکومت کے علاقائی دفاتر کے ذریعے عوام کے استعمال میں لائے جانے والے فارموں اور عوام کی اطلاع کے لیے لگائے جانے والے بورڈ و نیم پلیٹ وغیرہ میں ریاستی زبانوں کا استعمال کیا جائے یعنی جن ریاستوں میں دوسری سرکاری/ علاقائی زبانیں ہیں تو دونوں کا استعمال کیا جائے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے سینئر قومی نائب صدر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے مرکزی وزارت داخلہ کے محکمہ آفیشیل لینگویج کے مذکورہ نوٹیفکیشن کی روشنی میں دیے گئے اُس کے فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس حکم نامے میں مورخہ 7 اپریل 2011 کے آفس میمورنڈم کا حوالہ دیتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ ہندی داں یعنی جن ریاستوں کی سرکاری زبان ہندی ہے، وہاں موجود مرکزی حکومت کے دفاتر، پبلک سیکٹر، بینک ودیگر نیم سرکاری دفاتر اپنے بورڈ، سائن بورڈ، نیم پلیٹ، واطلاعات ہندی وانگریزی کے علاوہ متعلقہ ریاستوں کی سرکاری زبانوں میں لکھیں گے و شائع کریں گے۔ مگر افسوس کہ اس حکم نامہ کے نفاذ میں دہلی جیسے ماڈل شہر میں بھی عمل نہیں ہورہا ہے۔ یہاں تک کہ منی آرڈر فارم، ریلوے ریزرویشن فارم، بینک فارم، انکم ٹیکس ریٹرن فارم اور ٹیلی فون کنکشن وغیرہ کے فارم ہندی، انگریزی کے علاوہ دوسری سرکاری زبان اُردو اور پنجابی میں شائع نہیں کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اُترپردیش اور بہاروغیرہ ریاستوں میں بھی مذکورہ فارم تین زبانوں میں شائع ہونا چاہیے کیونکہ اردو وہاں کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے مزید کہا کہ دہلی کی سڑکوں کے سائن بورڈ چار زبانوں میں لکھے ضرور نظر آتے ہیں مگر کسی بھی مرکزی یا ریاستی محکمے کا فارم اردو اور پنجابی زبان میں شائع نہیں کیا جارہا ہے اور نہ تو دہلی میں دوسری سرکاری زبان اردو اور پنجابی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

پریس ریلیز محمد عمران قنوجی، پریس سکریٹری، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، نئی دہلی، 31 مئی 2013

مدارس کو آئی ٹی سے جوڑنے کی گزارش

نئی دھلی: وزارت برائے اقلیتی امور کے زیرانتظام ادارہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ایم اے ای ایف) نے دینی مدارس کے ذمے داران کے نام ایک گزارش نامہ جاری کیا ہے، جس میں ادارے نے دینی مدارس کے ذمے داروں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اداروں میں انفارمیشن ٹکنالوجی مراکز (آئی ٹی سی) قائم کریں۔ اس سے انھیں ادارہ جاتی ترقی اور تعلیمی معیار کو مزید بلند

محفوظ الرحمٰن میموریل لیکچر

نئی دہلی: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام حضرت نظام الدین بستی میں واقع غالب اکادمی میں محفوظ الرحمٰن میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا موضوع 'قاضی محمد عدیل عباسی: شخصیت اور تحریک' رکھا گیا تھا۔ اس چھٹے محفوظ الرحمٰن میموریل لیکچر کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر اور ڈی یو کے پروفیسر ایمریٹس و ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر دینی تعلیمی کونسل کے روح رواں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی (لکھنؤ) اور سابق ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے شرکت کی۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ظفرالاسلام اور شمیم طارق تھے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر معصوم مرادآبادی نے

کی۔ اس موقعے پر تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد نے کہا کہ معروف صحافی اور ادبی و سماجی شخصیت محفوظ الرحمٰن نے ایمان اور زبان کی حفاظت کے لیے بے پناہ اور قابل تحسین خدمات انجام دی ہیں۔ افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے کہا کہ قاضی محمد عدیل عباسی نے آزاد ہند میں مسلمانوں کے حقوق وعظمت کی بقا کے لیے اہم اقدامات کیے اور اردو زبان کے تحفظ، بقا اور فروغ کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ 'قاضی محمد عدیل عباسی: شخصیت اور تحریک' کے موضوع پر ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جسے معروف صحافی سہیل انجم نے پڑھ کر سنایا۔ مقالے میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے قاضی محمد عدیل عباسی کی حیات وشخصیت اور تحریک کی تفصیلات بیان کیں اور تحریک آزادی وآزادی کے بعد ان کی ملک وقوم وملت کے لیے خدمات اور قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سیاسی و صحافتی خدمات اور کارناموں کا تذکرہ کیا۔ اس موقعے پر قاضی محمد عدیل عباسی کی ذاتی ڈائری پر مبنی ان کے پوتے ریحان اللہ عباسی کی تصنیف کردہ کتاب 'آئینہ شب وروز' کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 مئی 2013

کرنے میں مدد ملے گی۔ ایم اے ای ایف کا یہ گزارش نامہ اس وقت آیا، جب دہلی اقلیتی کمیشن (ڈی ایم سی) کے ذریعے قومی راجدھانی میں کیے گئے ایک سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ 70 فیصد سے زائد مدارس ماڈرن ایجوکیشن سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں۔ ایم اے ای ایف نے ڈی ایم سی کی پینل رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ تقریباً 70 فیصد مدارس جدید تعلیم کے حق میں ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ 'ماڈرن ایجوکیشن' کو دینی نظام تعلیم کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ ڈی ایم سی پینل کی سروے رپورٹ کا کہنا ہے کہ ماڈرن ایجوکیشن کی وابستگی سے متعلق ہوئے ایک سروے میں 446 مدارس کے ذمے داران سے رائے طلب کی گئی تھی، جن میں 417 مقامات سے جوابات موصول ہوئے، ان میں 314 مدارس نے ماڈرن ایجوکیشن سے وابستگی کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ ایم اے ای ایف کے مطابق مدارس میں انفارمیشن ٹکنالوجی سینٹرز کے قیام کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی جارہی ہے کہ وہاں کے طلبہ ہی نہیں، بلکہ اساتذہ بھی 'طے کردہ دھارے' میں آسکیں اور اپنی خدمات اور بھی بہتر طریقے سے انجام دے سکیں۔ ایم اے ای ایف کے سکریٹری ایم وزیر انصاری (سینئر آئی پی ایس) نے انقلاب کو بتایا کہ ایم اے ای ایف کی جانب سے دینی مدارس کے لیے ایک گزارش نامہ جاری کیا گیا ہے، جس میں ہم نے دینی مدارس کے سامنے کئی تجاویز رکھی ہیں۔ یہ تجاویز اچھی ہیں، اس لیے فاؤنڈیشن کی خواہش ہے کہ دینی مدارس انھیں اپنائیں، اس تعلق سے جو ضروری معلومات ہوں گی، وہ ایم اے ای ایف فراہم کرانے کے لیے تیار ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 مئی 2013

غالب کی حویلی کو فروغ دینے کی کوششیں

نئی دہلی: مرزا غالب کی حویلی 1997 میں دہلی

ہائی کورٹ کے ذریعے محفوظ کردی گئی، مگر اب تک اس کا حق نہیں ملا۔ حویلی کے برابر میں رہنے والے شفیق الدین نے کہا کہ ان کے دادا حاجی ابراہیم نے 1967 میں اسے کسٹوڈین سے خرید لیا تھا اور انھیں بھی اس بات کا علم تھا کہ یہ جگہ محض ایک کوئلے کی ٹال یا بلڈنگ میٹریل اسٹورس نہیں ہے بلکہ دنیا کے پسندیدہ شاعر اسداللہ خاں غالب کی آخری آرام گاہ رہ چکی ہے۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن فیروز بخت احمد نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس جگہ کی قربانی دیں اور غالب کی یادگار بنوانے میں مددگار ثابت ہوں۔ حاجی ابراہیم کی سمجھ میں یہ بات آگئی، مگر کافی مسائل ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک مقدمہ برائے فلاح عامہ دائر کیا جائے، جس سے یہ حویلی قانونی زنجیروں سے آزاد ہو۔ مقدمہ برائے فلاح عامہ کے ذریعے حویلی پبلک کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔ عدالت سے یہاں پر ایک مطالعہ گاہ، اردو سکھانے سے متعلق کمپیوٹر کلاسیں اور غالب کی تصاویر و کتابیں بھی سرکاری ادارے سے فراہم کرنے کی گزارش کی گئی تھی جس پر اب تک عمل نہیں ہوسکا۔ بقول پروفیسر اخترالواسع ''حویلی کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے ضرورت ہے کہ یہاں پر ایک ریڈنگ روم قائم ہو جس میں اردو ہندی اور انگریزی کے اخبارات ہوں، اردو سکھانے کے لیے کمپیوٹر کلاسیز ہوں اور غالب کی کتابیں و ترجمہ شدہ ہندی دیوان میسر ہوں۔ اس یادگار حویلی غالب میں گاہے بگاہے اردو زبان سے متعلق پروگرام بھی ہوتے رہنے چاہئیں۔ اس طرح نہ صرف اردو زندہ رہے گی، بلکہ پرانی دہلی کی تہذیب سے بھی سب آشنا ہوں گے۔'' فیروز بخت احمد نے حویلی غالب میں ایک مطالعہ گاہ، غالب کی کتابوں و ہندی دیوان کے لیے ایک چھوٹا سا کاؤنٹر، سیاحوں کی آسانی کے لیے وہاں پر پنکھے واے سی کا بھی سریش گوئل انتظام کرائیں، حالانکہ ان تمام باتوں کی گزارش وزیر اعلیٰ دہلی سے بھی تحریری طور پر 2010 سے کی جارہی ہے، مگر اس کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ سریش گوئل نے ان باتوں کی تائید کی ہے اور کہا کہ ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں

آپ کو حویلیِ غالب میں یہ تمام سہولیات میسر ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جون 2013

غالب اکادمی میں ادبی محفل

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین اولیا میں واقع غالب اکادمی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف صحافی شمیم طارق نے کی اور نظامت غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ اس موقعے پر انجم عثمانی نے 'وہ ایک بوڑھا' عنوان سے ایک افسانہ سنایا۔ اس نشست میں محمد خلیل نے بچوں کے ادب پر مشتمل مختلف رسائل و جرائد کا کافی مختصر تجزیہ پیش کیا۔ افسانے کے علاوہ دیگر لوگوں نے اپنے شعر و سخن سے نشست کے حسن میں اضافہ کیا۔ مشہور مزاحیہ شاعر اسرار جامعی نے اپنی معروف نظم 'پارلیمنٹ کا نظارہ' پیش کر کے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اس موقعے پر شمیم طارق نے صدارتی خطبے میں اردو زبان کی زبوں حالی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب جب سماج میں ناہمواری کی کیفیت ظہور پذیر ہوتی ہے تو ایسے دور میں ادیبوں اور شاعروں کی ذمے داری معاشرے میں بیداری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج مشاعروں کے معیار پامال ہو رہے ہیں ایسے ایسے شعرا مشاعروں میں آتے ہیں جنھیں اردو زبان کا رسم الخط پڑھنا نہیں آتا ہے، جس زبان کی اسکرپٹ سے آشنائی نہ ہو ان سے سوا اس زبان کے نقصان کے فائدے کی امید کرنا لغو ہوگا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے آخر میں تمام شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 مئی 2013

نوجوانوں سے اردو کو اپنانے کی اپیل

نئی دھلی: دہلی کے اے ڈی ایم اور دہلی وقف بورڈ کے چیف ایگزیکٹو آفیسر شمیم اختر نے کہا ہے کہ شخصیت سازی، سول سروسز کے امتحانات میں کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ وہ اسلامک کلچرل سینٹر میں نوبل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام جاری چالیس روزہ پرسنالٹی ڈیولپمنٹ ورکشاپ کے مشاہدے کے بعد نوجوانوں سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان بچوں کی ذہنی صلاحیت بعض فطری اسباب سے دوسروں کے مقابلے بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ سول سرویسز میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مناسب اور بروقت رہنمائی نہ ملنے کے سبب مسلم نوجوان سول سروسز

میں اپنا حصہ حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سراج الدین قریشی کی سرپرستی میں جو مفت تربیتی پروگرام آئی آئی سی سی میں چلایا جا رہا ہے وہ مسلم نوجوانوں کے لیے کسی عظیم نعمت سے کم نہیں۔ ایسی رہنمائی اور ایسی تربیت جن نوجوانوں کو مل جائے وہ اس ملک کے لیے بیش بہا ورثہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ اردو سے رشتہ نہ توڑیں لیکن انگریزی پر زیادہ سے زیادہ عبور حاصل کریں۔ منور زماں جس انداز سے نوجوانوں کی مکمل شخصیت سازی کر رہے ہیں، وہ شمالی ہندوستان میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا۔ شمیم اختر نے مسلم لڑکیوں سے خاص طور پر اپیل کی کہ وہ سول سروسز کو شجر ممنوعہ نہ سمجھیں بلکہ اس میدان میں محنت کر کے آگے آئیں۔ یہ والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ بچوں کو دسویں کلاس سے ہی سول سروسز کے لیے تیاری کرانا شروع کر دیں۔ نوجوانوں کے سوالوں کے جواب میں سول سروسز کی تیاری کے بہت سے کارگر نسخے بھی بتائے۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اگر اسلامک سینٹر سول سروسز کی تیاری کے میدان میں ان کی خدمات لینا چاہے تو وہ مفت خدمات دینے کو تیار ہیں۔ اس سے قبل این ای ایف کی طرف سے خالد مصطفیٰ نے شمیم اختر کا پھول پیش کر کے استقبال کیا۔ بعد میں انھوں نے اس ہفتہ شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے بچوں کو سرٹیفکیٹ بھی دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جون 2013

آندھرا پردیش

اردو اکادمی کو فعال بنانے کی کوشش

حیدرآباد: اردو اکادمی آندھرا پردیش اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج اور فروغ کے لیے حکومت آندھرا پردیش کی جاری اسکیموں کی تکمیل اور ان میں شفافیت کے جاری رکھنے کی کوشش میں ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/ سکریٹری اردو اکادمی آندھرا پردیش نے اپنے صحافتی بیان میں بتایا کہ اس ضمن میں سال 2013-2010 تک کی تقریباً تمام اسکیموں جن میں چھوٹے اخبارات کو مالی تعاون، اردو ادیبوں، شعرا، اسکالرس و مصنّفین کے مسودات کی چھپوائی کے لیے جزوی مالی تعاون، بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ، بیسٹ اردو اسٹوڈنٹس ایوارڈ، مطبوعات پر انعامات کی اسکیموں کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مجموعی خدمات کے سلسلے میں سال 13-2012 کی اسکیم کارنامہ حیات ایوارڈ کے انعام یافتگان کا بہت جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ ایک اور اسکیم کے تحت 'مخدوم ایوارڈ' جو قومی ایوارڈ ہے اس کا اعلان بھی جلد متوقع ہے۔ اردو اکادمی فروغ اردو کی اسکیموں کے اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے سال گزشتہ کی طرح رواں سال 14-2013 کے لیے ریاست کے چھوٹے اردو اخبارات کو مالی تعاون کے لیے درخواستیں طلب کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سابق میں اردو کے چھوٹے اخبارات کو فی کس 2 ہزار روپے کا مالی تعاون دیا جا رہا ہے۔ اس سال اردو انجمنوں، اداروں اور صحافیوں کی نمائندگیوں کے بعد اس رقم کو بڑھا کر 4 ہزار روپے کر دیا گیا ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 6 جون 2013

اترپردیش:

مئو میں سردار جعفری پر سیمینار

مئو: علی سردار جعفری کی شاعری خالص سیاسی و انقلابی ہونے کے باوجود آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔ اس خیال کا اظہار ایس ایم اے کاظمی نے حلقۂ ادب و ثقافت کی طرف سے ایک سیمینار مئو نگر پالیکا پریشد کے ہال میں 8 جون کو بعنوان 'علی سردار جعفری: فکری و فنی جہات' کے صدارتی خطبے میں کیا، انھوں نے سردار جعفری کی شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ آزادی سے پہلے تک کا شاعری کا رنگ خالص سیاسی و انقلابی ہے لیکن اس کے بعد ان کی شاعری کروٹ لیتی ہے اور انقلابی آہنگ کم ہو جاتا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے علی سردار جعفری کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ جعفری کی شاعری میں انقلاب اور رزم ہے جس کی وجہ سے بعض نقاد نے ان کی شاعری کو اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ ہمارا مزاج رزم کا نہیں بزم کا، انقلاب کا نہیں دھیمے لہجے کا عادی تھا اور زلف و رخسار کا عادی تھا جس کی وجہ سے جعفری کی مخالفت بھی ہوئی۔ پروفیسر شاہینہ رضوی نے جعفری کی شعری و نثری خدمات کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر شکیل صمدانی نے زبان اور ادب کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اس پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں

ادب میں وہی چیز پیش کرنا چاہیے جو عام فہم اور عوام کے لیے مفید ہو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے جعفری کی نظم 'صبح فردا' کا تجزیہ معروضی انداز میں پیش کیا۔ سیمینار میں حلقۂ ادب وثقافت کا تعارف اس کے سکریٹری شمیم احمد نے پیش کیا۔

روزنامہ 'خبر جدید'، دہلی،10 جون2013

اردو کی ترقی کے لیے مسلمان بھی متحد ہوں

شاہجہاں پور: انجمن فلاح عام کے تحت محلہ قلعہ واقع نارمل اسکول کے 'احاطے میں اردو کا زوال، کون ذمے دار؟' موضوع پر سیمینار کا انعقاد شہر قاضی سید مسعود حسن کی صدارت میں کیا گیا۔ مقررین نے موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اردو زبان کے فروغ کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ ہم کہیں نہ کہیں خود بھی اردو کے زوال کے لیے ذمے دار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اس لیے اردو زبان کے ساتھ ہونے والی جانب داری کو ختم کیا جانا چاہیے۔ اسلامیہ انٹر کالج کے سبکدوش لیکچرار و ادیب سید مشہود جمال نے کہا کہ سیمینار کا عنوان نہ صرف بہت پرانا ہے بلکہ انتہائی دلچسپ اور عبرت ناک بھی ہے۔ ہم پچھلے 65 سالوں سے اردو کے زوال کی باتیں کر رہے ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے نہ جانے کتنی تحریکیں چلائی گئیں مگر ان کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ خالد علوی نے کہا کہ اس زمانے میں اردو زبان کے لیے اپنے دلوں میں درد وغم رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ اس زبان میں ہمارا تہذیبی سرمایہ بھی ہے۔ اس موقعے پر محمد اسلم خاں ایڈووکیٹ، محمد رضا خاں، ڈاکٹر غلام اشرف قادری، ڈاکٹر علی احمد، آفاق علی خاں، شاہینہ خاتون، راشد حسین راہی اور سید امین احمد نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی،15 مئی2013

عمر قریشی اکادمی کا جلسہ اور اردو قلم کار پریشد

گورکھپور: اردو وراثت کارواں کے روح رواں آصف احمد اعظمی نے کہا کہ ایسی تمام شخصیتیں جنھوں نے اردو کو لوگوں کے دلوں میں اتار دیا اور جن کی ذات سے اردو وابستہ رہی ہے ان پر قومی سیمینار ہونا چاہیے تاکہ ایسے لوگوں کی قربانیاں منظر عام پر لائی جاسکیں اور لوگوں کو اردو سے جوڑا جاسکے۔ مسٹر اعظمی عمر قریشی اکادمی کے ذریعے ابوبازار انچوا میں ہوئی ایک تقریب میں اظہار خیال کر رہے تھے، تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز احمد نے کہا کہ عمر قریشی جتنے اچھے ناظم مشاعرہ تھے اتنے ہی بہتر شاعر بھی تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ جس محفل میں گئے اردو کے نمائندہ بن کر گئے اور اس حیثیت سے وہ اردو کے سفیر کہے جاسکتے ہیں۔ ادارہ قلم کار پریشد کے تحت عمر قریشی کے یوم وفات کے موقعے پر ہونے والی نشست بعنوان ''عمر قریشی نامور ناظم مشاعرہ یا کہنہ مشق شاعر!'' میں ادارے کے صدر ندیم اللہ عباسی ندیم نے کہا کہ ہمیں اس سچائی کو دل سے تسلیم کرنا چاہیے کہ عمر قریشی ایک ایسے شاعر تھے جو اپنی شاعری کے توسط سے اپنی سماجی زندگی، اپنے وسائل اپنے حدود اور نشست کے امکانات کا اظہار کرنے کی سعی کی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں شعرا نے عمر قریشی کو خراج عقیدت پیش کیے۔ اس موقعے پر شمیم شہزاد، نسیم سلیم پوری، عمران بشیر، توفیق ساحر، آصف محمود، شاداب شبیری، قیاس ملک، داؤد گورکھپوری وغیرہ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی،20 مئی2013

حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی کا جلسہ

کانپور: حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی کے زیر اہتمام کانپور کی علمی و ادبی تنظیموں کا ایک مشترکہ ادبی جلسہ و شعری نشست حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی کے ریڈنگ روم میں منعقد کی گئی۔ جلسے کی صدارت مشہور محقق ڈاکٹر عبدالمجید قاسمی شعبہ آیوش وزارت صحت و خاندانی بہبود حکومت ہند نے انجام دی۔ جلسے کے آغاز میں معروف ناظم شکیل حیدر نے اردو زبان و ادب سے متعلق ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔ جلسے میں اردو زبان وادب کے مسائل پر سیر حاصل مذاکرات ہوئے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اردو زبان وادب سے محبت رکھنے والے ہر فرد کو اردو کے جریدے خرید کر پڑھنے چاہئیں تاکہ اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہو جسے سامعین جلسہ نے متفقہ طور پر پاس کیا۔

پریس ریلیز، حکیم حافظ ایس حبیب الرحمٰن، چیئرمین حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی، کانپور،13 مئی2013

جموں و کشمیر:

راجوری میں کانفرنس

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سرسید کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے کے لیے اور علم کی روشنی گھر گھر پہنچانے کے لیے اپنے فاصلاتی طرز تعلیم کے سنٹر پورے ہندوستان میں قائم کیے ہیں جن کی تعداد 22 ہے جس کا میڈیم آف انسٹرکشن اردو اور ہندی ہے اسی سلسلے میں جموں صوبہ کی پسماندہ اور اردو داں عوام کے لیے سرسید ایم آئی ای فاؤنڈیشن بھروٹ راجوری میں ایک سنٹر قائم کیا گیا ہے جس میں امسال 60 طلبہ نے گیارہویں، بارہویں، بی اے سال اول دوم، سوم بی لیب، پی جی ڈپلوما جرنلزم ماس کمیونی کیشن جیسے کورسوں میں داخلہ لیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ان تمام کورسوں کو ریاستی حکومت نے بھی تسلیم کیا ہے ایسا قدم اردو کی خدمت کے ساتھ اردو کو روزگار کے ساتھ جوڑنے کی بہترین کوشش ہے۔ سرسید فاؤنڈیشن بھروٹ میں ایک روزہ علمی ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں پونچھ، راجوری کے دانشور ادبا، شعرا، اساتذہ کی خاصی تعداد موجود تھی۔ ریاستی وزیر شبیر احمد خان مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھے اس کانفرنس میں مسلم یونیورسٹی کے اس سنٹر کا نام سرسید ڈگری کالج بھروٹ راجوری کے نام سے منسوب ہوا ہے اس کے علاوہ راجوری اضلاع کی علمی و ادبی تحریکوں سے وابستہ بہت سے لوگوں نے شرکت کر کے مسلم یونیورسٹی کے اس احسان کے لیے اظہار تشکر کیا۔ جلسے کی صدارت ریاست کے مشہور ادیب و شاعر جناب شہباز راجوری نے کی انھوں نے اپنے خطبے میں سرسید کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ علاوہ کمپیوٹرس ڈپلوما کورس جو این سی پی یو ایل کے تعاون سے چل رہا ہے گزشتہ سال کے کامیاب بچوں کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے جب کہ نظامت کے فرائض جناب قیوم نایک نے انجام دیے۔ انھوں نے تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا۔

پریس نوٹ، سکریٹری سرسید فاؤنڈیشن بھروٹ،20 فروری2013

بہار:

شوکت حیات کے فن اور شخصیت پر مباحثہ

پٹنہ: افسانہ نگار مشتاق احمد نوری کی رہائش گاہ پر افسانوی مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے حوالے سے شوکت حیات کے فن اور شخصیت پر ایک مباحثے کا انعقاد کیا گیا، جس میں عظیم آباد کی چند اہم ومعروف شخصیات نے حصّہ لیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ فکشن نگار ڈاکٹر عبدالصمد نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ آغاز پروفیسر منظر اعجاز نے کیا۔ انھوں کہا کہ شوکت حیات کے افسانوی سفر کی عمر قابلِ لحاظ ہے۔ اُنھوں نے عموماً ترقی پسند خیالات وتصوّرات سے موضوعات اخذ کیے ہیں۔ اُنھوں نے علامتیں، استعارے اور تمثیلیں نئی نئی وضع کی ہیں۔ جدید اُردو افسانے کو یہ اُن کی اہم دین ہے۔ مدیر، 'کسوٹی جدید'، جناب شمیم انور نے کہا کہ 'گنبد کے کبوتر' کے بیشتر افسانے اعلیٰ فنی نمونے ہیں۔

آل بہار اردو جرنلسٹ فورم کی نشست

پٹنہ : اردو ملک کی مشترکہ تہذیب کی زبان ہے، یہ انقلاب زندہ باد کی زبان ہے، جنگ آزادی کی زبان ہے اور بہار کی دوسری سرکاری زبان بھی ہے۔ اس زبان کے فروغ میں ہر مذہب اور فرقہ کا یکساں کردار رہا ہے، لیکن فی الوقت یہ مسلمانوں کی زبان ہے، کیونکہ مسلمانوں کا مذہبی سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج پٹنہ میں 'آل بہار اردو جرنلسٹ فورم' کے زیر اہتمام منعقدہ ایک خصوصی نشست میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ بہار اردو کا مرکز رہا ہے، بڑے بڑے شعرا، ادبا، افسانہ نگار، ناقد اور صحافی یہاں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اردو کے فروغ میں گراں قدر خدمات پیش کیے ہیں۔ اردو کی لطافت اور

شیرینیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والی لسانی تنظیمیں متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں اور محبان اردو اپنی زبان سے اسی طرح محبت کریں جس طرح اپنی ماں سے کرتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر رضوان احمد مرحوم کو پر جوش خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ معروف صحافی کے ساتھ ساتھ اردو کے نامور ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے، ان کی تحریریں ملک و بیرون ملک شائع ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ چند ناگزیر وجوہات کے باعث گذشتہ 31 مئی کو پٹنہ میں آل بہار اردو جرنلسٹ فورم کے زیر اہتمام ڈاکٹر رضوان احمد کی دوسری برسی کے موقع پر یادگاری جلسہ میں شریک نہ ہوسکا، جس کا مجھے بے حد ملال ہے، لیکن ان کی تخلیقات کی اشاعت میں قومی کونسل تعاون کرے گی۔ ڈاکٹر رضوان احمد کی منتشر تخلیقات کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جائے تاکہ قارئین استفادہ حاصل کرسکیں۔ اس موقع پر مشہور ملی وسماجی رہنما انجینئر محمد حسین نے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کو 'مینار اردو' ایوارڈ دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ اس موقع پر بہار اردو جرنلسٹ فورم کے صدر اور سینئر صحافی اشرف استھانوی، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے مقامی ایڈیٹر ڈاکٹر سید شہباز، نوجوان صحافی نور السلام ندوی، محمد نعمت اللہ، 'بھاشا سنگم' کے ایڈیٹر محمد نور عالم کے علاوہ کئی ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کا خیر مقدم کرتے ہوئے خصوصی نشست میں تشریف آوری کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، صدر آل بہار اردو جرنلسٹ فورم، پٹنہ 3 جون 2013

مشہور شاعر جناب ناشاد اورنگ آبادی نے ایک قطعہ سنایا۔ ڈاکٹر شاہد جمیل نے کہا کہ اُردو کے افسانوی ادب میں شوکت حیات سمندری جہاز کی طرح ہیں، جس کا مستول دور سے اور دیر تک نظر آتا ہے۔ مشتاق احمد نوری نے کہا کہ شوکت حیات نہ صرف اپنے زمانے بلکہ ہر دور و ہر زمانے کا بڑا افسانہ نگار ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کا استقبال کرتا ہوں۔ نامور ناقد پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ 1970 کے بعد کی نسل کے سب سے اہم اور معتبر افسانہ نگاروں میں شوکت حیات ہمارے سب سے پسندیدہ اہلِ قلم ہیں۔ وہ قومی سطح پر شناخت قائم کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ خورشید اکبر نے کہا کہ شوکت حیات اپنی نسل کے نمایاں ترین اور میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ میں اُنھیں Trend-setter تخلیق کار مانتا ہوں جن کے طرزِ افسانہ کی تقلید لاشعوری طور پر بعد کی نسل نے کی ہے۔ کلیم الرحمٰن نے شوکت حیات کے فن و شخصیت پر ایک طویل خاکہ پڑھا جسے تمام لوگوں نے پسند کیا۔ اُنھوں نے لکھا کہ شوکت حیات ایک سچا اور بے باک افسانہ نگار ہے۔ اس نے اپنے افسانے میں کئی تجربے بھی کیے۔ سکریٹری بہار اُردو اکادمی، جناب امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ شوکت حیات افسانہ نگاری میں بڑا نام ہے۔ افسانوی مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' ان کی عظمت کی نشانی ہے۔ پروفیسر جاوید حیات نے کہا کہ شوکت حیات انامیت کے امین رہے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے انتخاب کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عہدِ حاضر کی اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ شوکت حیات کے بغیر مرتب نہیں ہوسکتی۔ ان کے فن کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے فن پاروں کے تہہ نشیں کمٹمنٹ کے باوجود ان کی بیشتر کہانیوں میں معنوی جہتیں ملتی ہیں۔ مشتاق احمد نوری کے شکریے کے ساتھ اِس یادگار تقریب کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر شاہد جمیل، پٹنہ 27 مئی 2013

مہاراشٹر :

جلگاؤں میں محفل ادب

جلگاوں: سہ ماہی تحریک ادب (بنارس) کے مدیر جناب جاوید انور کی جلگاؤں آمد پر عثمان جوہری فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا۔ (شاہکار) رہائش ڈاکٹر اقبال شاہ کے لان میں منعقدہ تقریب کی صدارت جناب عبدالکریم سالار نے کی۔ ڈاکٹر اقبال شاہ، مجید زکریا اور جناب عثمان جوہری نیز ایڈوکیٹ احتشام دیشمکھ نے بطور مہمانانِ خصوصی شرکت کی۔ تمام شریک فنکاروں کی پزیرائی کی گئی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز حمد پاک سے ہوا۔ جناب رشید قاسمی نے اپنے افتتاحی کلمات میں عثمان جوہری فاؤنڈیشن کی کارکردگی اور تقریب کی غرض وغایت بیان کی۔ مشتاق ساحل کے کلام سے ادبی تقریب کا آغاز ہوا اور اخلاق نظامی، وقار صدیقی، شکیل انجم، عثمان جوہری اور قیوم اثر نے نظم اور غزلیں پیش کیں۔ نثری حصے میں جناب ظہیر الدین شیخ نے انشائیہ پیش کیا۔ مشتاق کریمی، سعید پٹیل، معین الدین عثمانی، قیوم اثر، رشید قاسمی اور احمد کلیم فیض پوری نے افسانے سنائے۔ مہمان مدیر نے منتخب کلام پیش کیے اور پیش کی گئی تخلیقات پر اظہارِ خیال کیا۔ سامعین نے خوب داد دی۔ پرنسپل ڈاکٹر اقبال شاہ نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ صدرِ مجلس عبدالکریم سالار نے تمام تخلیقات کا جائزہ پیش کیا اور اپنے علاقے کی عمومی ادبی صورتحال پر اظہارِ اطمینان کیا۔ رسمِ شکریہ جناب قاضی ضمیر اشرف نے ادا کی۔ فاؤنڈیشن کے رکن رشید پنجاری نے انتظامات

اورعشائیے کی ذمے داری بخوبی نبھائی۔

پریس ریلیز، مشتاق کریمی، مہاراشٹر، 11 جون 2013

ہریانہ:

تنظیم 'احساسات' کی شامِ ادب

فرید آباد: انڈو پاک تنظیم احساسات فرید آباد کی جانب سے خوب صورت شام ادب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی آر سپرا نے فرمائی۔ مہمان خصوصی ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر نعیمہ جعفری دہلی اور ڈاکٹر پنو پرواز چنڈی گڑھ تھیں۔ شام ادب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جیوتی سنگ نے کہا کہ ہریانہ ایک عرصہ سے اردو زبان وادب کا مرکز رہا ہے لیکن کچھ عرصے سے یہاں ادب جمود کا شکار ہو گیا۔ امید ہے کہ آج کی اس شاندار تقریب سے یہ کارواں پھر رواں دواں ہو جائے گا۔ پروگرام کے بانی وکنوینر فیروز خاں ندوی جھانسی نے پنجاب و ہریانہ میں اردو زبان و ادب کی محترم شخصیات اور ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دہلی ولکھنؤ اسکول کے علاوہ اس سرزمین نے اردو کو منفرد مقام اور الگ لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ اس موضوع پر ابھی تحقیقی وتنقیدی کام نہیں ہو سکا۔ یہ افسوس کا مقام ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر سید اختیار جعفری ڈائرکٹر مرزا غالب ریسرچ اکادمی اور ڈی اے وی کالج فرید آباد کے پرنسپل جناب آہوجہ نے ہندی و اردو کو ایک ہی زبان اور سگی بہنیں قرار دیا۔ ڈاکٹر ڈی آر سپرا نے حکومت ہریانہ کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے کیے جا رہے اقدامات پر روشنی ڈالی۔ اردو زبان و ادب اور فنون لطیفہ میں نمایاں خدمات کے لیے ڈاکٹر نعیمہ پاشا جعفری، ڈاکٹر پنوں پرواز، ڈاکٹر سید اختیار جعفری، خمار دہلوی، عثمان جھانسی، فیروز خاں ندوی، شافعہ شاذ، شوانی ملک، گریش چندر شرما، ڈاکٹر ایم ایم کٹھوریا، جوناتھن جیکب، کمل کپور، آشا کول، منکت رام لامبا، پون سود، جیوتی سنگھ کو ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈی آر سپرا، ڈی اے وی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آہوجہ اور انڈو پاک تنظیم احساسات کے صدر ونو دملک نے ایوارڈ سے نوازا۔ انھیں ایک مومنٹو اور شال وسرٹی فکیٹ آف آنر دیا گیا۔ اس موقعے پر پیشے سے سرجن اور سینئر ڈاکٹر محترمہ پی کے پنوں پرواز چنڈی گڑھ کے اولین اردو شعری مجموعے 'پرواز تخیل' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ ان کا تعارف ڈاکٹر جیوتی نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، فیروز خاں ندوی، انڈو پاک تنظیم احساسات ادبی، A-1 اندرا گاندھی کالونی، سیکٹر 21، فرید آباد،

اعزاز و اکرام:

اسلوب احمد انصاری کو بہادر شاہ ظفر ایوارڈ

علی گڑھ: معروف نقاد وممتاز محقق پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں دلی اردو اکادمی نے انھیں کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اکادمک اسٹاف کالج میں منعقدہ پروقار

تقریب کو خطاب کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی علمی خدمات اور ادبی فتوحات پر انھیں اکادمی کے سب سے گراں قدر اعزاز سے نوازا جا رہا ہے۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کہا کہ اسلوب احمد انصاری نہ صرف غالب شناس ہیں بلکہ ماہر اقبالیات بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ اردو اکادمی دلی کے سکریٹری مسٹر انیس اعظمی نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری سراپا علم ہیں اور ان کی پوری شخصیت کا دائرہ محض اردو دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ مغرب بھی اس کا معترف ہے۔ علی گڑھ جن لوگوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے ان میں اسلوب احمد انصاری کا نام نمایاں ہے۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ شرافت ونجابت کے پیکر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی درجنوں وقیع اور فکر انگیز تصانیف اردو و انگریزی تنقید میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انصاری صاحب کی اردو اور انگریزی زبان میں اب تک 33 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل ہے۔ علامہ اقبال پر ان کے کام کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان نے انھیں پروقار صدر مملکت کا ایوارڈ دیا۔ گورکھپور یونیورسٹی نے بھی انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ وہ نقد ونظر کے مدیر بھی رہ چکے ہیں اور ادبی صحافت میں بھی ان کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ اس موقعے پر شہر اور یونیورسٹی کے ادبا وشعرا کے ساتھ بڑی تعداد میں سینئر اساتذہ نے شرکت کی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اقبال پر پہلا مضمون فرسٹ ایئر کے طالب علم کے طور پر لکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انگلستان، امریکہ، فرانس کے عالموں نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے انھیں ایک کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے شاگردوں نے ہمیشہ ان کی عزت افزائی کی اور ان کے کام کو سراہا۔ پروفیسر شہپر رسول اور ڈاکٹر ابن کنول نے اکادمی کی جانب سے مہمانِ خصوصی اور مہمان اعزازی کا استقبال کرتے ہوئے گلدستہ پیش کیا۔ اردو اکادمی کی گورننگ باڈی کے رکن اور صحافی معصوم مرادآبادی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مئی 2013

قاسم خورشید

پٹنہ: قلم کاروں کا سب سے بڑا اثاثہ یہ ہوتا ہے کہ عوامی سطح پر بھی اسے تحریک کا باعث سمجھا جائے ہر جگہ وہ اپنی منفرد آواز کے لیے پہچانا جائے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں یہ شناخت بہت آسان ہو گئی ہے اسی لیے اردو ہندی ادب میں بے لوث خدمات کے اعتراف کے پیش نظر بہار کے منفرد اور معتبر تخلیق کاروں کو گزشتہ روز ایک مقامی

اخبار کے زیر اہتمام پٹنہ کے بھارتیہ نرتیہ کلا مندر میں منعقد ایک شاندار پروگرام میں عزت مآب گورنر بہار جناب وائی این پاٹل کے دست مبارک اردو ہندی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ تخلیق کار ڈاکٹر قاسم خورشید سمیت پدم شری رویندر رام ہنس، کوی ستی نرائن، شانتی جین، آنند رام اور کلیم الرحمٰن کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس اہم ترین اعزاز کے بعد ڈاکٹر قاسم خورشید نے تمام اہل علم و دانش اور عوامی سروکاروں سے وابستہ افراد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس اہم ترین پروگرام میں عزت مآب ڈاکٹر پاٹل کے ذریعے ہماری عزت افزائی کا قلب کی گہرائیوں سے

اعتراف کرتا ہوں اوران کا ممنون ہوں۔

روز نامہ 'قومی تنظیم'، 20 مئی 2013

صحافی حمید ملک کو ایوارڈ

پربھنی: پربھنی کے معروف صحافی حمید ملک کو سماجی تنظیم ایکتا سیوا بھاوی سنستھا کی جانب سے ممبئی میں منعقدہ پروقار تقریب میں ریاستی وزیر سنجے دیوکتے کے ہاتھوں جیون گوروں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ممبئی سے پربھنی واپسی پر پربھنی اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے صحافی سراج ندوی نامہ نگار اخبار ہذا جنتور، عبدالحفیظ باغبان مانوت، محمد یونس انور، عبدالواحد باغبان نے صحافی حمید ملک کا والہانہ استقبال کیا اور انھیں مبارکباد پیش کی۔

روز نامہ 'اورنگ آباد ٹائمز' اورنگ آباد، 3 جون 2013

درد دل لکھوں کب تک

نئی دہلی: کمال امروہوی نے فلموں کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ اور مقبولیت میں جو اہم رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اردو شعر وادب میں ان کی گراں قدر خدمات قابل تحسین ہیں۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے 'درد دل لکھوں کب تک' کتاب کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری وائس پریسیڈنٹ ہاؤس کے کانفرنس ہال میں منعقدہ ادبی تقریب میں کمال امروہی کی صاحب زادی رخسار امروہوی

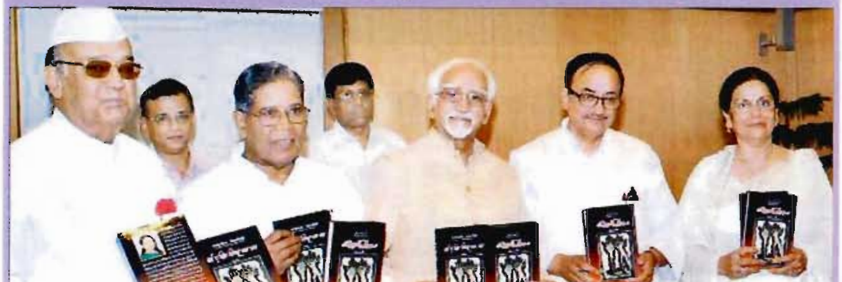

کی ترتیب کردہ مذکورہ کتاب کے رونمائی کررہے تھے۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے کہا کہ رخسار صاحبہ نے 'درد دل لکھوں کب تک' میں اپنی شاعری کو جس روایتی انداز میں پیش کیا ہے وہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا خوبصورت سنگم ہے۔ کتاب کی مرتبہ رخسار امروہوی نے مجموعے پر روشنی ڈالی اور کچھ اشعار بھی سنائے۔ اس سے قبل سابق وزیر اترپردیش ڈاکٹر معراج الدین احمد نے مہمان شرکا کا استقبال کیا۔ انھوں نے اس مجموعے کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت حسن ضیا نے کی۔ اس موقعے پر سابق گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی، عمران قدوائی، مرزا جاوید علی، اسلم جمشید پوری، گلزار دہلوی، ملک زادہ جاوید، علی ظہیر نقوی، سم رضا، محمد طارق صدیقی، صبا اسرار، ندیم عباس عابدی، ملک ذہین، سویتا اسیم، نوید حامد، گلزار نقوی، محمد علی حیدر نقوی، علیم الدین اسعدی، طارق فیضی، مسٹر وارث سمیت کثیر تعداد میں ادبی، علمی سیاسی وسماجی شخصیات نے شرکت کی۔ آخر میں صحافی حسن شجاع کے اظہار تشکر پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جون 2013

رسم اجرا:

تہذیب الاخلاق کا مشاہیر علی گڑھ نمبر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے 'مشاہیر علی گڑھ نمبر' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ایک مکمل انسان بنانے کے لیے طلبا میں تہذیب اور اخلاق بہت ضروری ہے۔ انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کو سرسید احمد خاں کے مشن کا ترجمان قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک اہم رسالہ ہے اور اس کے معیار کو بلند و برتر کرنا ہمارا فرض ہے اور اس کے لیے وہ سرمایہ کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔ وائس چانسلر نے اس موقعے پر ایک اہم اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے جو ملازم ریٹائر ہوتے ہیں انھیں اسی دن گریجویٹی اور دوسرے بقایا جات کی ادائیگی

کردی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ فوج کی ملازمت سے وہ جس دن سبکدوش ہوئے تھے اسی دن ان کو ساری رقم موصول ہوگئی تھی مگر اس ادارے میں ریٹائر ہونے والے ملازم کو جان بوجھ کر پریشان کیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ ایک سال کی مدت میں تہذیب الاخلاق نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ آنے والے شماروں میں سرسید کے شائع کردہ مضامین کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہیر علی گڑھ کی پوری دنیا میں پذیرائی ہورہی ہے۔ اس موقعے پر مشاہیر علی گڑھ کی تیسری جلد کا اجرا وائس چانسلر نے کیا جب کہ چوتھی جلد کا اجرا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بانی و پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراج پوری نے کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب 'بازیافت' کا اجرا بھی اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروفیسر شمیم جیراج پوری نے کہا کہ صرف دو فیصد مسلمان ہی سائنس کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ سائنس کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی ادارت میں ایک سال میں سات خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ غیر مسلم اساتذہ کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ ساتھ ہی استانیوں کے لیے بھی ایک خصوصی شمارہ مخصوص ہو۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 مئی 2013

دیوانِ نامی

نئی دہلی: اردو کے نامور شاعر جناب منظور حسن نامی کے دیوان غزلیات کی تقریب اجرا جناب عبدالمعید خان کی قیام گاہ نزد تکونا پارک میں منعقد کی گئی اس تقریب میں اردو کی قدآور ادیبہ پروفیسر صغریٰ مہدی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت فرمائی اور تقریب کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ انجینرنگ کے ریٹائرڈ پروفیسر معید احمد نے فرمائی۔ پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری اور گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن مالیر کوٹلہ کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے جناب منظور حسن نامی کی حیات وشاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نامی مالیر کوٹلہ میں 1897 میں پیدا ہوئے اور 1976 میں ابدی نیند سو گئے آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 1924 سے 1926 کے دوران ایم اے (فارسی) اور بی ٹی کے امتحانات پاس کیے آپ کو خواجہ غلام السیدین جیسے دانشور سے کسب علم کا موقع نصیب ہوا۔ لاہور میں اختر شیرانی

معارف قاسم جدید کا (مسلم مسائل نمبر)

نئی دہلی: مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ حکومت اور مسلمان دونوں اپنی ذمے داری سمجھیں اس کے ساتھ ہی مسلمان پہلے اپنے آئینی حقوق سمجھتے ہوئے اپنے مسائل کے حل کے لیے کوشش کریں ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں امام قاسم ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے زیراہتمام مسلم مسائل کے حل کے امکانات کے موضوع پر منعقد کانفرنس میں علما اور دانشوروں نے کیا۔ ماہنامہ معارف قاسم جدید کے خصوصی شمارے 'مسلم مسائل اور

ان کے حل کے امکانات' جو 6 سو سے زائد صفحات پر بنی ہے۔ مرکزی وزیر کے رحمٰن خان نے کہا کہ حکومت پر تنقید کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنی ذمے داری سمجھیں اور اپنا جائزہ لیں کہ ان سے کہیں غلطی نہیں ہورہی ہے۔ کے رحمٰن نے کہا کہ افسوس ناک بات ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے کہ جنھیں سچر کمیٹی کی سفارشات اور مسلمانوں کے لیے بنائے گئے منصوبوں کا علم نہیں ہے۔ کے رحمٰن خان نے کہا کہ مسلم قیادت کو اس بات کا محاسبہ کرنا ضروری ہے کہ آج ہندوستان کی ترقی میں مسلمان کہاں ہیں کیا ان کی ذمے داری نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ملک کی ترقی میں اپنا رول ادا کریں۔ اردو زبان کے متعلق کہا کہ مسلمان خود بھی اردو کے ساتھ انصاف نہیں کررہے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے پاس مدارس سے جو خطوط آتے ہیں وہ ہندی میں آتے ہیں۔ سچر کمیٹی کی 66 سفارشات نافذ ہونے کا دعوا کیا۔ انھوں نے سفارشات کا مطالعہ کرنے اور اس کی نشاندہی کرنے کو کہا اور کہا کہ وقف املاک کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں اور وعدہ کیا کہ پارلیمنٹ کے اگلے سیشن میں وقف املاک سے متعلق قانون لایا جائے گا اور اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ وقف املاک کو پبلک پراپرٹی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے تحت وقف املاک پر قابض قوتوں کے خلاف مقدمہ درج کیا جاسکتا ہے۔ کے رحمٰن خان نے اعتراف کیا کہ سسٹم منظم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے منصوبے مستحکم انداز میں نافذ نہیں ہوئے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کے رحمٰن سے کہا کہ آپ کی حکومت نے دہشت گردی کے الزام میں جیلوں میں بند مسلم نوجوانوں کی رہائی کے لیے فاسٹ ٹریک عدالت قائم کی ہے۔ لیکن اب تک کارروائی شروع نہیں ہوئی ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ اس سلسلے میں جلد سے جلد قدم اٹھائیں اور بے قصوروں کی رہائی کو یقینی بنایا جائے۔ کسی بے قصور نوجوان کی گرفتاری صرف ایک نوجوان کی گرفتاری نہیں ہے بلکہ پورے خاندان کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔

پریس ریلیز، ذہین اختر ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 7 جون 2013

اور احسان دانش کے بے تکلف دوستی ہوئی 1947 تک آپ دہلی میں مقیم رہے اور شاعر آستانہ کے طور پر بھی شہرت حاصل کی آپ نے خواجہ حسن نظامی کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی ذمے داری بھی سنبھالی اور دہلی میں بیخود دہلوی، بہزاد لکھنوی، اور کنور سنگھ بیدی سحر کو بھی متاثر کیا۔ آپ نے زمیندار، الہلال اور وحدت میں بھی صحافتی خدمات انجام دی۔ ڈاکٹر اقبال نے نامی صاحب کی 209 غزلوں کی تدوین کے لیے طویل عرصہ صرف کرنا پڑا۔ دہلی اردو اکادمی کی سابق رکن اور افسانہ نگار محترمہ نگار عظیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے دیوان نامی کی اشاعت کو اردو دنیا کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ بیسویں صدی کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے منظور حسن نامی کی شاعرانہ عظمت اور اقبال کی فروغ اردو کے تئیں کاوشوں کو سراہا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے تدوین کے پرخطر راستے کو کامیابی سے طے کرنے کے لیے ڈاکٹر اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور اقبال مہدی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ تقریب کی مہمان خصوصی پروفیسر صغریٰ مہدی نے تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کا ذکر کیے بغیر اردو تاریخ نامکمل ہے جناب نامی صاحب جیسے کہنہ مشق شاعر کی تدوین واشاعت جو اداروں کا کام ہے ڈاکٹر اقبال جیسے فرد واحد کی طرف سے انجام دیا جانا اہم کارنامہ ہے جس کے لیے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں پروفیسر معین احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں ملک کے مختلف علاقوں میں اردو کے قدآور شاعروں کے کلام کی تدوین واشاعت کی اہم ضرورت پر زور دیا اور دیوان نامی کی اشاعت کو اردو ادب کے لیے نیک فال قرار دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونی کیشن کے ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے دیوان نامی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ایڈیٹر 'بیسویں صدی' دہلی، 31 مئی 2013

بوڑھے برگد کا انت

مونگیر: جواں سال افسانہ نگار نیاز اختر کے اولین افسانوی مجموعے 'بوڑھے برگد کا انت' کی رسم اجرا مورخہ 18 مئی 2013 کو رہبر اردو لائبریری کے ریڈنگ ہال میں کہنہ مشق شاعر شاہ محمد صدیقی کی صدارت میں پروفیسر اقبال حسن آزاد (صدر شعبۂ اردو، جے، آر، ایس کالج، جمالپور) کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوئی۔ لائبریری کے سکریٹری الحاج شمیم اللہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ نیاز اختر نے اپنا مختصر افسانہ 'تپتی زندگی' سنایا۔ مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اقبال حسن آزاد نے کہا کہ نیاز اختر کبھی ان کے باضابطہ شاگرد نہیں رہے لیکن انھوں نے نیاز اختر کو مختصر افسانہ نویسی کے رموز

ونکات سے ضرور آگاہ کیا اور ان کے شوق افسانہ نگاری کو پروان چڑھایا۔ جس طرح ایک مالی کو اپنے لگائے ہوئے پودے کو لہلہاتے ہوئے اور سرسبز وشاداب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اسی طرح نیاز اختر کی کامیابی دیکھ کر انھیں خوشی محسوس ہورہی ہے۔ انھوں نے نیاز اختر کے افسانوں تپتی زندگی، گدھ، اور ٹرمینٹر کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شبیر حسن نے رنتھی، بوڑھے برگد کا انت اور آزادی کا جائزہ لیا۔ راشد طراز، مرزا مشکور بیگ، شاہ محمد صدیقی، مولانا عبداللہ بخاری، پروفیسر ایم، اے، او، جوہر اور طارق متین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مرزا مشکور بیگ نے ایک تہنیتی نظم پیش کی۔ صدر محفل شاہ محمد صدیقی کے خطبہ صدارت کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز، اقبال حسن، مونگیر، 27 مئی 2013

'اتحاد' پر کتابچہ

بیجاپور: شہر کے پہلے اور واحد اردو ڈرامہ نویس محمد قیوم قریشی نے اردو ڈراما 'اتحاد' تصنیف کیا ہے جس کا اجرا مقامی فیلکن یوتھ کلب کے زیر اہتمام منعقدہ ایک جلسے میں کیا گیا۔ مشہور طنز و مزاح نگار رؤف خوشتر نے کہا کہ اتحاد کے نام سے مسٹر قریشی نے جو ڈرامہ تحریر کیا ہے با قاعدہ اپنے عینی مشاہدات کی روشنی میں محض قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بھائی چارگی اور آپسی رواداری کو فروغ دینے کی خاطر جملہ 23 کرداروں پر قلم بند کرتے ہوئے نہ صرف قوم و ملک بلکہ بین الاقوامی برادری کے سامنے اتحاد کے پیغام کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جلسے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی لکچرار اردو نے مذکورہ ڈرامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ڈرامہ نویس نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد یعنی موجودہ تقاضوں کے پس منظر میں اس ڈرامے کے ذریعے اتحاد کو قائم کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جو موجودہ نسل کے لیے ایک بہترین دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جلسے کو اسحاق قادری قریشی اور حسین بادشاہ انعامدار نے بھی خطاب کیا۔ اس ڈرامے کو اس لیے منظر عام پر لایا گیا ہے کہ سماجی برائیوں اور لعنتوں کا ازالہ ہو سکے اور معصوم افراد ظلم و ستم کے شکنجے میں نہ پھنسیں۔ شہ نشین پر پروفیسر اشتیاق روزندار، پروفیسر پٹیل، پروفیسر ڈہلی، شفیق گنیان موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاست' بنگلور، 2 اپریل 2013

سراج دہلوی کے شعری مجموعے

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں شعری مجموعہ 'ہمارا بھارت مہان بھارت' اور 'وفا پیکر' کی رسم اجرا سے قبل پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے معروف شاعر اوم پرکاش اگروال سراج دہلوی نے کہا کہ آج اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تنگ نظری کا سلوک کیا جاتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے کہ رام پرساد بسمل، منشی پریم چند، فراق گورکھپوری، کرشن بہاری نور، شیش نارائن ملا، گوپی چند نارنگ اور گلزار دہلوی کی زبان کو آج مسلمانوں کی زبان کہا جارہا ہے اور وہ تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اردو زبان کی ہی شیرنی اور چاشنی ہے کہ مارواڑی سماج کا اوم پرکاش اگروال سراج دہلوی ہوگیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ غیر مسلم اردو پڑھیں اور اپنے بچوں کو پڑھائیں تاکہ یہ بات غلط ثابت ہو کہ اردو ان کی زبان نہیں ہے۔ پریس کانفرنس میں خمار دہلوی اور دکشت دنکوری وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ واضح ہو کہ سراج دہلوی نے شاعری کا آغاز 1965 میں کیا تھا تب سے اب تک ان کی 22 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جبکہ آٹھ دیگر کتابیں زیر طباعت ہیں۔ بعد ازاں جشن سراج دہلوی کے تحت ایک مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں معروف شاعر بیکل اتساہی، پروفیسر عتیق اللہ تابش، مناظر عاشق ہرگانوی، سلیو چودھری اور نجیشور گیان سمیت اہم شعرا نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 جون 2013

قرض اسکیم کے لیے اردو بروشر

نئی دہلی: دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اپنی رہائش گاہ پر ایک خصوصی تقریب میں اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کی کارکردگی پر مبنی بروشر کا اجرا کیا۔ واضح رہے کہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کے سابق ڈائرکٹر طارق صدیقی نے وزیر اعلیٰ کے ایما پر اردو زبان میں بروشر

شائع کرایا ہے۔ اس موقعے پر طارق صدیقی نے وزیر اعلیٰ کا بروشر کے اجرا کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعلیٰ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ طارق صدیقی نے نو منتخب ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ وہ ان کی مدت کار میں مسلمانوں کے فلاحی کاموں کو مزید بہتر طریقے سے انجام دیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 مئی 2013

دوسری دستک

حیدرآباد: نامور شاعر جناب حسن فرخ ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں گزشتہ نصف صدی سے شعر و ادب، صحافت اور الکٹرانک میڈیا کے لیے ان کی غیر معمولی خدمات رہی ہیں۔ ان کی شاعری، تفکر، بصیرت، اور انسانی درد و سوز سے عبارت ہے۔ ان خیالات کا اظہار کل شام دانشوروں نے اردو رائٹرس و جرنلسٹس ایسوسی ایشن، بزم احباب احمد جلیس اور دیگر تنظیموں کے زیر اہتمام ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں منعقدہ جناب حسن فرخ کے شعری مجموعے 'دوسری دستک' کی رسم اجرا تقریب میں کیا۔ اسلم فرشوری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سید شاہ نور الحق قادری ایڈوکیٹ سابق صدر اردو اکادمی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی اور تقریب کی صدارت کی۔ تقریب کی رسم اجرا کو جناب رحیم اللہ خان نیازی، حمید الظفر، شوکت علی خاں، یوسف روش اور خان اظہر نے خطاب کیا، نظامت اور شکریہ کے فرائض عابد صدیقی نے انجام دی۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 1 جون 2013

وفیات

عبدالرؤف

کولکاتہ: مشہور ادیب و شاعر، محقق اور مترجم پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف کا 15 مئی 2013 کو سہ پہر 4 بجے بعمر 87 سال اپنی رہائش گاہ کولکاتا میں انتقال ہوگیا۔ گوبرا قبرستان میں مرحوم کی تدفین ہوئی۔ ان کی پیدائش 1926 میں اعظم گڑھ (یو۔پی) میں ہوئی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے۔ 'تحقیق' 'تنقید' 'تاریخ' 'تصوف اور دوسرے علوم میں موصوف اپنی عبقریت کے لیے مشہور تھے۔ شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ وہ ایک درویش اور صوفی صفت انسان تھے انعام و اکرام' نام و نمود' شہرت' خود نمائی اور بڑے پن کی نمائش سے تاعمر مجتنب رہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف کا اہم تحقیقی کارنامہ اردو کی پہلی طبع زاد کہانی 'جذب عشق' اور 'میر باقر مخلص مرشد آبادی صاحب دیوان شاعر' ہے۔ 'اسرار تصوف' 'مغربی بنگال میں اردو کا لسانی ارتقا' اور 'تلاش معیار' (تنقیدی مضامین) ان کی دیگر تصانیف ہیں۔ پروفیسر عبدالرؤف پہلے مترجم تھے جنھوں نے غالب کے ہمعصر انگریزی کے مشہور شاعر والٹ وہیٹ مین کی نظموں کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کی کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

پریس ریلیز، مرسلہ ڈاکٹر معصوم شرقی، کولکاتہ، 21 مئی 2013

ریاض الرحمٰن ساغر

لاہور: معروف شاعر، نغمہ نگار اور صحافی ریاض الرحمٰن ساغر طویل علالت کے بعد لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 72 برس تھی۔ ریاض الرحمان ساغر کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے اور کچھ عرصے سے اسپتال میں زیر علاج تھے جہاں سنیچر کی رات ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ لاہور کے علامہ اقبال ٹاؤن میں ادا کی گئی۔ ریاض الرحمٰن نے اپنی زندگی میں 2000 سے زائد گانے لکھے جن کو عوامی

پذیرائی ملی۔ وہ تقسیم ہند سے قبل 1941 میں غیر منقسم پنجاب کے علاقہ بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد شعبہ صحافت سے منسلک ہوگئے۔ انھوں نے 1967 میں پاکستانی فلم 'عالیہ' کے گیت لکھے جس کے بعد فلمی گیت لکھنے کا سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا۔ لاہور سے نامہ نگاروں کے مطابق ریاض الرحمٰن ساغر طویل عرصہ تک اردو اخبار 'نوائے وقت' کے شوبز رپورٹر اور شوبز ایڈیٹر رہے اور ان کا کالم 'عرض کیا ہے' اسی اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ وہ فلم سنسر بورڈ کے رکن بھی رہے۔ ریاض الرحمٰن کے لکھے گیت تمام بڑے گلوکاروں نے گائے اور ان کے گانے 'بھیگی بھیگی راتوں میں'، 'تھوڑی سی لفٹ کرادے' اور 'کبھی تو نظر ملاؤ' خاصے مقبول ہوئے۔ انھوں نے فلمی گانوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی گیت لکھے۔ ریاض الرحمٰن ساغر کی اپنی سوانح حیات 'وہ کیا دن تھے' کے علاوہ سفرنامے اور گیتوں پر مبنی کتاب بھی شائع ہوئیں۔ انھیں ان کی فلمی شاعری کی وجہ سے کئی ایوارڈز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جون 2013

خراج عقیدت:

حکیم محمد طیب

نئی دھلی: سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم) کے ہیڈکوارٹرس واقع جنک پوری، نئی دہلی میں پروفیسر حکیم محمد طیب (سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو، علی گڑھ) کے انتقال پر تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر سید شاکر جمیل (ڈائرکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم) نے کی۔ اس موقع پر کونسل سے وابستہ دہلی کے کثیر تعداد میں آفیسرز موجود تھے۔ سید شاکر جمیل نے مرحوم کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حکیم محمد طیب گوناگوں خوبیوں کی مالک تھے۔ وہ ایک انتہائی قابل استاذ، بہترین طبیب، مایہ ناز مقرر اور بلند پایہ محقق تھے۔ اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے یونانی علاج و معالجے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ہزاروں مایوس مریضوں کے لیے ان کا مطب امید کی کرن ہوتا تھا۔ حکیم محمد طیب مرحوم کا سی سی آر یو ایم کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے چیئرمین، یونانی فارما کوپیا آف انڈیا اور گورننگ باڈی سی سی آر یو ایم کے ممبر بھی تھے۔ کونسل کے تحقیقی پروگراموں کی ہمیشہ سرپرستی اور رہنمائی بھی کی۔ میٹنگ کا اختتام دعائے مغفرت اور ایک تعزیتی قرارداد پر ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سیّد احمد خاں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 6 جون 2013

رضوان احمد

پٹنہ: بہار کے مایہ ناز صحافی ڈاکٹر رضوان احمد نے گذشتہ پانچ دہائیوں سے اپنے خون جگر سے صحافت اور اردو ادب کی آبیاری کی، کبھی بھی انھوں نے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ بڑے ہی با اخلاق، ذہین اور سادہ لوح انسان تھے۔ ان کی تحریر میں غضب کی تاثیر تھی۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت برائے زراعت اور فوڈ پروسیسنگ شاہ طارق انور نے 'آل بہار اردو جرنلسٹ فورم' پٹنہ، کے زیر اہتمام ان کی دوسری برسی کے موقع پر منعقدہ ایک یادگاری جلسہ سے خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے مرحوم کو پرجوش خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے صحافت کو مثبت رخ دیا اور اپنے قلم سے صحتمند صحافت کو فروغ دیا۔ وہ اردو کے سچے خادم اور صحافت کے بے لوث مجاہد تھے۔ انھوں نے ان کی دوسری برسی کے موقع پر اتنے شاندار انعقاد کے لیے آل بہار اردو جرنلسٹ فورم کے صدر اشرف استھانوی اور اس کے ارکان کو مبارکباد پیش کی۔ روزنامہ انقلاب (نارتھ) کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی نے کہا کہ ڈاکٹر رضوان احمد نے صحافت کا آغاز ایک مشن کے طور پر کیا تھا اور تاحیات وہ اس پر قائم رہے، ان کی صحافتی زندگی کی سب سے نمایاں خوبی یہی ہے کہ

وہ ایک کامیاب صحافی تھے اور با مقصد صحافت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ روزنامہ انقلاب ڈاکٹر رضوان احمد مرحوم کی طرح ایک مشن کے طور پر کام کرے گا اور ملت کے مسائل کو بے باکی کے ساتھ اٹھائے گا۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ چھ سالہ دور اقتدار میں انھوں نے بہار اردو اکیڈمی کو بہت فعال بنایا۔ معروف افسانہ نگار شوکت حیات نے کہا کہ رضوان احمد مرحوم میرے بچپن کے دوست تھے، انھوں نے افسانہ نگاری ایک ساتھ کی تھی اور پہلی بار ہم دونوں کا افسانہ 'شب خون' میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل آل بہار اردو جرنلسٹ فورم کے صدر و سینئر صحافی اشرف استھانوی نے ڈاکٹر رضوان احمد کی حیات و خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ حق گو اور بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین افسانہ نگار اور بہترین ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ انھوں نے چار دہائیوں سے صحافت کے ذریعہ ملت کے مسائل کو بے باکی کے ساتھ اٹھایا۔ نوجوان صحافی نورالسلام ندوی نے انھیں پرجوش خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ صحافت نہ تو ان کی مجبوری تھی، نہ ہی ان کا پیشہ۔ بلکہ صحافت ان کے نزدیک عبادت تھی۔ معروف صحافی ریاض عظیم آبادی نے کہا کہ رضوان احمد ایک ایسے صحافی تھے جنھوں نے صحافت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ معروف ملی و سماجی رہنما انجینئر محمد حسین نے اپنے صدارت کے خطاب میں کہا کہ رضوان احمد کی شخصیت ہمہ جہت تھی، ایسے لوگ برسوں میں پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے بہار کی اردو صحافت کو ایک نیا رخ دیا اور صحافت کے تقدس کا ہمیشہ ہی پاس لحاظ رکھا۔ اس سے قبل صدر جلسہ انجینئر محمد حسین نے سماجی اور سیاسی خدمات کے لیے مرکزی وزیر شاہ طارق انور کو ان کے خدمات کے اعتراف میں 'فخر بہار' ایوارڈ سے نوازا۔ جناب حسین نے موصوف کو علامتی نشان، سند اور شال پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی۔ زبان و ادب کے معاون مدیر انوار محمد عظیم آبادی کو ان کے نمایاں خدمات کے لیے 'صدائے اردو' ایوارڈ، حکومت بہار سے شائع ہونے والے سہ ماہی مجلّہ 'بھاشا سنگم' کے ایڈیٹر اور معروف افسانہ نگار محمد نور عالم کو 'نوائے اردو' ایوارڈ، بہار کے معروف شاعر سید حسن نواب حسن کو 'بہار اردو' ایوارڈ، سید نذیر الحق، نوجوان صحافی محمد نعمت اللہ اور انجینئر ایس ایم انعام احمد کو 'وقار اردو' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اردو کے ان خدمتگاروں کو مرکزی وزیر طارق انور نے مومنٹو، توصیفی سند اور شال پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، صدر آل بہار اردو جرنلسٹ فورم، پٹنہ 2 جون 2013